اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ
(القرآن)
آپ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت کی
باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بلائیے۔
تصحیح شدہ
تبلیغِ دین
مصنفہ
حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ
مترجمہ
حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی رحمہ اللہ
عنوانات وحواشی
مولانا جمیل احمد صاحب تھانوی مدظلہ
ادارۃ المعارف کراچی

باہتمام : محمد مشتاق سنی

طبع جدید : ربیع الاول ۱۴۲۴ھ مئی ۲۰۰۳ء

مطبع : احمد پرنٹنگ پریس ناظم آباد کراچی

ناشر : ادارۃ المعارف کراچی ۱۴ احاطہ دارالعلوم کراچی ۱۴

فون : 5049733 - 5032020

ای میل : i_maarif@cyber.net.pk

ملنے کے پتے:

- ادارۃ المعارف کراچی ۱۴ احاطہ دارالعلوم کراچی ۱۴
  فون: 5049733 - 5032020
- مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴ احاطہ دارالعلوم کراچی ۱۴
  فون: 5031565 - 5031566

عرض ناشر

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ نے اپنی تصانیف میں مسلمانوں کی دینی و دنیوی اصلاح کیلئے جو حکیمانہ انداز اختیار فرمایا ہے وہ کسقدر آسان فہم اور دلنشین ہے قاری کو اس کا اندازہ زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے بخوبی ہوجاتا ہے۔ زیر نظر کتاب "تبلیغ دین" میں درحقیقت انسان کی باطنی اصلاح کے اصول اور طریقوں کی تشریح پیش کی گئی ہے۔ کیونکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد جو دراصل خلاصۂ اسلام ہے ان کی ادائیگی کا اہتمام اس وقت صحیح معنی میں نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان کا باطن شریعت کے بتائے طریقوں کے مطابق صاف شفاف نہیں ہوجاتا۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ عبادات دینیہ ہوں یا انسانی معاشرت کے مختلف شعبے۔ جب تک انسان کا باطن صراطِ مستقیم کا پابند نہیں ہوجاتا نہ انسان عبادات کی ادائیگی کا حق ادا کرسکتا ہے نہ معاشرتی حقوق کو ملحوظ رکھ سکتا ہے۔

امام غزالیؒ نے زیر نظر کتاب میں حقوق اللہ اور حقوق العباد سے متعلق جو کوتاہیاں اور خرابیاں عام طور پر انسانوں میں پائی جاتی ہیں ان کی اصلاح کی پوری پوری کوشش فرمائی ہے۔ چنانچہ کتاب کی ترتیب تین اقسام میں یوں ہے کہ پہلی قسم میں "ظاہری اعمال کے دس اصول" دوسری میں "مذموم اخلاق کی تفصیل اور طہارتِ قلب کا بیان" اور تیسری میں "قلب کو اخلاق محمودہ کے ساتھ مزین و آراستہ کرنے کا بیان" اس طرح یہ کل تیس اصول ہوتے ہیں جن میں اصلاح باطنی کے سلسلہ میں اسلام کی تعلیمات کا جامع ترین خلاصہ مرتب ہوگیا ہے۔

"تبلیغ دین" امام غزالیؒ کی کتاب "اربعین" کے تین ابواب کا اردو ترجمہ

ہے جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے ایما پر مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ نے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ پھر مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی صاحب نے حواشی میں کتاب میں درج روایات کی تحقیق کی ہے اور عنوانات کا اضافہ کیا ہے۔

مگر اس وقت "تبلیغ دین" کے جو مطبوعہ نسخے بازار میں دستیاب ہیں ان میں سے ایک تو قدیم طرز طباعت کے مطابق شائع ہوا ہے جس سے عام قاری کا استفادہ کرنا قدرے مشکل ہوتا ہے کیونکہ عبارت کا تسلسل اس طرح ہے کہ یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کہاں سے کیا مضمون شروع ہو رہا ہے اور عنوان کی مطابقت عبارت کے کس مقام سے ہے۔ دوسرا نسخہ جو جدید انداز طباعت کے مطابق شائع ہوا ہے اغلاط سے پُر ہے حتیٰ کہ بعض مقامات پر سطروں کی سطریں عبارت غائب نظر آتی ہے۔ بیشتر مقامات پر عنوانات میں اس کی رعایت نہیں کہ مضمون کہاں سے شروع ہوتا ہے نیز عبارت میں الفاظ کی فاش غلطیاں موجود ہیں جس سے بسا اوقات مفہوم ہی غلط ہو جاتا ہے ـــــ لہٰذا ہم نے اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر ممکن حد تک صحت کے ساتھ شائع کرنے کا قصد کیا اور برادر مکرم حسین احمد نجیب رفیق سابق دارالتصنیف دارالعلوم کراچی کا اس معاملہ میں تعاون حاصل کیا انہوں نے دونوں مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھا اور پوری توجہ کے ساتھ "تبلیغ دین" کا یہ تصحیح شدہ ایڈیشن مرتب کیا جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس میں کتنی محنت اور کیا کام ہوا اس کا اندازہ تو قارئین حضرات ہی کر سکیں گے البتہ اصلاح احوال امت کی غرض سے ایک بہترین کتاب کو مفید ترین صورت میں پیش کرنے کی سعادت پر ہم رب ذوالجلال کی بارگاہ میں دست بدعا ہیں کہ ہمارے باطن کی بھی اصلاح فرما دے اور اس کتاب کی طباعت کو سعادت اخروی کا ذریعہ بنا دے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

طالب دعا محمد مشتاق تنی

۱۱ ربیع الثانی ۱۴۰۳ھ — خادم ادارۃ المعارف کراچی ۱۴

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ

"تبلیغ دین" کے متعلق

مجدد الملت حکیم الامت

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی (قدس سرہ)

کی رائے

حامداً و مصلیاً

کہتا ہے عاجز اشرف علی عفی عنہ اس جزو زمان میں اجزائے دین میں سے جزو اخلاقی و تہذیب نفس کو عوام نے اعتقاداً اور خواص نے عمداً کالمحذوف و المطروح کردیا اس سے جو مفاسد دینیہ و تمدنیہ پیدا ہو رہے ہیں علاج اس کا یہی ہے کہ اس کی تعلیم اور اس پر تنبیہ کی جائے چنانچہ سلف نے اسی واسطے اس میں مختلف و متعدد کتابیں لکھیں ان سب میں زیادہ سہل المآخذ و جامع تصانیف امام غزالیؒ کی ہیں پھر ان میں رسالہ "أربعین" اخصر و انیسر ہے۔ لیکن عربی میں ہونے

کی وجہ سے محتاج تھا ترجمۂ اُردو کا جو کہ ہمارے ملک کی عام زبان ہے ، اس لئے میری تمنا تھی کہ اس کا اردو ترجمہ ہو جائے ، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ہمارے مولانا محمد عاشق الٰہی سلمہ اللہ تعالیٰ کو کہ اس کام کو نہایت خوبی کے ساتھ انجام دیا میں نے بعض بعض مقامات اس کے دیکھے ترجمہ بہت ہی پسند آیا معنی خیز اور نشاط انگیز اور اگر زیادہ فرصت ہوتی تو خوبی کے ساتھ اس کے دیکھنے کا مشتاق تھا اللہ تعالیٰ اس کو نافع اور مقبول بنادے۔ آمین

"اشرف علی"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اعمال ظاہری کے دس اصول ہیں

پہلی اصل
نماز کا بیان

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میری یاد کے لئے نماز قائم کرو" اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "نماز دین کا ستون ہے"[1] خوب سمجھ لو کہ تم نماز میں اپنے پروردگار سے باتیں کرتے ہو لہذا دیکھ لیا کرو کہ نماز کیسی پڑھ رہے ہو اور چونکہ اللہ پاک نے اقامۃ صلوٰۃ یعنی نماز کے درست کرنے کا حکم فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز اور نماز سے متعلق تمام ضرورتوں کی پوری رعایت کرو لہذا نماز میں ان تینوں باتوں کا پورا لحاظ رکھنا چاہیئے۔

اوّل ۔ نماز سے پہلے وضو کی نگہداشت کرو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وضو میں جس قدر سنتیں اور مستحبات ہیں ان کو بجالاؤ اور ہر عضو کے

---

[1] بیہقی ضعیف ۔ ابونعیم مرسل ۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ اس کے سب راوی ثقہ ہیں اور بہت طریقوں سے ہے ۱۲

کے وقت وہ دعاؔ پڑھو جو حدیث میں آئی ہے اور اس کے ساتھ ہی کپڑوں

ؔ یعنی وضو پہلے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ ھَمَزَاتِ الشَّیَاطِیْنِ وَ اَعُوْذُبِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ ۝ (اے اللہ میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کے چوکوں سے اور آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں ۱۲) پڑھکر بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھے۔ اس کے بعد ہاتھ دھوتے وقت اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْیُمْنَ وَالْبَرَکَۃَ وَاَعُوْذُبِکَ مِنَ الشُّؤْمِ وَالْھَلَاکَۃِ (اے اللہ میں آپ سے سوال کرتا ہوں سعادت اور برکت کا اور پناہ مانگتا ہوں نحوست اور ہلاکت سے ۱۲) اور کلی کرتے وقت اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی تِلَاوَۃِ کِتَابِکَ وَکَثْرَۃِ الذِّکْرِ لَکَ وَالشُّکْرِ لَکَ ۝ (اے اللہ مجھے اپنی کتاب کی تلاوت اور ذکر و شکر کی کثرت پر امداد دیجئے ۱۲) ناک میں پانی ڈالتے وقت اَللّٰھُمَّ اَرِحْنِیْ رَائِحَۃَ الْجَنَّۃِ وَاَنْتَ عَنِّیْ رَاضٍ ۝ (اے اللہ مجھے جنت کی خوشبو سنگھائیے اور آپ مجھ سے خوش رہیں) ناک سنکتے وقت اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ رَوَائِحِ النَّارِ وَمِنْ سُوْءِ الدَّارِ (اے اللہ میں آپ کی پناہ طلب کرتا ہوں دوزخ کی بو اور اس کے برے گھر سے) منہ دھوتے وقت اَللّٰھُمَّ بَیِّضْ وَجْھِیْ یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہُ اَوْلِیَائِکَ وَلَا تُسَوِّدْ وَجْھِیْ یَوْمَ تَسْوَدُّ وُجُوْہُ اَعْدَائِکَ (اے اللہ جس دن آپ کے دوستوں کے چہرے نورانی ہوں میرے چہرے کو بھی نورانی کیجئے اور جس دن آپ کے دشمنوں کے چہرے سیاہ کئے جائیں میرا چہرہ سیاہ نہ کیجئے) داہنا ہاتھ کہنی تک دھوتے وقت اَللّٰھُمَّ اَعْطِنِیْ کِتَابِیْ بِیَمِیْنِیْ وَحَاسِبْنِیْ حِسَابًا یَّسِیْرًا ۝ (اے اللہ میرا اعمال نامہ میرے داہنے ہاتھ میں دیجئے اور میرا حساب سہل کیجئے) اور بایاں ہاتھ دھوتے وقت اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ اَنْ تُعْطِیَنِیْ کِتَابِیْ بِشِمَالِیْ اَوْ مِنْ وَّرَاءِ ظَھْرِیْ ۝

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کا اور وضو کے پانی کا خیال رکھو کہ دونوں پاک ہوں لیکن اس میں اتنا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

(اے اللہ میں اس سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں کہ آپ میرا اعمال نامہ بائیں ہاتھ میں یا پیٹھ پیچھے سے دیں) سر کا مسح کرتے وقت اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ٥ اَللّٰهُمَّ اَسْمِعْنِيْ مُنَادِيَ الْجَنَّةِ مَعَ الْاَبْرَارِ (اے اللہ مجھے ان لوگوں میں سے کر دیجئے جو بات سن کر اچھی کی پیروی کر لیتے ہیں۔ اے اللہ مجھے نیکوں کے ساتھ جنت کی منادی سنائیے) گردن کا مسح کرتے وقت اَللّٰهُمَّ فُكَّ رَقَبَتِيْ مِنَ النَّارِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ السَّلَاسِلِ وَالْاَغْلَالِ (اے اللہ! میری گردن کو دوزخ سے آزادی دلا دیجئے۔ اور میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں زنجیروں اور طوقوں سے) داہنا پاؤں دھوتے وقت اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْ قَدَمِيْ عَلٰى صِرَاطِكَ الْمُسْتَقِيْمِ ٥ (اے اللہ! میرے قدم کو اپنے سیدھے راستے پر ثابت رکھئے) بایاں پاؤں دھوتے وقت اللهم انى اعوذ بك ان تزل قدمى على الصراط يوم تزل اَقْدَامُ الْمُنَافِقِيْنَ فِي النَّارِ (اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ میرا قدم پل صراط پر پھسل جائے جس دن کہ منافقوں کے قدم آگ میں کو پھسل جائیں گے) اور وضو کے بعد کھڑے ہو کر یہ دعا پڑھے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ٥ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ عَمِلْتُ سُوْءً وَظَلَمْتُ نَفْسِيْ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ فَاغْفِرْ لِيْ وَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ٥ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ عِبَادِكَ

(باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

مبالغہ نہ کرو کہ وسواس تک نوبت پہنچ جائے کیونکہ یہ وسوسہ شیطانی ہے۔ اور شیطان اکثر عبادت کرنیوالے نیک بندوں کے اوقات شش و پنج میں ضائع کرتا ہے۔

وضو کرنے اور کپڑوں کی طہارت میں ایک عجیب حکمت

جاننا چاہیئے کہ نمازی کے کپڑوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی پھل کے اوپر کا چھلکا اور بدن کی مثال ایسی ہے جیسے اندر کا چھلکا اور قلب کی مثال ایسی ہے جیسے اندر کی گری اور مغز اور ظاہر ہے کہ مقصود مغز ہوا کرتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

الصَّالِحِينَ وَاجْعَلْنِي صَبُورًا شَكُورًا ۝ اَذْكُرُكَ ذِكْرًا كَثِيرًا وَّاُسَبِّحُكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ [illegible] کوئی معبود نہیں وہ تنہا ہیں کوئی ان کا شریک نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے بندے اور ان کے رسول ہیں۔ اے اللہ! میں آپ کی پاکی بیان کرتا ہوں، اور حمد کرتا ہوں، آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں نے بہت بُرے عمل کیے ہیں اپنی جان پر ظلم کیا ہے آپ سے بخشش چاہتا ہوں اور آپ کی طرف توبہ رجوع کرتا ہوں کہ آپ مجھے بخش دیجئے اور توبہ قبول فرمائیے بیشک آپ ہی توبہ قبول فرمانے والے اور رحم کرنے والے ہیں۔ اے اللہ! مجھے توبہ کرنے والوں میں سے بنا دیجئے اور پاکوں میں بنا دیجئے اور اپنے نیک بندوں میں سے بنا دیجئے اور مجھے نہایت صبر اور شکر کرنے والا بنا دیجئے کہ میں آپ کا خوب ذکر کروں اور صبح و شام آپ کی پاکی بیان کروں۔ ۱۲) اس کے بعد تین بار سورۂ انا انزلنا پڑھے۔ ۱۲ مترجم

اسی طرح اس ظاہری پاکی سے بھی قلب کا پاک ہونا اور نورانی بنانا مقصود ہے۔ شاید تم کو شبہ ہو کہ کپڑے کے دھونے سے قلب کس طرح پاک ہو سکتا ہے۔ لہٰذا سمجھ لو کہ حق تعالیٰ نے ظاہر اور باطن میں ایک ایسا خاص تعلق رکھا ہے جس کی وجہ سے ظاہری طہارت کا اثر باطنی طہارت تک ضرور پہنچتا ہے۔ چنانچہ جب چاہے دیکھ لو کہ جب تم وضو کر کے کھڑے ہوتے ہو تو اپنے قلب میں ایسی صفائی اور انشراح پاتے ہو جو وضو سے پہلے نہ تھی اور ظاہر ہے کہ یہ وضو ہی کا اثر ہے جو بدن سے آگے بڑھ کر دل تک پہنچا ہے۔

نماز پڑھنے سے بہر حال نفع ہے اگرچہ اس کے اسرار کو نہ سمجھے

دوم۔ نماز کے جملہ ارکان خواہ سنتیں ہوں یا مستحبات اور ذکر ہو یا تسبیح سب کو اپنے اپنے قاعدہ پر ادا کرو اور یاد رکھو کہ جس طرح بدن کی ظاہری طہارت نے قلب کی باطنی صفائی میں اثر دکھایا تھا اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ نماز کے ارکان کا اثر قلب میں ہوتا ہے اور نورانیت پیدا ہوتی ہے اور جس طرح مریض کو دوا پینے سے ضرور نفع ہوتا ہے اگرچہ وہ دوا کے اجزا کی تاثیر دں سے واقف نہ ہو اسی طرح تم کو نماز کے ارکان ادا کرنے سے ضرور نفع پہنچے گا اگرچہ تمہیں اس کے اسرار و رموز سے واقفیت نہ ہو۔

نماز کی روح اور بدن

جاننا چاہیے کہ جاندار مخلوق کی طرح حق تعالیٰ نے نماز کو بھی ایک صورت اور روح مرحمت فرمائی ہے چنانچہ نماز کی روح تو نیت اور حضور قلب ہے

لے یعنی بڑا مقصود یہ ہے گو ظاہری پاکی بھی مقصود ہے جیسا کہ شرع کہتی ہو۱۲۔ لے کھلنا یا فرحت

اور قیام و قعود نماز کا بدن ہے اور رکوع و سجود نماز کا سر اور ہاتھ پاؤں ہیں اور جس قدر اذکار و تسبیحات نماز میں ہیں وہ نماز کے آنکھ کان وغیرہ ہیں اور اذکار و تسبیحات کے معنی کو سمجھنا گویا آنکھ کی بینائی اور کانوں کی قوت سماعت وغیرہ ہے اور نماز کے تمام ارکان کو اطمینان اور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرنا نماز کا حسن یعنی بدن کا سڈول اور رنگ و روغن کا درست ہونا ہے۔

الغرض اس طرح پر نماز کے اجزاء اور ارکان کو بحضور قلب پورا کرنے سے نماز کی ایک حسین و جمیل اور پیاری صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور نماز میں جو تقرب نمازی کو حق تعالیٰ سے حاصل ہوتا ہے اس کی مثال ایسی سمجھو جیسے کوئی خدمت گار[1] اپنے بادشاہ کی خدمت میں کوئی خوبصورت کنیز[2] ہدیۃً پیش کرے اور اس وقت اس کو بادشاہ سے تقرب حاصل ہو۔ پس اگر تمہاری نماز میں خلوص نہیں ہے تو گویا مردہ اور بے جان کنیز بادشاہ کی نذر کر رہے ہو اور ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی گستاخی و بے باکی ہو کہ ایسا گستاخ شخص اگر قتل کر دیا جائے تو عجب نہیں۔ اور اگر نماز میں رکوع و سجدہ نہیں ہے تو گویا لنگڑی لولی اور اپاہج لونڈی نذر کرتے ہو، اور اگر ذکر و تسبیح اس میں نہیں ہے تو گویا لونڈی کے آنکھ کان نہیں ہیں، اور اگر سب کچھ موجود ہے مگر ذکر و تسبیح کے معنی نہیں سمجھے اور نہ دل متوجہ ہوا تو ایسا ہے جیسا کہ کنیز کے اعضاء تو سب موجود ہیں لیکن ان میں حس و حرکت بالکل نہیں یعنی حلقۂ چشم موجود ہے مگر بینائی نہیں ہے اور کان موجود ہیں مگر بہری ہے کہ سنائی نہیں دیتا۔ ہاتھ پاؤں ہیں مگر شل اور بے حس ہیں۔

---

[1] عاجزی انکساری [2] باندی لونڈی زرخرید

اب تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اندھی بہری کنیز شاہی نذرانہ میں قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟
شاید تمہیں یہ شبہ ہو کہ "جب نماز کے فرض اور واجب ادا کر دیئے جاتے ہیں تو علمائے شریعت اُس نماز کے صحیح ہو جانے کا فتویٰ دیتے ہیں۔ خواہ معنی سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں، اور جب نماز صحیح ہوگئی تو جو مقصود تھا وہ حاصل ہوگیا، اس سے معلوم ہوا کہ معنیٰ کا سمجھنا نماز میں ضروری نہیں ہے"

لہٰذا سمجھ لو کہ علماء کی مثال طبیب کی سی ہے پس اگر کوئی لونڈی اپاہج، اور کیسی ہی عیب دار کیوں نہ ہو اگر اس میں رُوح موجود ہے تو طبیب اس کو دیکھ کر ضرور یہ کہے گا کہ یہ زندہ ہے مردہ نہیں ہے۔

بلا حضورِ قلب والی نماز کی صحت پر علماء کا فتویٰ اور شبہ کا جواب

اسی طرح نماز کی روح اور اعضائے رئیسہ کے موجود ہونے سے علماء فتویٰ دیدیں گے کہ نماز صحیح ہے۔ اور فاسد نہیں ہے۔ ایسی صورت میں طبیب نے اور عالم نے اپنے منصب کے موافق جو کچھ کہا وہ صحیح کہا ہے مگر نماز تو شاہی نذرانہ اور سلطانی تقرب حاصل ہونے کی حالت ہے اور اتنا تم خود سمجھ سکتے ہو کہ عیب دار کنیز اگرچہ زندہ ہے مگر سلطانی نذرانہ میں پیش کرنے کے قابل نہیں ہے بلکہ ایسی کنیز کا تحفہ پیش کرنا گستاخی ہے اور شاہی عتاب کا موجب ہے اسی طرح اگر ناقص نماز کے ذریعے اللہ کا تقرب چاہو گے تو تعجب نہیں کہ پھٹے پُرانے کپڑے کی طرح لوٹا دی جائے اور منہ پر پھینک ماری جائے۔

الغرض نماز سے مقصود چونکہ حق تعالیٰ کی تعظیم ہے لہٰذا نماز کے

لہ یہ مضمون طبرانی کی روایت کا ہے جو ضعیف مگر فضائل میں معتبر ہے۔ ۱۲

سُنن اور مستحبات وآداب میں جس قدر بھی کمی ہوگی اسی قدر احترام و تعظیم میں کوتاہی سمجھی جاوے گی۔

نماز کی رُوح اور اعضاء

سوم :۔ نماز کی روح کا زیادہ لحاظ رکھو یعنی نماز میں شروع سے اخیر تک اخلاص اور حضورِ قلب[1] قائم رکھو اور جو الفاظ زبان سے کہتے ہو یا جو کام اعضاء سے کرتے ہو اُن کا اثر دل میں بھی پیدا کرو۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ جب رکوع میں بدن جھکے تو دل بھی عاجزی کے ساتھ جھک جانا چاہیئے اور جب زبان سے اللہ اکبر[2] کہے تو دل میں بھی یہی ہو کہ بے شک اللہ سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے اور جب اَلْحَمْدُ پڑھو تو قلب بھی اللہ کی نعمتوں کے شکریہ سے لبریز ہو اور جس وقت زبان سے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ[3] نکلے تو دل میں اپنے ذلیل وضعیف اور محتاج ہونے کا اقرار کرے یعنی قلب میں بھی یہی ہو کہ بیشک بجز خدا کے کسی چیز کا مجھے اختیار ہے نہ کسی دوسرے کو۔

نماز میں قلب اور زبان کی موافقت

غرض تمام اذکار وتسبیحات اور جملہ ارکان وحالات میں ظاہر و باطن یکساں اور ایک دوسرے کے موافق ہونا چاہیئے۔ اور سمجھ لو کہ نامۂ اعمال میں نماز وہی لکھی جاتی ہے جو سوچ سمجھ کر پڑھی گئی ہو۔ پس جتنا حصہ بغیر سمجھے ادا ہوگا وہ درج نہ ہوگا۔

---

[1] دل کا متوجہ ہونا ۱۲ [2] اللہ ہر شے سے بہت بڑا ہے۔ ۱۲

[3] ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ ۱۲

[4] ابن المبارکؒ نے عمارؓ سے روایت کیا ہے غیر عقلی ہونے کی وجہ سے حدیث کے درجہ میں ہے۔

حضور قلب حاصل کرنے کی تدبیر

ہاں یہ ضرور ہے کہ شروع شروع میں پوری طرح حضور قلب قائم رکھنے میں تم کو بہت دشواری معلوم ہوگی لیکن عادت ڈالوگے تو رفتہ رفتہ ضرور عادت ہو جائے گی، اس لئے اس کی طرف توجہ کرو۔ اور اس توجہ کو آہستہ آہستہ بڑھاؤ۔ مثلاً اگر تم کو چار فرض پڑھنے ہیں تو دیکھو کہ اس میں حضور قلب کس قدر حاصل ہوا؟ فرض کرو کہ ساری نماز میں دو رکعت کی برابر تو دل کو توجہ رہی اور دو رکعت کے برابر غفلت رہی تو ان دو رکعتوں کو نماز میں شمار ہی نہ کرو اور اتنی نفلیں پڑھو کہ جن میں دو رکعت کے برابر حضور قلب حاصل ہو جائے۔ غرض جتنی غفلت زیادہ ہو اسی قدر نفلوں میں زیادتی کرو حتیٰ کہ اگر دس نفلوں میں چار فرض رکعتوں کا حضور قلب پورا ہو جائے تو امید کرو کہ حق تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے فرائض کا نقصان ان نفلوں سے پورا فرمادے گا اور اس کی کمی کا تدارک[1] نوافل سے منظور فرمالے گا

* * *

[1] مضمون حاکم نے روایت کیا ہے ۱۲

دوسری فصل

زکوٰۃ، صدقہ اور خیرات کا بیان

حق تعالیٰ شانہٗ فرماتا ہے کہ "جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس دانہ کی طرح ہے جس میں سات بالیں ہوں کہ ہر بال میں سو دانے" اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[1] ہے کہ "جنھوں نے اپنا مال دو ہتڑ بھر بھر کر راہِ خدا میں لٹایا ہے وہی ہلاکت سے نجات پائیں گے"

چونکہ صدقات و خیرات میں مخلوق کی ضرورتیں اور محتاجوں کے فاقے رفع ہوتے ہیں اس لئے یہ بھی دین کا ایک ستون ہے۔ اور اس میں یہ حکمت ہے کہ چونکہ مخلوق کو اللہ سے محبت رکھنے کا حکم ہے اور مسلمان بندے خدا کی محبت کا دعویٰ بھی کرتے ہیں لہٰذا اللہ پاک نے مال خرچ کرنے کو اپنی محبت کا معیار اور آزمائش کی کسوٹی[2] بنا دیا ہے تاکہ مدعیانِ ایمان کے دعوے کا جھوٹ سچ کھل جائے۔ کیونکہ عام قاعدہ ہے کہ انسان اپنے اس محبوب کے نام پر جس کی محبت دل میں زیادہ ہوتی ہے اپنی تمام مرغوب اور پیاری چیزیں لٹا دیا کرتا ہے۔ پس مال جیسی پیاری چیز کا حق تعالیٰ کے نام پر خرچ کرنا خدا کے ساتھ محبت کے بڑھے ہوئے ہونے

---

[1] مضمون مسلم و بخاری ۱۲

[2] جس سے کسی چیز کا اندازہ لگایا جا سکے ۱۲

کی علامت ہے اور بخل کرنا خدا کی محبت نہ ہونے کی دلیل ہے۔ صدقہ وخیرات دینے والے مسلمان تین طرح کے ہیں۔

خیرات کا اعلیٰ درجہ

ایک تو وہ ہیں جنھوں نے جو کچھ بھی پایا سب راہ خدا میں دے دیا اور خدا کے ساتھ محبت کرنے کا دعویٰ سچ کر دکھایا مثلاً حضرت صدّیق عتیق[1] رضی اللہ عنہ کہ جو کچھ بھی گھر میں تھا انہوں نے سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں لا رکھا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ "اے ابو بکر اپنے لئے کیا رکھا؟" تو عرض کیا کہ "اللہ اور اللہ کا رسول" اسی موقع پر حضرت حضرت فاروق[2] بھی بغرض خیرات مال لائے تھے اور ان سے بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی سوال کیا تھا کہ "اے عمر تم نے اپنے لئے کیا رکھا؟" تو انہوں نے جواب دیا کہ "جس قدر لایا ہوں اسی قدر چھوڑ آیا ہوں" اس وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تم دونوں کے مرتبہ کا فرق تم دونوں کے جواب سے ظاہر ہے[3]"۔

خیرات کا متوسط درجہ

دوسرے درجہ میں وہ متوسط لوگ ہیں جو سارا مال تو خدا کے نام پر نہیں لٹاتے مگر اس کے ساتھ ہی اپنے نفس پر بھی ضرورت سے زیادہ خرچ نہیں کرتے بلکہ محتاج بندوں کی حاجتیں ظاہر ہونے کے منتظر رہتے ہیں اور جس وقت

---

[1] سچا دانا دکیا ہوا دونوں حضرت ابوبکرؓ کے لقب ہیں کہ سچا اور دوزخ سے آزاد کئے ہوئے تھے ۱۲

[2] حضرت عمرؓ کہ حق اور باطل میں خوب فرق کرنے والے تھے [3] یہ مضمون دو حدیثوں کا ایک کر دیا گیا اول کو ترمذی حسن وصحیح کہا اور دوم کو ابو نعیم نے مرسل وجید بیان کیا ہے۔

کوئی مصرف[1] پاتے یا کسی کو محتاج دیکھتے ہیں تو بے دریغ[2] مال خرچ کر ڈالتے ہیں یہ لوگ اپنی کی زکوٰۃ یعنی مقدار فرض پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ سارے کو خدا ہی کے لئے خرچ کرنے کی نیت رکھتے ہیں کہ مال پاس رکھنے سے ان کی غرض اس کو راہِ خدا ہی میں خرچ کرنے کی ہے البتہ موقع محل کا انتظار ہے۔

خیرات کا ادنیٰ درجہ

تیسرے درجہ میں وہ کمزور مسلمان ہیں جو زکوٰۃ واجبہ ہی کے ادا ہونے کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ اگر اس سے زیادہ خیرات نہیں کرتے تو مقدار واجب میں حبہ[3] برابر کمی بھی نہیں کرتے۔

ان تینوں گروہوں کے مرتبوں کا فرق اور حق تعالیٰ کے ساتھ محبت کی مقدار ان کے خرچ کی حالت سے خود ہی سمجھ لو کہ بس اگر تم پہلے اور دوسرے درجہ تک نہ پہنچ سکو تو کم از کم تیسرے درجہ سے بڑھ کر متوسط لوگوں کے ادنیٰ درجہ تک پہنچنے کی کوشش تو ضرور کرو کہ مقدار واجب کے علاوہ روزانہ کچھ نہ کچھ صدقہ کر دیا کرو اگرچہ روٹی کا ذرا سا ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو، پس اگر ایسا کرو گے تو بخیلوں کے طبقہ سے اوپر چڑھ جاؤ گے۔

مُفلس مسلمانوں کی خیرات

اگر تم مفلس و تہی دست[4] ہو تو یہ نہ سمجھو کہ صدقہ مال ہی میں منحصر[5] ہے اور ہم اس سے معذور ہیں۔ نہیں بلکہ اپنی عزت و جاہ، آرام و آسائش قول و فعل غرض جس پر بھی تم کو قدرت ہو اس کو اللہ کے نام پر خرچ کرو۔ مثلاً بیمار کا پوچھنا، جنازہ کے ساتھ جانا اور حاجت کے وقت محتاج کی

---

[1] مستحق، موقع خرچ ۱۲ [2] بغیر افسوس کئے ۱۲ [3] دانہ ۱۲

[4] خالی ہاتھ ۱۲ [5] محدود ۱۲

امداد کر دینا مثلاً کسی مزدور کا بوجھ بٹالینا، یا سہارا لگا دینا، یا سعی و سفارش سے کسی کا کام نکلوا دینا اور نیک بات کہنا یعنی ہمت بندھانا ڈھارس دلانا وغیرہ یہ سب امور[1] صدقہ ہی میں شمار ہوتے ہیں اور یہ ایسے صدقات ہیں جن کے لئے مالدار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

زکوٰۃ و صدقات میں پانچ باتوں کا زیادہ خیال رکھنا چاہئے۔

صدقہ کو چھپانے کی مصلحت

اوّل: جو کچھ بھی دیا کرو وہ لوگوں سے چھپا کر دیا کرو۔ کیونکہ حدیث[2] میں آیا ہے کہ چھپا کر خیرات دینا پروردگار کے غصہ کو بجھاتا ہے۔ اور جو مسلمان اپنے دائیں ہاتھ سے اس طرح خیرات کرے کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو تو وہ ان سات بندوں کے ساتھ محشور ہوگا جن پر حق تعالیٰ قیامت کے دن سایہ فرمائے گا جب کہ اس کے سایہ کے سوا کہیں سایہ نہ ہوگا۔

اور اس میں حکمت یہ ہے کہ صدقہ سے مقصود بخل کی بد خصلت کا دور کرنا ہے مگر اس میں ریا[3] کے خطرناک مرض کا اندیشہ ہے اس لئے چھپا کر دینے کے سبب ریا سے نجات مل جائے گی کیونکہ مسلمان جب قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو ریا سانپ کی صورت اور بخل بچھو کی صورت بن کر اس کو تکلیف پہنچاتا ہے، پس جس نے خیرات کرنے سے جی چرایا اور بخل اختیار کیا تو اس نے اپنی قبر میں کاٹنے کے لئے بچھو بھیج دئے، اور اگر کسی نے خیرات تو کی مگر دکھاوے اور نمود کی غرض سے کی ہے تو بچھو کو گویا سانپ کی غذا بنا دیا اس صورت میں بچھو سے تو نجات ہوگئی مگر سانپ کی

---

[1] بخاری و مسلم کی حدیثوں میں ۱۲ [2] ابن عساکر ضعیف۔ ترمذی حسن وغیرہ۔ طبرانی صحیح ۱۲ [3] مضمون بخاری و مسلم ۱۲ [4] اٹھایا ہوا ۱۲ [5] دکھاوا ۱۲

زہریلی قوت اور زیادہ ہوگئی کیونکہ بخل کا منشار پورا ہوا تو بچھو کا زور بڑھے گا اور ریا کا منشار پورا ہوا تو سانپ کا زور زیادہ ہوگا۔

احسان جتانے کا امتحان

دوم: جسے خیرات دیا کرو اس پر احسان نہ سمجھو اور اس کی شناخت یہ ہے کہ مثلاً تم نے کسی محتاج کو خیرات کے طور پر کچھ دیا اور اس سے شکرگزاری کی توقع رکھی یا مثلاً وہ تمہارے ساتھ بدسلوکی سے پیش آیا تمہارے دشمن کے ساتھ محبت کرنے لگا تو تم کو اس قدر ناگوار گذرا کہ اگر صدقہ دینے سے پہلے یہی صورت پیش آتی تو یقیناً اتنا ناگوار نہ گذرتا تو اس سے صاف ظاہر ہوا کہ تم نے اس محتاج پر اپنا احسان سمجھا جبھی تو اس بدسلوکی پر اتنا طیش آیا۔

احسان جتانے کے مرض کا علاج

اس کا علاج یہ ہے کہ تم اس محتاج کو اپنا محسن سمجھو کہ جس نے تم سے صدقہ کا مال لیکر تم کو حق خداوندی سے سبکدوش کر دیا اور تمہارے مرضِ بخل کا طبیب بن گیا، کیونکہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ زکوٰۃ و خیرات سے مقصود بخل کا دور کرنا ہے، پس مال زکوٰۃ گویا بخل کا دھوون ہوا یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زکوٰۃ و صدقہ کا مال اپنے خرچ میں نہ لاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ مال کا میل ہے[1] تو جس مسلمان نے تمہارے مال کا میل لیکر تمہیں اور تمہارے مال کو پاک و صاف بنادیا تو بھلا بتاؤ کہ اس کا تم پر احسان ہوا یا تمہارا اس پر احسان ہوا؟ بھلا اگر کوئی جراح مفت فصد کھول کر تمہارا وہ ناقص خون نکالدے جو تمہاری دنیوی زندگی کے لئے مضر ہے تو کیا تم اس کو اپنا محسن نہیں سمجھتے؟ اسی

---

[1] مسلم شریف ۱۲

طرح جو شخص قلب سے بخل کے فاسد مادہ کو کہ جس کے ضرر کا حیات اخروی میں اندیشہ ہے بلا معاوضہ لئے ہوئے مفت نکال دے تو اس کو بدرجۂ اولیٰ اپنا محسن و خیر خواہ سمجھنا چاہئے۔

تیسری بات یہ ہے کہ عمدہ سے عمدہ اور پاکیزہ مال خیرات کرو کیونکہ جو چیز تمہیں ناپسند ہو اس کا اللہ کے نام پر دینا کیسے مناسب ہو سکتا ہے تم سن ہی چکے ہو کہ اس سے مقصود دعوائے محبت خداوندی کا امتحان ہے پس جیسی بُری یا بھلی چیز اللہ پاک کے نام پر خیرات کروگے اس سے خود معلوم ہو جائے گا کہ تمہیں اللہ کے ساتھ کس قدر محبت ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ تمہیں جو کچھ دینا ہو ہشاش بشاش[1] اور خندہ رُو[2] ہو کر دیا کرو کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک درہم لاکھ درہم سے بڑھ جاتا ہے[3] اس کا مطلب یہی ہے کہ جو ایک درہم نیک نیتی سے اور خوشی کے ساتھ دیا گیا ہے وہ ان لاکھ درہموں سے بڑھا ہوا ہے جو ناگواری کے ساتھ دیئے گئے ہیں[4]۔

پانچویں بات یہ ہے کہ صدقہ کے لئے محل و مصرف عمدہ تلاش کیا کرو یعنی یا کسی پرہیزگار عالم کو دیا کرو کہ تمہارا مال کھانے سے اس کو

---

[1] خوش خوش ۱۲ [2] ہنس مکھ ۱۲

[3] نسائی، ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم نے مسلم کی شرط پر صحیح بتایا ہے ۱۲

[4] لیکن اس کا مطلب یہ نہ سمجھو کہ جب تک ناگواری دل سے نہ نکلے خیرات نہ دی جائے کیونکہ ابتدا میں ناگواری ضروری ہوتی ہے ایسے وقت میں اس ناگواری پر عمل نہ کرنا اور اللہ کی راہ میں اپنی طبیعت پر زور ڈال کر دیدینا یہ بھی اعلیٰ درجہ کا مجاہدہ اور ہمت کا کام ہے اور مجاہدہ ہونے کی وجہ سے امید ہے کہ خود اس میں ثواب بڑھ جاوے ۱۲

اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور تقویٰ پر قوت اور اعانت حاصل ہو یا کسی عیالدار
نیک بخت مسلمان کو دو اور اگر یہ تمام اوصاف ایک شخص میں جمع نہ ہوں تو
جس میں ایک وصف بھی پایا جائے وہ بھی تمہارا صدقہ پاک ہو جانے کے
لئے کافی ہے البتہ نیک بختی کا لحاظ سب سے مقدم ہے کیونکہ دنیا کا مال و
متاع بندوں کے لئے اسی واسطے مہیا کیا گیا ہے کہ ان کی ایام گذاری ہو
سکے اور ان چند روزہ ایام میں آخرت کا توشہ ان کو حاصل ہو جائے۔ تو
جو لوگ درحقیقت سفر آخرت میں مشغول ہیں اور اس عالم فانی کو راستہ
کا پڑاؤ اور مسافر خانہ سمجھے ہوئے ہیں وہی تمہارے پیسے کے مصرف ہونے
چاہئیں۔ دیکھو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ
"پرہیزگاروں کو کھانا کھلایا کرو اور اپنا تبرع وسلوک ایمانداروں ہی کو
پہنچایا کرو۔[1]

[1] ابو یعلی، ابن ابی الدنیا، حسن ہے۔

تیسری اصل

روزہ کا بیان

حدیث میں آیا ہے حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ہر نیکی کا دس گنا سے سات سو گنا تک نامۂ اعمال میں ثواب لکھا جاتا ہے مگر روزہ خاص میرا ہے اور میں خود ہی اس کا صلہ جو چاہوں گا دوں گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہر شے کا ایک دروازہ ہوتا ہے اور عبادات کا دروازہ روزہ ہے۔

روزہ پر اس قدر اجر و ثواب کا سبب دو باتیں ہیں:

اوّل یہ ہے کہ روزہ کھانے پینے اور مباشرت چھوڑنے کا نام ہے اور ایسا پوشیدہ کام ہے کہ جس پر حق تعالیٰ کے سوا کوئی آگاہ نہیں ہو سکتا، اور اس کے علاوہ جتنی عبادتیں ہیں مثلاً نماز، تلاوت، زکوٰۃ، حج، یہ سب ایسی عبادتیں ہیں جن پر دوسرے لوگ بھی واقف ہو سکتے ہیں، پس روزہ وہی مسلمان رکھے گا جس کو لوگوں میں اپنے عابد و زاہد کہلائے جانے کا شوق اور ریا و نمود کی محبت نہ ہوگی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ روزہ سے دشمن خدا یعنی شیطان مغلوب

۱؎ بخاری، مسلم، نسائی ۲؎ یعنی سب سے محبوب ہے یا یہ کہ ظلم کے بدلہ میں نہ جائے گا ۱۲

۳؎ ابن المبارک، مرسل و حسن ۴؎ بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد کی حدیثوں کا خلاصہ ہے ۱۲

ہوتا ہے ، کیونکہ جس قدر نفسانی خواہشیں ہیں سب پیٹ بھرنے پر اپنا زور دکھاتی ہیں اور شیطان انہیں خواہشات کو واسطہ بنا کر مسلمان کا شکار کرتا ہے اور جب روزہ کی وجہ سے مسلمان بھوکا رہا اور تمام خواہشیں کمزور پڑ گئیں تو شیطان مجبور و بے دست و پا ہو گیا ، چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ " ماہِ رمضان میں جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں شیطان پا بہ زنجیر ہو جاتا ہے ، اور ہاتفِ غیبی پکارتا ہے کہ اے بھلائی کے طلب گار و آگے بڑھو اور اے بدکارو باز آؤ ۔

خوب سمجھ لو کہ روزہ کی تین قسمیں تو کیفیت کے اعتبار سے ہیں اور تین ہی درجے اس کی مقدار کے اعتبار سے ہیں ، ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ صرف رمضان کے فرض روزے ہر سال رکھ لیا کرے

صوم داؤدی کی فضیلت

اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام روزہ رکھتے تھے اسی طرح ایک دن تو روزہ رکھے اور دوسرے دن نہ رکھے پھر تیسرے دن رکھے اور چوتھے دن نہ رکھے ، روزمرہ روزہ رکھنے کی بہ نسبت یہ صورت بدرجہا بہتر ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیشہ روزہ رکھنے سے بھوکا رہنے کی عادت ہو جاتی ہے اور عادت ہوئے پیچھے شکستگی اور قلب میں صفائی اور خواہشات نفسانی میں ضعف و کمزوری محسوس نہ ہوگی حالانکہ روزہ سے یہی مقصود ہے ۔ دیکھو مریض جب دوا کا عادی ہو جاتا ہے تو پھر دوا کچھ بھی

لہ بخاری ، مسلم ، ترمذی ، ابن ماجہ کی حدیثوں کا خلاصہ ہے ۱۲

لہ مضمون حدیث بخاری و مسلم ۱۲

نفع نہیں دیتی۔ یہی سبب ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روزہ کی بابت دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ "ایک دن روزہ رکھو اور دوسرے دن کھاؤ پیو" انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں اس سے بھی اعلیٰ درجہ چاہتا ہوں تو آپؐ نے جواب دیا کہ اس سے اعلیٰ کوئی درجہ نہیں ہے۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی کہ فلاں شخص ہمیشہ روزہ رکھتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ ایسا روزہ رکھنا نہ رکھنا دونوں برابر ہیں۔

دوشنبہ اور پنجشنبہ کے روزہ کی حکمت

متوسط درجہ یہ ہے کہ عمر کا تہائی روزہ میں صرف ہو جائے لہذا مناسب ہے کہ ماہِ رمضان کے علاوہ ہر ہفتہ میں دوشنبہ اور پنجشنبہ کا روزہ رکھ لیا کرو اس حساب سے سال بھر میں چار ماہ اور چار یوم کے روزے ہو جائیں گے مگر چونکہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ اور ایام تشریق میں روزہ رکھنا حرام ہے اور ممکن ہے کہ دونوں عیدیں دوشنبہ یا پنجشنبہ کو پڑیں اور ایام تشریق میں سے ایک دن تو ضرور پیر یا جمعرات کو ہو گا اس لئے چار مہینے اور ایک دن کے روزے ہو جائیں گے اور بارہ مہینے کے تہائی یعنی چار مہینے سے صرف ایک دن زیادہ رہے گا، یہ تہائی عمر کا حساب غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آجائے گا اس مقدار سے روزوں کا کم کرنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ اس میں آسانی بھی ہے اور ثواب بہت زیادہ ہے۔

اور روزہ کی کیفیت کے اعتبار سے تین قسمیں یہ ہیں:

---

۱ بخاری و مسلم ۱۲ ۲ مسلم۔ کچھ فرق سے ۱۲

ایکؔ تو عام روزہ ہے کہ صرف روزہ توڑنے والی چیزوں یعنی کھانے پینے اور جماع سے بچتے ہیں اگرچہ بدن سے گناہ کئے جائیں سو یہ نام ہی کا روزہ ہے۔

دوسرؔا درجہ یہ ہے کہ بدن کے کسی عضو سے بھی کوئی کام خلاف شرع نہ ہو۔ یعنی زبان غیبت سے محفوظ ہے اور آنکھ نامحرم کو بُری نگاہ کے ساتھ دیکھنے سے بچی ہے وغیرہ وغیرہ۔

حلال اور قلیل غذا پر افطار کی حکمت

تیسرا۔ خاص روزہ خاص بندوں کا ہو کہ اعضائے بدن کے ساتھ ان کا قلب بھی فکر و وسواس سے محفوظ رہتا ہے اور سوائے ذکر الٰہی کے کسی چیز کا بھی ان کے دل میں گذر نہیں ہونے پاتا یہ کمال کا درجہ ہے اور چونکہ اس کا حاصل کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہو اس لئے کم سے کم اتنا خیال تو ضرور رکھنا چاہیئے کہ ایسے کھانے پر روزہ افطار کیا کرو جو بلاشبہ حلال اور پاک ہو اور وہ بھی اتنا نہ کھاؤ کہ جس سے معدہ بھاری اور بدن کسلمند ہو جائے کہ تہجد کو بھی آنکھ نہ کھلے یعنی ایسا نہ کرو کہ دن کے چھوٹے ہوئے کھانے کی بھی تلافی افطار کے وقت کرنے لگو کیونکہ ایسا کرنے والوں کو روزہ کا اتنا نفع نہیں ہوتا جتنا کہ کسل کی وجہ سے نقصان ہو جاتا ہے۔

چوتھی اصل

حج کا بیان

حق تعالیٰ فرماتا ہے "لوگوں پر اللہ کے واسطے حج بیت اللہ فرض ہے جس کسی میں وہاں تک پہنچنے کی طاقت ہو" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جو صاحبِ استطاعت مسلمان بغیر حج کئے مرگیا تو اُسے اختیار ہے کہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی۔"

آداب سفر حج بیت اللہ شریف

حج۔ یہ بھی دین کا ایک ستون ہے۔ حج کے اعمال وارکانِ ظاہری کا بیان چونکہ احیاء العلوم میں ہو چکا ہے، لہٰذا اس جگہ حج کے رموز اور آداب بیان کرنے مقصود ہیں۔ پس جاننا چاہیئے کہ آدابِ حج سات ہیں:

اوّل[1] یہ کہ سفر سے پہلے حلال زادِ راہ اور کوئی نیک بخت ساتھی تلاش کر لو، کیونکہ حلال توشہ سے قلب میں نور پیدا ہوگا اور رفیق صالح تم کو گناہوں سے روکتا، اور نیک کام یاد دلاتا رہے گا۔

دوم۔ اس سفر میں تجارت[2] کا خیال بالکل نہ رکھو۔ کیونکہ طبیعت کے

[1] ابن عدی اور ترمذی۔ کچھ فرق سے ۱۲ [2] کوئی یہ وسوسہ دل میں نہ لائے کہ قرآن کے اندر تو تجارت کی اجازت دی ہے، بات یہ ہے کہ اول تو امام غزالیؒ تجارت کو ممنوع نہیں بتلاتے جو خلاف قرآن ہو دوم ہم میں اور صحابہ میں فرق یہ ہے کہ وہ حضرات تجارت بھی اعانتِ دین کیلئے کرتے تھے اور ہم حج کو بھی تجارت کیلئے کر لیں گے ۱۲

تجارت کی طرف متوجہ ہو جانے سے زیارت حرمین شریفین کا ارادہ خالص اور بے لوث نہ رہے گا۔

سوم۔ راستہ میں کھانے کے اندر وسعت کرو اور رفقائے سفر اور نوکروں چاکروں اور کرایہ داروں کو خوش رکھو اور کسی کے ساتھ سختی سے بات نہ کرو بلکہ نہایت خلق و محبت سے اور نرم گفتاری سے سفر ختم کرو۔

چہارم۔ فحش گوئی اور جھگڑے اور فضول بکواس اور دنیا کے معاملات کی بات چیت کو بالکل چھوڑ دو اور ضروری حاجتوں سے فارغ ہونے کے بعد اپنی زبان کو تلاوتِ کلام اللہ اور ذکر الٰہی میں مشغول رکھو۔

پنجم۔ شغدف یا شبری یعنی شان[1] کی سواری پر سوار نہ ہو بلکہ باربرداری کے اونٹ پر بیٹھ جاؤ تاکہ دربارِ حق تعالیٰ میں پراگندہ حال غبار آلودہ اور مسکینوں محتاجوں کی سی ذلیل و خستہ حالت سے حاضری ہو، اس سفر میں بناؤ سنگار اور زیادہ آرام طلبی کا خیال بھی نہ لاؤ۔

ششم۔ کبھی کبھی سواری سے اتر کر پیدل بھی ہو لیا کرو کہ اس میں سواری کے مالک کا بھی دل خوش ہوگا اور سواری کو بھی آرام ملے گا اور نیز تمہارے ہاتھ پاؤں بھی حرکت کرنے سے چست و چالاک رہیں گے۔

ہفتم۔ جو کچھ بھی اس سفر میں خرچ ہو جائے یا جس قسم کا بھی مالی نقصان یا تکلیف یا مصیبت اٹھانی پڑے تو اس پر خوش رہو اور اس کو اپنے حج کے مقبول ہونے کی علامت سمجھو اور اپنے پروردگار سے ثواب کی امید رکھو

حج کی عبادت میں رموز و اسرار تو بہت ہیں مگر ہم صرف دو مضمون بیان

---

[1] مطلب یہ ہے کہ شان دکھانے کو ایسا مت کرو باقی رفع تکلیف کیلئے مضائقہ نہیں ہے ۱۲ (مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ)

کرتے ہیں :-

مشروعیت حج کی حکمت

اوّل یہ ہے کہ حج اس رہبانیت کا بدل ہے جو پہلی امتوں میں رائج تھی، حدیث میں آیا ہے کہ امت محمدیہ کی رہبانیت حق تعالیٰ نے حج کو بنا دیا ہے۔ اوّل بیت عتیق یعنی سب سے پہلے بنے ہوئے مکان کو حق تعالیٰ نے شرف عنایت کیا یعنی اس کو اپنی جانب منسوب فرمایا اور بیت اللہ نام رکھ دیا پھر اس کے گرد و نواح کو حرم گردانا۔ میدان عرفات کو حرم کا صحن بنایا اور اس کا شرف اس طرح فرمایا کہ نہ وہاں شکار جائز ہے نہ درخت کاٹنا حلال۔ سو یہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ مکان سے منزہ ہے اور گھر یا مکان کا محتاج نہیں ہے وہ سب کو محیط ہے اور اسے کوئی جگہ احاطہ میں نہیں لے سکتی۔ پس اس نے خانۂ کعبہ کو جو اپنی جانب منسوب کیا اور اس کے طواف کا لوگوں کو حکم دیا تو اس میں حکمت یہ ہے کہ بندوں کی غلامی کا اظہار اور ان کی بندگی کا امتحان ہو جائے اور فرماں بردار غلام اپنے آقا کے دربار میں دور دراز جگہوں سے بالقصد زیارت کرنے کو جوق در جوق ایسی حالت سے آئیں کہ بال بکھرے ہوئے ہوں غبار آلودہ ہوں شاہی ہیبت و جلال سے سراسیمہ و پریشان حال ہوں ننگے سر ننگے پاؤں مسکین و محتاج بنے ہوئے ہوں اور اسی مصلحت سے اس عبادت میں جس قدر بھی اعمال و ارکان مقرر کئے گئے ہیں وہ سب بعید از عقل ہیں تاکہ ایسے اعمال کا ادا کرنا محض حق تعالیٰ کے حکم کی تعمیل سمجھ کر ہو اور کوئی طبعی خواہش یا عقلی حکمت کا اتباع اس کا باعث نہ ہو، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ بارِالٰہا ہم اپنی عبودیت و غلامی کا

اظہار کرنے کو عبادتِ تحقّہ یعنی حج میں حاضر ہیں۔

ارکان حج کی مشروعیت کا دوسرا راز!!

دوسرا مضمون یہ ہے کہ سفرِ حج کی وضع بالکل سفرِ آخرت کی سی ہے اور مقصود یہ ہے کہ حجاج کو اعمالِ حج ادا کرنے سے مرنے کا وقت اور مرنے کے بعد پیش آنے والے واقعات یاد آجائیں، مثلاً شروعِ سفر میں بال بچوں سے رخصت ہوتے وقت سکراتِ موت کے وقت اہل و عیال سے رخصت ہونے کو یاد کرو اور وطن سے نکلتے وقت دنیا سے جدا ہونے کو اور سواری کے جانوروں پر سوار ہوتے وقت جنازہ کی چارپائی پر سوار ہونے کو یاد کرو۔ احرام کا سفید کپڑا پہنتے وقت کفن میں لپٹنے کو یاد کرو اور پھر میقاتِ حج تک پہنچنے میں جنگل و بیابان قطع کرتے وقت اس دشوار گزار گھاٹی کے قطع کرنے کو یاد کرو جو دنیا سے باہر نکل کر میقاتِ قیامت تک عالمِ برزخ یعنی قبر میں تم کو کاٹنی ہے، راستہ میں راہزنوں کے ہول و ہراس کے وقت منکر نکیر کے سوالات اور اس بیکسی میں ہول و ہراس کا خیال کرو جنگلی درندوں سے قبر کے سانپ بچھو کیڑوں کوڑوں کو یاد کرو اور میدان میں رشتہ داروں اور عزیز و اقارب سے علیحدہ تن تنہا رہ جانے کے وقت قبر کی تنہائی اور وحشت کو یاد کرو اور جس وقت چیخ چیخ کر لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ پڑھو تو زندہ ہونے اور قبروں سے اٹھنے کے وقت کے اس جواب کو یاد کرو جو حق تعالیٰ کی ندا کے وقت میدانِ حشر میں حاضری کے لئے تم عرض کروگے غرض اسی طرح ہر عمل میں ایک عبرت اور معاملۂ آخرت کی یاددہانی ہے جس سے ہر شخص جس قدر بھی اس میں قلب کی صفائی اور دین کی ضروریات کے خیال رکھنے کی وجہ سے استعداد ہوگی آگاہی حاصل کرسکتا ہے۔

پانچویں اصل

تلاوت قرآن کا بیان

تلاوت کی فضیلت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "میری امت کے لئے سب سے بہتر عبادت کلام اللہ کی تلاوت ہے" حدیث قدسی میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "جو بندہ قرآن شریف کی تلاوت میں مشغول ہو کر دعا نہیں مانگ سکا میں اس کو بے مانگے اتنا دوں گا کہ مانگنے والوں کو اتنا نہ دوں گا"

تلاوت قرآن شریف کے ظاہری آداب تین ہیں:

تلاوت کا پہلا ظاہری ادب

اوّل یہ کہ تلاوت کرتے وقت دل میں بھی کلام اللہ کا احترام رکھے اور چونکہ ظاہر کو باطن تک اثر پہنچانے میں بہت دخل ہے اس لئے جب ظاہری صورت احترام کی پیدا کی جاوے گی تو قلب میں بھی احترام پیدا ہو جائیگا اور ظاہری احترام کی صورت یہ ہے کہ وضو کر کے نہایت سکون کے ساتھ گردن جھکائے ہوئے قبلہ کی طرف منہ کر کے دوزانو اس طرح بیٹھو جیسے استاد کے سامنے ہیں اور تجوید کے موافق حروف قرآنیہ کو مخارج سے نکالو اور ایک حرف کو دوسرے سے علیحدہ علیحدہ ٹھیر ٹھیر کر تلاوت کرو۔

۱؎ بیہقی۔ حسن لغیرہ ۱۲ ۲؎ ترمذی۔ حسن غریب ۱۲

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اگر میں سورۃ اِنَّا اَنزَلنَا اور اَلقَارِعَۃُ یعنی چھوٹی سورتیں سوچ کر تلاوت کروں تو اس سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں کہ سورۂ بقرہ اور آل عمران فر فر[۲] پڑھ جاؤں۔

دوسرا ادب

دوم۔ کبھی کبھی تلاوت کی فضیلت کے انتہائی درجہ کے حاصل کرنے کا شوق تم بھی کیا کرو۔ کیونکہ تم آخرت کی تجارت کے لئے دنیا میں آئے ہو۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہو زیادہ نفع کمانے کی کوشش کرو۔ یوں تو تلاوتِ کلام اللہ سے کسی طرح بھی کیوں نہ ہو خواہ بیٹھے ہو یا لیٹے ہو، باوضو ہو یا بے وضو اور خلوت میں ہو یا جلوت میں بہرحال نفع ہی نفع ہے۔ مگر بڑا نفع اس میں ہے کہ شب کے وقت مسجد میں بحالت نماز کلام اللہ پڑھو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں کہ جو شخص نماز میں کھڑے ہو کر قرآن شریف پڑھے گا اس کو ہر حرف کے بدلے سو نیکیاں ملیں گی، اور نماز میں بیٹھ کر قرآن شریف پڑھنے والے کو پچاس نیکیاں، اور نماز کے سوا دوسری حالت میں باوضو تلاوت کرنے والے کو پچیس اور بلا وضو دس نیکیاں ملیں گی۔"[۳] اب تم ہی سوچو کہ سوداگر کو زیادہ نفع کی حرص کیوں نہ کی جائے۔

تیسرا ادب اور شب کی کراہت کا راز

سوم۔ تلاوت کی مقدار کا بھی لحاظ رکھو، ادنیٰ درجہ تو یہ ہے کہ

---

[۱] مضمون عبد الرزاق ۱۲ [۲] فر فر پڑھنے کی وجہ سے الفاظ بھی سمجھ میں نہ آئیں گے اور اس کا بے ادبی ہونا ظاہر ہے باقی اگر کوئی شخص معنی نہ سمجھے اور صرف الفاظ قرآن ہی صحیح اور صاف ادا کرے تو یہ اجر و ثواب سے خالی نہیں۔ ۱۲

[۳] تقریبی مضمون دیلمی ۱۲

ہر مہینے میں ایک مرتبہ ختم کرو اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ تین دن میں ختم کرو کہ مہینہ بھر میں دس ختم ہوں اور متوسط درجہ یہ ہے کہ ہر ہفتہ پورا قرآن شریف ختم کر لیا کرو۔ تین دن سے کم میں کلام مجید ختم کرنا مکروہ ہے کیونکہ سمجھ نہ سکو گے اور بلا سمجھے پڑھنا گستاخی ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ جب تلاوتِ کلام اللہ نافع ہے تو جس قدر بھی تلاوت زیادہ ہوگی اسی قدر ثواب زیادہ ہوگا۔ یہ تمہارا قیاس غلط ہے۔ خدا کے بھید کا سمجھنا انبیاء علیہم السّلام ہی کا کام ہے پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں کہ تین دن سے کم میں ختم مستحب نہیں ہے تو تم کو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع لازم ہے، اور اپنی رائے کو دخل دینا کم سمجھی اور جہالت ہے۔ چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ دوا بیمار کو نفع دیتی ہے لیکن اگر طبیب کی بتلائی ہوئی مقدار سے زیادہ دو گے تو دیکھ لو یہ مریض مرے گا یا اچھا ہو جائے گا؟ اسی طرح نماز حالانکہ عبادتوں میں اصل ہے مگر وہ طلوع وغروب اور استوائے آفتاب کے وقت ناجائز اور صبح وعصر کے فرضوں کے بعد مکروہ ہے۔[1] جب مرض کی دوا میں جسمانی طبیب کی بات بے چون وچرا مان لی جاتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ روحانی علاج اور روحانی طبیب کی بتلائی ہوئی دوا میں اس کی مقدار کا لحاظ نہ رکھا جائے اور اس کے بڑھانے میں عقل کو دخل دیکر سوال کیا جائے کہ تین دن سے کم میں ختم کرنا کیوں ناجائز ہے۔

تلاوتِ کلام اللہ کے باطنی آداب پانچ ہیں:

تلاوت کلام اللہ کے باطنی آداب

اوّل۔ جس طرح حق تعالیٰ کی عظمت وجلال دل میں ہے اسی

---

[1] یعنی نفل اور سنت پڑھنا مکروہ ہے ۱۲ (مولانا تھانوی قدس سرہٗ)

طرح اس کے کلام کی بھی عظمت قلب میں ہونی چاہئے۔ مثلاً جب اللہ کی گوناگوں مخلوقات یعنی عرش و کرسی، لوح و قلم، آسمان و زمین، حیوان و انسان، جنات و نباتات و جمادات کا تصور کروگے تو ضرور خیال ہوگا کہ اس عالم کا پیدا کرنے والا وحدہٗ لاشریک نہایت زبردست اور ایسا مدبّر ہے کہ اس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ تمام عالم کی بقا اسی کے فضل و کرم پر موقوف ہے۔ ایسے شاہنشاہِ عالیشان کے فرمان واجب الاذعان یعنی قرآن مجید کی کیا عظمت و وقعت ہونی چاہئے؟ یاد رکھو کہ جس طرح اس کے الفاظ کو ہاتھ لگانے کے لئے طہارت اور وضو کی ضرورت ہے اسی طرح اس کے معنی کے دل میں لانے کے لئے قلب کی طہارت اور تمام اخلاق رذیلہ سے پاکی لازم ہے۔ پس جو قلب باطنی گندگی اور نجاست میں آلودہ ہے وہ اس محترم شاہی فرمان کے حقائق کو کیونکر سمجھے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عکرمہؓ قرآن شریف کھولتے تو اکثر بے ہوش ہو جاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ "یہ میرے پروردگار جل جلالہٗ کا کلام ہے۔"

کلام الٰہی کے لباسِ الفاظ میں مستور ہونے کی حکمت

اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ اس نے اپنے باعظمت کلام ازلی کے انوار و تجلیات کو حروف کے لباس میں چھپا کر تمہارے حوالہ کیا ہے، ورنہ اس کی نورانی شعاعوں کا کوئی بشر متحمل نہ ہو سکتا۔ دیکھ لو کہ طور جیسا پہاڑ بھی کلام الٰہی کی تجلیات کا تحمل نہ کر سکا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اگر اللہ پاک موسیٰ علیہ السلام کو نہ سنبھال لیتے تو ان میں بھی حرف اور آواز کے لباس سے مجرّد کلام الٰہی کے سننے کی طاقت نہ تھی۔

تلاوت میں ترتیل اور معنی کا فہم و تدبّر

دوم ۔ اگر قرآن شریف کے معنی سمجھ سکتے ہو تو کوئی آیت بھی بلا سمجھے تلاوت نہ کرو کیونکہ ترتیل میں جس کا قرآن شریف میں حکم ہے تدبر یعنی غور و فکر اور سمجھنے اور سوچنے ہی سے حاصل ہوتی ہے ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ اس تلاوت سے کیا نفع جس میں سمجھنے سے واسطہ نہ ہو؟ ختم قرآن کی تعداد بڑھانے کا خیال مت کرو کہ چاہے سمجھو یا نہ سمجھو مگر نام ہو جاوے کہ اتنے قرآن شریف ختم کئے، یاد رکھو کہ اگر تم سوچ سمجھ کر ایک ہی آیت کو رات بھر پڑھے جاؤ گے تو یہ پچاس قرآن ختم کرنے سے بہتر ہو گا ۔

دیکھو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کو بیس مرتبہ دہرایا ہے ، اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام رات ایک ہی آیت کو بار بار پڑھا ۔ اور وہ آیت یہ تھی اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (یا اللہ اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر بخش دے تو بے شک تو زبردست اور حکمت والا ہے) حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ آیت اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ کو تمام شب بار بار پڑھتے رہے اور حضرت سعید بن جبیرؒ نے آیت وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ کو بار بار پڑھنے میں تمام رات ختم کر دی ۔ ایک عارف فرماتے ہیں کہ میں ہر ہفتہ میں ایک

ابن عبدالبر   عہ ابوذر غفاریؓ کی روایت عنہ ابن ماجہ و نسائی ذرا فرق سے ۔ ۱۲

ابو عبید فضائل میں ۱۲ ۔ کیا گناہوں کے مرتکب ہونے والوں کا گمان یہ ہے کہ ہم انکو نیکوکاروں کے مساوی بنا دیں گے ۱۲   اور علیحدہ ہو جاؤ آج اے مجرمو ۱۲ منہ

ختم پڑھتا ہوں اور ایک ختم ہر مہینے میں اور ایک ایسا ہے کہ جس کو سال بھر میں ختم کرتا ہوں اور ایک تلاوت ایسی بھی ہے جس کو تین سال سے شروع کر رکھا ہے اور اب تک پورا کلام مجید نہیں ہوا ۔ یہ فرق ظاہر ہے کہ فکر و فہم اور غور و تدبر ہی سے ہوتا ہے ۔ کیونکہ انسان کا دل ہر وقت یکساں نہیں رہتا اور نہ ہمیشہ مساوی درجہ کے غور و فکر کا عادی ہوتا ہے ، اس لئے اگر خصوصیت کے ساتھ ایک ختم علیحدہ طور پر تم بھی ایسا شروع کر لو جس میں سوچ سمجھ کر تلاوت کی جائے اور اس وقت پڑھا جائے جبکہ قلب فارغ ہونے کی وجہ سے فکر و خوض کر سکو اور معنی اچھی طرح سمجھ سکو تو بہت اچھا ہے کیونکہ اس صورت میں تلاوت کے معمول میں بھی فرق نہ آئے گا اور فضیلت کا درجہ بھی حاصل ہو جائے گا ۔

ہر آیت سے اس کے خاص مفہوم ہی کی معرفت حاصل ہوگی ،

سوم ۔ اس فہم و تدبر کی حالت مذکورہ میں معرفت الٰہی کی گوناگوں شاخوں سے پھل اور پھول بھی چنتے رہو کیونکہ ہر پھل کے لیے جدا شاخ اور ہر جوہر کے لئے جدا معدن ہے کہ جہاں موتی پیدا ہوتے ہیں وہاں تریاق کا تلاش کرنا فضول ہے اور جہاں مشک و عود دستیاب ہوتا ہے وہاں موتیوں کی جستجو بے فائدہ ہے ، اسی طرح قرآن شریف کی آیتوں میں جس قسم کا تذکرہ ہو اسی قسم کا عرفان حاصل کرنا چاہیئے ۔ مثلاً جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات و صفات یا افعال کا تذکرہ فرمایا ہے وہاں سے حق تعالیٰ کی عظمت و جلال کی معرفت حاصل کرو ، اور جس جگہ راہ مستقیم کی تعلیم مذکور ہو وہاں رحمت و کرم اور فضل و حکمت کی معرفت حاصل کرو ۔ اور جہاں کافروں کے ہلاک کرنے کا بیان ہو اس جگہ سے حق تعالیٰ کی بے نیازی اور غلبہ و قہر کی صفت معلوم کرو اور جن آیتوں میں انبیائے علیہم السلام کے تذکرے ہوں

وہاں سے اللہ پاک کے لطف و احسان کا علم حاصل کرو۔ غرض جیسا موقع ویسا عرفان۔

اختیاری وسوسے اور ان کے مراتب

چہارم ۔ قرآن کا مطلب سمجھنے سے جو امور مانع ہیں ان کو جہاں تک ہو سکے دفع کرو کیونکہ ضعیف الایمان بندوں کیلئے تو خواہشات نفسانی اور وساوس شیطانی حجاب بن جاتی ہیں کہ ان کے نفوس دنیوی تعلقات سے وابستہ اور ان کے قلوب شبہات و شک میں ملوث ہوتے ہیں اور یہی قلب کے وہ پردے ہیں جن کے سبب قرآن پاک کی باریکیاں سمجھ میں نہیں آسکتیں لہذا ان کے اٹھانے کی کوشش ہونی چاہئے ۔ اور جن لوگوں کا ایمان قوی ہو جاتا ہے کہ خدا کی محبت ان کے قلب میں پیدا ہونے اور ان کو طاعت میں لذت آنے لگتی ہے ان پر بھی قلبی وساوس اپنا اثر کرتے ہیں ، مثلاً نماز کی حالت میں ان کا دل اس طرف متوجہ ہو جاتا ہے کہ ہماری نیت کیسی ہے ، اور جو خلوص شروع نماز کے وقت تھا وہ اب بھی قائم ہے یا نہیں ، یا مثلاً حرفوں کے مخارج سے ادا ہونے میں شبہ پڑتا ہے اور آیت کو اس نیت سے بار بار دہراتے ہیں ، حالانکہ قلب کیلئے یہ بھی حجاب ہے ، کیونکہ حروف اور ان کی درستی کے پیچھے پڑ جانا[1] اور مخارج حروف یعنی دانتوں ، ہونٹوں ، تالو اور حلق کی طرف مشغول ہونا کہ یہ حرف کہاں سے نکلا اور ٹھیک نکلا یا نہیں نکلا ؟ ان کا کام[2] نہیں جن کو عالم علوی کی سیر و سیاحت اور ملکوتی امور کا مشاہدہ کرنا منظور ہے ۔

---

[1] جن کو قصداً دل میں جگہ دی جاتی ہے۔

[2] یعنی زیادہ اہتمام کچھ تو ضروری ہے۔

معرفت کے ساتھ حالت و اثر بھی پیدا کرنا چاہیئے،

پنجشم ۔ آیاتِ کلام الٰہی سے صرف تجلیات اور معرفت ہی کے حاصل کرنے پر اکتفا نہ کرو بلکہ اس کے ساتھ حالت و اثر بھی ظاہر ہونا چاہیئے مثلاً اگر ایسی آیت پڑھو جس میں رحمت کا ذکر اور مغفرت کا وعدہ ہو تو جسم پر خوشی اور مسرت کی حالت پیدا ہو جائے، اور غیظ و غضب اور عذاب الٰہی کا تذکرہ ہو تو تمہارا بدن لرز اٹھے، اور حق تعالیٰ کا نام آوے یا اس کی عظمت و جلال کا ذکر ہو تو جھک جاؤ اور ذلت اختیار کرو کہ گویا جلال خداوندی کے مشاہدے سے نیست و نابود ہوئے جاتے ہو اور اگر کافروں کی ان خرافات کا بیان ہو جو انہوں نے حق تعالیٰ پر بہتان باندھے ہیں، مثلاً مخلوق میں سے کسی کو نعوذ باللہ خدا کا بیٹا یا بیٹی یا بیوی بتایا ہے، تو اس کی نقل سے بھی شرماؤ اور ایسی آیت کی تلاوت میں اپنی آواز کو پست کر دو کہ گویا ان کے الفاظ کا اپنی زبان پر لانا بھی گراں گذرتا ہے ۔ غرض جس آیت میں جیسا مضمون ہو اس کے مطابق ایک خاص حالت پیدا اور جسم پر وہی اثر ظاہر ہونا چاہیئے کہ خوف کے وقت آنکھوں سے آنسو بہنے لگیں اور شرم کے وقت پیشانی پر پسینہ آجائے اور ہیبت کے وقت رونگٹے کھڑے ہو جائیں کپکپی چھوٹے اور مژدۂ بشارت کے وقت آواز و زبان اور اعضاء میں انبساط و بشاشت پیدا ہو جائے ۔

چھٹی اصل

ہر وقت ذکرِ الٰہی کا بیان

حق تعالیٰ شانہٗ ارشاد فرماتا ہے "اللہ کا کثرت سے ذکر کرو، تاکہ فلاح پاؤ" اور حدیث میں آیا ہے[1] کہ "اللہ کا ذکر جہاد اور صدقات اور خیرات سب سے افضل ہے" اس سے معلوم ہوا کہ ذکر اللہ سے بہتر کوئی عمل نہیں ہے، ذکر الٰہی کے لئے ایک مغز اور تین پوست ہیں، اور مغز تو مقصود بالذات ہے مگر پوست اس لئے مقصود اور محبوب ہیں کہ وہ مغز تک پہنچنے کے ذرائع اور اسباب ہیں۔

پہلا پوست صرف زبان سے ذکر کرنا ہے۔

دوسرا پوست قلب سے ذکر کرنا اور جبراً بہ تکلف اس کا خوگر ہونا ہے، یاد رکھو کہ قلب کو اپنی حالت پر چھوڑنا نہ چاہیئے کیونکہ اس تفکرات اور تخیلات میں پڑنے سے پریشانی ہوتی ہے لہٰذا مناسب ہے کہ اس کی مرغوب شئی یعنی ذکر الٰہی اس کے حوالہ کر دی جائے تاکہ اس کو اطمینان حاصل ہو جائے۔

تیسرا پوست یہ ہے کہ ذکر الٰہی قلب میں جگہ کر لے اور ایسا گڑ جائے کہ اس کا چھڑانا دشوار ہو جائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے درجہ میں جس طرح قلب کو ذکر کی عادت ڈالنے کی دقت پیش آئی تھی۔ اس تیسرے درجہ میں قلب سے ذکر اللہ کی عادت چھڑانا اس سے زیادہ دشوار ہو۔

---

[1] ابن شاہین بلفظہ ۱۲

فنا اور فناء الفنا کی ماہیت اور تمثیل سے اس کا سمجھنا

چوتھا درجہ جو معتزاو مقصود بالذات ہے وہ یہ ہے کہ قلب میں ذکر کا نام ونشان بھی باقی نہ رہے بلکہ مذکور یعنی حق تعالیٰ کی ذات ہی ذات رہ جائے کہ نہ قلب کی طرف توجہ رہے نہ ذکر کی جانب التفات اور نہ اپنی خبر ہو نہ کسی دوسرے کی غرض ذات باری میں استغراق ہو جائے، اسی حالت کا نام فنا ہے، اور اس حالت پر پہنچکر بندہ کو نہ اپنی ظاہری حس وحرکت کا کوئی علم ہوتا ہے اور نہ باطنی عوارض کا، یہاں تک کہ اپنے فنا ہو جانے کا علم بھی باقی نہیں رہتا، کیونکہ فنا ہو جانا بھی تو خدا کے علاوہ دوسری ہی چیز ہے اور غیر اللہ کا خیال میل کچیل اور کدورت ہے پس فنا کا علم بھی اس درجہ میں پہنچکر کدورت اور بُعد ہوا، یہی وہ حالت ہے جس میں اپنے وجود کے فنا کے ساتھ خود فنا سے بھی فنائیت ہوتی ہے، ایسی محویت سمجھ میں آنی مشکل ہے بلکہ بظاہر ناممکن اور دعویٰ بلا دلیل معلوم ہوگا۔ لیکن اگر تم کو کسی حسین صورت پر عاشق ہونے یا کسی عاشق صادق کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا تو اس حالت کو کبھی دشوار نہ سمجھوگے، کیا حسن پرست فریفتہ انسان اپنی معشوقہ کے فکر اور خیال میں ایسے محو مستغرق اور بیخود نہیں ہو جاتے کہ بسا اوقات زبان سے کوئی بات کرتے ہیں اور اس کو خود بھی نہیں سمجھتے۔ پاؤں ڈالتے کہیں ہیں اور پڑتا کہیں ہے۔ اس کے سامنے سے آدمی گذر جاتا ہے، حالانکہ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، مگر وہ ان کو نظر نہیں آتا۔ دوسرا شخص ان سے بات کرتا ہے مگر یہ سنتے ہی نہیں۔ اگر ان سے پوچھا جائے کہ کیوں بھائی کیا دیکھا اور کیا سُنا تو وہ کچھ بھی جواب نہیں دے سکتے پس معلوم ہوا کہ ان کو ایسی محویت ہو گئی کہ اپنی محویت کا بھی ان کو علم نہ رہا کہ دیوانہ بن گئے اور ایسے دیوانہ بنے کہ اپنی دیوانگی کی بھی خبر نہ رہی مجنوں ہو گئے اور جنوں

کی بھی اطلاع نہیں، یہ سب اسی معشوقۂ مطلوبہ کے خیال میں مستغرق ہو جانے کا اثر ہے۔ اس کو بھی جانے دیجئے اس سے بھی آسان طریقے سے فنا کی فنائیت سمجھ میں آسکتی ہے۔ دیکھو تم کو اپنی آبرو اور مال کے ساتھ محبت ہے۔ بس اگر خدانخواستہ کسی دشمن کی طرف سے تمہارے مال یا آبرو پر حملہ ہو تو اس کے غصہ اور طیش میں جو کچھ تمہاری حالت ہو گی اس پر غور کرو کہ وہ کیسی بے خودی کی حالت ہے، ظاہر ہے کہ غیظ و غضب میں نہ تم کو اپنی خبر رہتی ہے اور نہ دوسرے کی، اور تم ایسے بے خود ہو جاتے ہو کہ اس وقت اپنی بیخودی کا بھی تم کو حس نہیں رہتا پھر کوئی بندہ اپنے مولا کے خیال میں ایسا محو ہو جائے کہ خود فنا سے فنا اور بے خود ہو جائے تو کیا تعجب ہے؟

سمجھانے کی غرض سے یہ مثالیں ہم نے بیان کی ہیں، ورنہ اصل بات تو یہ ہے کہ جس وقت خدا کے فضل سے اس حالت پر پہنچو گے تو فنائیت اور فناء الفنا کی اصل حقیقت اسی وقت معلوم کر سکو گے۔

ساتویں اصل

طلب حلال کا بیان

جہاں کہیں عبادت کا حکم ہوا ہے اس کے ساتھ ہی اکل حلال کا بھی حکم ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ " پاک چیز کھایا کرو اور نیک کام کیا کرو " جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ " ایمان لانے اور نماز پڑھنے کی فرضیت کے بعد رزق حلال کی تلاش فرض ہے " حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ " اگر تم نمازیں پڑھتے پڑھتے کمان کی طرح جھک جاؤ اور روزے رکھتے رکھتے تانت کی طرح دبلے بھی ہو جاؤ تو بغیر تقویٰ اختیار کئے اور مال حرام سے بچے کچھ بھی قبول نہ ہوگا " رزق حرام کھا کر عبادت کرنا ایسا ہی ہے جیسا گوبر پر مکان تعمیر کرنا۔ یاد رکھو کہ رزقِ حلال کو قلب کی نورانیت میں بڑا اثر ہے، لہٰذا مال حرام سے بچنا اور تقویٰ اختیار کرنا نہایت ضروری ہے۔

تقویٰ کے چار درجے ہیں :

پہلا درجہ۔ جن چیزوں یا جس مال کی حرمت پر علمائے دین اور فقہائے شریعت کا فتویٰ ہے ان کا استعمال نہ کرو کیونکہ ان کے استعمال سے آدمی فاسق بن جاتا ہے اور ثقاہت جاتی رہتی ہے یہ تو عام مومنین کا تقویٰ کہلاتا ہے۔

دوسرا درجہ۔ صلحاء کا تقویٰ ہے یعنی مشتبہ چیز سے بھی پرہیز کرنا کیونکہ علمائے شریعت نے ظاہری حالت دیکھ کر اگرچہ مشتبہ کو حلال کہدیا ہے مگر چونکہ

لہ طبرانی ضعیف، و دیلمی حسن ۱۲

اس میں حرمت کا احتمال ہے اور اسی وجہ سے وہ شئے مشتبہ کہلاتی ہے لہذا صلحاء اس کو بھی استعمال نہیں کرتے ۔ دیکھو جنابؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "جس میں شبہ ہو اس کو چھوڑ دو ۔ اور اس کو اختیار کرو جس میں کچھ شبہ نہ ہو "

جائز زینت اور مباح لذت سے پرہیز کرنے کا راز

تیسرا درجہ ۔ اتقیاء کا تقویٰ ہے۔ جنابؐ[2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ " مسلمان جب تک خطرہ والی چیزوں میں مبتلا ہونے کے اندیشے سے بے خطرہ چیزوں کو بھی ترک نہ کرے گا اس وقت تک اتقیاء کے درجہ کو ہرگز نہ پہنچے گا " حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ " حرام کے مرتکب ہو جانے کا اندیشہ سے ہم حلال کے بھی دس حصوں میں سے نو حصے ترک کر دیتے ہیں " اسی بناء پر اللہ کے پرہیزگار بندے جب سو روپیہ کے مستحق ہوتے ہیں تو ایک کم سو لیتے ہیں اور جس وقت دوسرے کا حق دیتے ہیں تو ایک حبہ[3] زیادہ دیتے ہیں، اور جب اپنا حق لیتے ہیں تو ایک حبہ کم لیتے ہیں ۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے کہ بیت المال کا مشک ان کے پاس آتا تو اپنی ناک بند کر لیتے اور فرمایا کرتے کہ اس کی خوشبو سونگھنا بھی تو اس کا استعمال ہی کرنا ہے لہذا بیت المال کی خوشبو میں سونگھنا نہیں چاہتا ۔ مزہ دار حلال چیزوں کے کھانے اور جائز زینت اور آراستگی سے پرہیز کرنے کی بھی یہی وجہ ہے کہ زبان کو مزہ لگنا اچھا نہیں ہے کیونکہ آج

---

[1] ابن حبان ترمذی احمد صحیح ۱۲ [2] ترمذی ابن ماجہ حاکم صحیح ۱۲

[3] یہ زیادہ دینا سود نہیں ہے اس لئے کہ شرط قرار نہیں دی گئی تھی بلکہ تبرع اور احسان ہے کہ بلا استحقاق دوسرے کے ساتھ سلوک کیا ۱۲ مترجم

حلال کا مزہ پڑا ہے تو کل حرام کی لذت حاصل کرنے کا شوق ہو جائے گا۔ قرآن شریف میں کافروں کی کثرتِ مال ومتاع اور دنیا داروں کے جاہ وحشم کی جانب نظر کرنے کی جو ممانعت آئی ہے وہ بھی اسی لئے آئی ہے کہ اس چمک دمک سے ایمان کی شیرینی کم ہو جائے گی اس لئے کہ دنیا کے مال ومتاع کی رغبت اور محبت سے قلب میں ایمان کی محبت نہیں رہا کرتی۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ جس کا کپڑا پتلا اس کا ایمان بھی پتلا۔ غرض اتقیاء کے نزدیک وہی مال حلال اور قابل استعمال ہے جس میں نہ بالفعل کسی قسم کا شبہ ہو، اور نہ آئندہ کسی آفت کا خطرہ یا احتمال ہو۔

صدیقین کا تقویٰ اور احتیاط کے قصے

چوتھا درجہ صدیقین کا تقویٰ ہے یعنی جس چیز کے کھانے سے عبادات اور طاعت پر قوت حاصل نہ ہو اس سے پرہیز کرنا۔

مثلاً ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ انہوں نے دوا پی تو ان کی بیوی نے کہا کہ چند قدم ٹہل لیجئے، انہوں نے جواب دیا کہ فضول و عبث حرکت جائز نہیں ہے میں اپنے نفس سے تمام حرکات وسکنات کا محاسبہ[1] لیا کرتا ہوں بھلا اس چہل قدمی کو کس حساب میں شمار کروں گا۔ اسی طرح جس شئے کے اپنے نفس تک پہنچنے کے وسائل میں سے کسی ایک سبب کے اندر بھی کچھ معصیت[2] خداوندی کو دخل ہو اس سے بھی پرہیز کرنا اس درجہ میں ضروری ہے۔ حضرت ذوالنون مصریؒ ایک مرتبہ جیل خانے میں قید تھے، کسی نیک بخت عورت نے ان کو بھوکا پاکر اپنی حلال معاش میں سے کچھ کھانا پکایا اور داروغہ جیل کے ہاتھ ان تک پہنچایا مگر شیخ نے قبول نہ کیا اور یہ کہہ کر اس کو واپس کر دیا کہ کھانا اگرچہ

---

[1] حساب لینا ۱۲ [2] گناہ ۱۲

حلال ہے لیکن طباق نجس ہے۔ طباق سے مراد جیل خانے کے داروغہ کا ہاتھ ہے کہ وہ ظالم ہے، اور ظالم کا ہاتھ پڑنے کی وجہ سے اس قابل نہ رہا کہ میں اس کو کھاؤں۔ حضرت بشر حافی شہروں کی ان نہروں کا پانی بھی نہ پیتے تھے جن کو غیر محتاط اور ظلم پسند بادشاہوں نے کھدوایا تھا۔ ایک بزرگ کا غلام کسی فاسق شخص کے گھر سے چراغ روشن کرلایا تو انہوں نے بجھادیا اور فرمایا کہ حق تعالیٰ کے نافرمان بندہ کے چراغ سے روشن کئے ہوئے چراغ کی روشنی نفع اٹھانے کے لائق نہیں ہے۔ غرض قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرْھُمْ کے پورے عامل صرف یہی لوگ تھے کہ "کہو اللہ اس کے بعد سب کو چھوڑ دو"۔ انہوں نے کبھی ایسی چیز کا استعمال نہیں کیا جو اللہ واسطے نہ تھی۔ یہ درجہ حاصل کرنا چونکہ آسان نہیں ہے اس لئے صرف ثقہ[1] مسلمانوں کا تقویٰ تو ضرور حاصل کرو کہ ان چیزوں کے پاس نہ پھٹکو جن کی حرمت پر علمائے دین کا فتویٰ ہے۔ اور اس کے ساتھ دو باتوں کا اور بھی خیال رکھو۔

تمام حیلوں کا صحیح مطلب اور ان سے احتیاط کی ضرورت

پہلی بات تو یہ ہے کہ بعض فقہائے مسائل شرعیہ کے متعلق جو حیلے بیان کئے ہیں ان کی جانب التفات نہ کرو۔ مثلاً سال ختم ہونے سے پہلے اپنا تمام مال اپنی بیوی کے نام اور بیوی کا سارا مال اپنے نام منتقل کرلیا کہ چونکہ مملوکہ مال سال بھر اپنی ملک میں نہیں رہا اس لئے زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی۔ اس قسم کا حیلہ کبھی مت اختیار کرنا۔ بات یہ ہے کہ فقہائے شریعت کا کام چونکہ دنیوی انتظام وسیاست ہے اس لئے اس حیلہ کی صورت میں زکوٰۃ ساقط ہونے کا فتویٰ دینے سے ان کی مراد یہ ہے کہ دنیا کا منتظم اور حاکم

---

[1] معتبر دیندار ۱۲

وقت سلطان اسی مسلمان سے زکوٰۃ کا مطالبہ کرے گا جس کا مال پورے سال بھر تک اس کے قبضۂ مالکانہ میں دیکھے گا، اور اس حیلہ کرنے والے متموّل[1] مسلمان کے پاس سلطانی محصل تحصیل زکوٰۃ کے لئے نہیں آئے گا، کیونکہ جتنی بات بندوں کے دیکھنے کے متعلق تھی یعنی مالکانہ قبضہ وختم سال سے قبل بیوی کے نام منتقل ہو جانے کی وجہ سے جاتا رہا۔ مگر تم کو چونکہ معاملہ اپنے پروردگار سے رکھنا ہے اور وہ دلوں کے حالات سے واقف ہے اس لئے یہ مکروفریب آخرت میں کام نہ آئے گا۔ تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ زکوٰۃ سے مقصود بخل کی عادت کا دور کرنا ہے اور جب زکوٰۃ تک سے بچنے کے حیلے کرنے لگو گے تو بخل کہاں دور ہوا، بلکہ بخل کو تو سر چڑھا کر اپنا امام اور پیشوا بنا لیا کیونکہ اس کا یہاں تک کہنا مانا کہ اس بخل کو نجات دہندہ اور خدا کے سامنے سرخرو کر دینے والا سمجھ بیٹھے۔ تو اس صورت میں زکوٰۃ کا مقصود بالکل حاصل نہیں ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو مصلحت اس میں رکھی تھی اس کی جانب توجہ بھی نہیں کی، اور برعکس معاملہ کیا کہ بخل کو دور کرنے کی جگہ اس میں ترقی کی۔

یا مثلاً مسلمان اپنی بیوی کو اس غرض سے تکلیف میں رکھتے ہیں کہ وہ تنگ آکر اپنا مہر معاف کر دے اور جب وہ بے چاری مصیبت سے گھبرا کر زبان سے معاف کرنے کا لفظ نکال دیتی ہے تو مطمئن ہو جاتے اور اس کو حلال سمجھتے ہیں بھلا ایسا مال شوہر کو کیونکر حلال ہو سکتا ہے۔ حق تعالیٰ نے فَاِنْ طِبْنَ لَکُمْ الخ میں خود فرمایا ہے کہ ہاں وہ مہر جو عورتیں برضائے نفس معاف کر دیں تمہارے لئے حلال ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ جس مہر کی معافی بُرے برتاؤ اور ایذا رسانی سے ہوئی ہو کیا وہ بخوشی خاطر سمجھی جائے گی۔

---

[1] مالدار

رضائے نفس و رضائے قلب کا لطیف فرق؛

یاد رکھو کہ رضائے قلب دوسری شئ ہے اور رضائے نفس دوسری چیز ہے مثلاً پچھنے لگوانے، تلخ دوا پینے، فصد کھلوانی، پھوڑے پھنسی میں شگاف لگوانا یہ سب تکلیفیں ایسی ہیں کہ ان کو قلب تو پسند کرتا ہے مگر نفس پسند نہیں کرتا۔ اس لئے کہ نفس تو اسی بات کو پسند کرتا ہے جس میں اس وقت لذت حاصل ہو۔ البتہ قلب اس چیز کو پسند کرتا ہے جس میں اس وقت اگرچہ تکلیف ہو مگر آئندہ نفع کی امید ہو۔ کیونکہ نفس کا یہ کام نہیں ہے کہ بعد میں آنے والی راحت کے خیال سے اس وقت تکلیف گوارا کرے۔ پس اگر بیوی نے تکلیف سے تنگ آکر اور خاوند کی ایذاؤں سے گھبرا کر اپنی آئندہ مصلحت اور باقی ماندہ عمر کی آسائش کے خیال سے دوائے تلخ پی لی یعنی دینِ مہر کی معافی گوارا بھی کرلی تو اس کا نام رضائے قلب ہوا نہ کہ رضائے نفس، اور دینِ مہر کے حلال ہونے میں اعتبار رضائے نفس کا ہے، جیساکہ اوپر کی آیت سے معلوم ہوا نہ کہ رضائے قلب کا۔ پس اگر اس رضا کے حیلے سے حکومت وسلطنت دنیوی میں کوئی شخص تقاضا کرنے والا نہیں رہا تو کیا خدا کے سامنے بھی اس کی بدولت سرخرو ہو جاؤ گے، بتلاؤ؟ احکم الحاکمین[1] کو کیا جواب دو گے جب کہ رضائے قلب اور رضائے نفس سے بحث پیش ہو اور پوچھا جائے کہ ہماری اجازت کے خلاف حیلہ جوئی سے ایک بیکس اور ضعیفہ کا حق کیوں ہضم کیا؟

---

[1] سب حاکموں سے بڑا حاکم ۱۲

مجمع میں سوال کرنے کی قباحت اور ظاہری دینداری سے دنیا کمانے کی برائی

اسی طرح کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ، کیونکہ بھیک مانگنا بُری بات ہے، اور اگر سخت ضرورت کے وقت سوال کرنے کی نوبت آئے تو اس کا ضرور خیال رکھو کہ مجمع میں سوال نہ کرو۔ کیونکہ اکثر ایسی حالت میں دینے والا جو کچھ بھی تم کو دے گا وہ اپنے مجمع میں ذلت اور رسوائی اور ہم چشموں میں سبکی کے خیال سے دے گا اور اس کو بخوشی خاطر دینا نہیں کہتے۔ پس ایسا دیا ہوا مال استعمال کے قابل نہیں ہے۔ کیونکہ کسی کے بدن پر مار کر لینا یا کسی کے دل پر شرم اور دباؤ کا کوڑا مار کر لینا دونوں برابر ہیں۔

نیز اپنے دین کو ذریعہ کسب نہ بناؤ۔ مثلاً صلحا رفقرار کی سی صورت اس نیت سے نہ بناؤ کہ ہمیں بزرگ سمجھ کر لوگ دیں گے، حالانکہ تم بالکل کورے ہو اور تمہارا دل گندگی سے آلودہ ہے۔ یاد رکھو کہ دوسرے کا دیا ہوا مال تمہیں اس وقت حلال ہے جب کہ تمہاری چھپی ہوئی حالت ایسی نہ ہو کہ اگر دینے والا اس سے آگاہ ہو جائے تو ہرگز نہ دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر تم نے صورت بزرگوں کی سی بنائی اور تمہارے دل میں خواہشات نفسانی کا ہجوم ہے، اور ظاہر ہے کہ دینے والے نے جو کچھ تم کو دیا ہے وہ صرف تمہاری صورت دیکھ کر دیا ہے کہ اس کو تمہاری باطنی گندگی کی بالکل خبر نہیں ہے، تو اگرچہ علمائے شریعت جو ظاہری انتظام کے متکفل[1] ہیں، اس مال کو حلال بتلائیں گے۔ مگر صاحبِ بصیرت[2] ضرور حرام کہے گا اور اس کو استعمال میں لانے کی ہرگز اجازت نہ دے گا۔

---

[1] ذمہ دار ۱۲ [2] دانائی ۱۲

قلب سے فتویٰ لینے کی ضرورت

دوسری[1] بات جس کا خیال رکھنا ضروری ہے یہ ہے کہ علماء کے فتوے پر اکتفا نہ کیا کرو، بلکہ اپنے دل سے پوچھا کرو کہ اس معاملہ میں دل کیا کہتا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "تم اپنے دلوں سے بھی فتوے لیا کرو اگرچہ مفتی فتوے دے چکیں" بات یہ ہے کہ گناہ مسلمان کے دل میں ضرور چبھا کرتا ہے، کیونکہ جو چیز ضرر پہنچانے والی ہوگی وہ دل میں کھٹکے بغیر نہ رہے گی۔ پس جو شئی درحقیقت حرام ہوگی یا جو کام فی الواقع گناہ ہوگا اس کو تمہارا دل بے کھٹکے ہرگز قبول نہ کرے گا اور ہر چیز کی اصلیت اس طرح پر دل کے فتوی سے معلوم ہو جایا کرے گی۔

نفس کو تشدد سے بچانا چاہئے

نفس پر زیادہ تشدد بھی نہ کرو مثلاً کہنے لگو کہ ایسا مال کہاں ہے جو مشتبہ بھی نہ ہو اور کسی ظالم یا فاسق کے ہاتھ میں نہ ہو کر آیا ہو؟ اور جب ایسا مال نہیں مل سکتا تو یا تو انسان جوگی بن کر گھاس پات کھانے پر قناعت کرے اور ایسا نہ کر سکے تو بیباک ہو کر جو چاہے کھائے پئے۔ ایسا خیال کرنا گمراہی ہے۔ بات یہ کہ حلال[2] بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے اور ان کے بین بین کی چیزیں مشتبہ کہلاتی ہیں، مگر تم کو صرف اتنی تکلیف دی گئی ہے کہ جو مال شرعاً حلال ہے اور اس کے حرام اور نجس ہونے کا کوئی ظاہری سبب تم کو معلوم نہیں ہے اس کو حلال سمجھ کر کھاؤ پیو۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک[3] مرتبہ مشرک آدمی کے مشکیزہ سے اور حضرت عمر فاروق[4] نے عیسائی عورت کے گھڑے سے وضو کیا اور پیاس ہوتی تو پی بھی

---

[1] مضمون حدیث بخاری و مسلم ۔ [2] بخاری ۔ [3] بخاری ۔ [4] عبدالرزاق حجت بر

لیتے ۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ خواہ مخواہ وہم کرنا کہ خدا جانے یہ پانی پاک ہے یا ناپاک، جائز نہیں ہے۔

عارض کی تحقیق نہ ہونے پر اصل پر عمل کرنا چاہئے

جب پانی کے ناپاک ہونے کی بظاہر کوئی وجہ تم کو معلوم نہیں ہو تو اس کو پاک ہی سمجھنا چاہئے ۔ اسی طرح جو حلال شئی کسی ایسے آدمی کے ہاتھ میں پاؤ جس کا حال تم کو معلوم نہ ہو تو اس کو پاک سمجھو اور مسلمانوں کے ساتھ حسنِ ظن[1] رکھو اور یہ سمجھ کر کہ مسلمانوں کے پاس جو کچھ مال ہے حلال اور پاک ہی کمائی کا ہوگا اس کی دعوت بھی قبول کر لیا کرو۔ خصوصاً جبکہ مسلمان صالح اور دیندار ہو ۔ ہاں البتہ ظالم بادشاہ یا سود خوار یا شراب پینے والے شخص کا مال جب تک یہ نہ پوچھ لو کہ کس حلال طریقہ سے کمایا ہے حلال نہ سمجھو ۔ پس اگر تحقیق کے بعد معلوم ہو جاوے کہ سود یا ظلم کی کمائی اور شراب کی قیمت نہیں ہے تو اس کا لے لینا بھی حرام نہیں ہے اور اگر کسی کے پاس غالب حصہ حلال آمدنی کا ہے اور کم حصہ حرام کا تو اس کا کھانا بھی حلال ہے۔ البتہ اگر نہ کھاؤ تو تقویٰ ہے۔ حضرت شیخ ابن المبارکؒ کے کارندہ متعینہ بصرہ نے بذریعہ خط کے ان سے دریافت کیا تھا کہ جو شخص ظالم بادشاہ سے دادوستد رکھتا ہو مجھے اس سے لین دین[2] کا معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو شیخ نے لکھا کہ اگر اس شخص کا اس کے علاوہ اور بھی کوئی ذریعہ کسب ہو تو اس سے معاملہ کرنا جائز ہے ورنہ ناجائز۔

غرض دنیا میں چھ قسم کے آدمی ہیں اور ہر ایک کے ساتھ معاملہ کا جدا حکم ہے جس کو نمبروار بیان کرتے ہیں۔

---

[1] اچھا گمان　　[2] لین دین

مال کی حلت و حرمت کی شناخت

پہلی قسم ۔ وہ آدمی جن کی صورتِ کسب اور دینداری اور بددینی کا حال کچھ بھی معلوم نہیں ہے ۔ ایسے لوگوں کا دیا ہوا مال حلال ہے اور اس سے پرہیز کرنا ضروری نہیں ۔ البتہ احتیاط کے خیال سے نہ کھایا جائے تو تقویٰ میں داخل ہے ۔

دوسری قسم ۔ وہ صلحا جن کی دینداری کھلی ہوئی اور کمائی کا مشروع طریقہ ظاہر ہے ان کے مال میں شبہ کرنا وسوسۂ شیطانی ہے ، بلکہ اگر ان کو اس کے پرہیز کرنے سے رنج ہو تو ایسا تقویٰ بھی حرام اور معصیت ہے ۔

تیسری قسم ۔ وہ لوگ جن کا سارا مال یا نصف سے زیادہ مال ظلماً یا سود یا شراب کی بیع و شرار سے حاصل ہوا ہے ۔ ان کا دیا ہوا مال یقیناً حرام ہے ۔ اور اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے ۔

چوتھی قسم ۔ وہ لوگ جن کا نصف سے کم مال حرام کے ذریعہ سے کمایا ہوا ہے اور تمہیں معلوم بھی ہے کہ زیادہ مقدار کسب حلال ہی کی ہے ۔ مثلاً دو ذریعہ تو حلال کے ہیں ، ایک یہ کہ وہ کوئی مشروع تجارت کرتا ہے ، اور دوسرا یہ کہ ترکہ میں کچھ جائداد پائے ہوئے ہے جس کی آمدنی اس کو ملتی ہے ۔ اور ایک ذریعہ حرام ہے ، مثلاً کسی ظالم بادشاہ کا نوکر ہے اور تنخواہ لیتا ہے ۔ مگر اس ایک ذریعہ کی نسبت ان دو ذریعوں کی آمدنی زیادہ ہے ، تو چونکہ اس کے پاس زیادہ مالِ حلال ہے اس لئے کثرت کا اعتبار کیا جائے گا اور اس کے دئے ہوئے مال کو حلال ہی سمجھا جائے گا ۔ البتہ اس سے پرہیز کرنا تقویٰ میں شمار ہوگا ۔

پانچویں قسم ۔ وہ لوگ ہیں جن کے کسب کا ذریعہ اگرچہ معلوم نہیں ہو

مگر ظلم و تعدی کی علامتیں ان پر نمایاں ہیں، مثلاً جابر حکام کی سی شکل و لباس اور وضع اختیار کئے ہوئے ہیں، تو چونکہ یہ ظاہری حالت یوں بتارہی ہے کہ ان کا مال بھی ظلماً ہی حاصل ہوا ہوگا، لہذا اس سے احتیاط کرنی چاہئے اور اس کو تفتیش کے بغیر حلال نہ سمجھو۔

چھٹی قسم۔ وہ لوگ ہیں جن پر علامت ظلم تو کوئی نمودار نہیں ہے البتہ فسق[1] و فجور کے آثار نمایاں ہیں، مثلاً ڈاڑھی منڈی ہوئی ہے یا مونچھیں بڑھی ہوئی ہیں یا فحش بک رہا اور گالیاں دے رہا ہے یا اجنبی عورت کی طرف دیکھ رہا ہے یا اس سے باتیں کر رہا ہے تو اگرچہ یہ فعل سب حرام ہیں مگر مال کے حاصل کرنے میں چونکہ ان کو کچھ دخل نہیں ہے، لہذا مال کو حرام نہیں سمجھا جائے گا۔ پس اگر تم کو معلوم ہو کہ یہ مال اس نے ترکہ پدری میں پایا ہے یا کسی حلال ذریعہ سے کمایا ہے تو اس کو حلال سمجھو۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرک کے پانی کو نجس نہیں سمجھا، پس جب مجوسیت[2] اور نصرانیت[3] کے سبب پانی مشتبہ یا ناپاک نہیں ہوا تو مسلمان کا مال محض اس کے فسق و فجور کی وجہ سے کیسے ناپاک ہو سکتا ہے۔ البتہ اگر اس کے مال کا حلال ذریعۂ کسب بھی تم کو معلوم نہ ہو تو ایسی صورت میں اس مال کے استعمال میں تامل اور احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔

اس تشریح کے بعد پھر ہم یہی کہتے ہیں کہ اپنے دل سے بھی فتویٰ لے لو اور جس مال سے دل کھٹکے اس کا ہرگز استعمال نہ کرو۔ البتہ یہ ضرور دیکھ لو کہ دل کے فتویٰ پر عمل کرنے اور تقویٰ اختیار کرنے سے اس شخص کو رنج تو نہ ہوگا،

---

[1] گنہگاری ڈھکی چھپی فسق اور کھلم کھلا فجور ۱۲

[2] آتش پرستی ۱۲ [3] عیسائیت ۱۲

جس تفتیش سے مسلمانوں کو ایذار پہنچے وہ حرام ہے

پس اگر رنج کا اندیشہ ہو تو ایسا تقویٰ کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ مثلاً کسی نامعلوم الحال مسلمان نے کوئی چیز ہدیۃً تمہیں دی یا تمہاری دعوت کی اور تم نے تقویٰ کی بنا پر اس کے مال کی تفتیش شروع کردی تو ظاہر ہے کہ یا تو خود اسی سے پوچھو گے یا اس سے خفیہ دوسرے لوگوں سے تحقیق کروگے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر اس سے پوچھا تو اس کو ضرور رنج ہوگا یا اگر دوسروں سے پوچھا اور اس کو خبر ہوگئی، تو مسلمان کو رنج پہنچانے کے علاوہ مسلمان کے ساتھ بدگمانی رکھنے اور بعض وغیرہ غیبت اور تہمت میں مبتلا ہونے کا بھی اندیشہ ہے، اور یہ سب حرام ہیں، اور تقویٰ کا چھوڑنا حرام نہیں ہے۔ پس ایسے موقع پر اس مسلمان کا دل خوش کرنا واجب ہے۔

دیکھو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی باندی بریرہؓ کا وہ کھانا جو کسی مسلمان نے ان کو صدقہ دیا تھا بے تأمل کھالیا اور صدقہ دینے والے کے مال اور حال کا تجسس نہ فرمایا۔ البتہ جب آپ مدینہ میں تشریف لائے تو شروع شروع جو چیز آپ کی نذر کی گئی تو آپ نے یہ ضرور پوچھ لیا کہ صدقہ ہے یا ہدیہ؟ اور یہ بھی صرف اس وجہ سے کہ صدقہ کا مال آپ کے لئے حلال نہ تھا، اور اس سوال میں اس کو رنج یا ایذا بھی نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ صدقہ اور ہدیہ دونوں کی ایک ہی صورت ہے، صرف دینے والے کی نیت اور محل و مصرف کا فرق ہوتا ہے، اس سے زیادہ تفتیش نہیں فرمائی کہ کس طرح اور کہاں سے حاصل کیا؟ آپ کی عادت تھی کہ جو مسلمان

لہ بخاری و مسلم ۱۲

آپ کی ضیافت[1] کرتا آپ بلا تامل قبول فرما لیتے ۔ اور کہیں منقول نہیں ہے کہ آپ نے اس کا سوال کیا ہو کہ تمہارا مال کس ذریعہ سے حاصل ہوا ہے ، البتہ شاذو نادر کسی غالب شبہ کے موقع پر تحقیق حال فرمالی ہے۔

بازار کی چیزوں میں اصل حلت ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہؓ سفر میں بازار سے تمام ضروریات کی چیزیں کھاتے اور خریدتے تھے ، حالانکہ یہ بھی جانتے تھے کہ سود اور لوٹ اور مالِ غنیمت میں خیانت کئے ہوئے مال بھی بازاروں ہی میں فروخت ہوتے ہیں ، مگر ان توہمات کی طرف کبھی توجہ نہیں فرمائی ، بلکہ غالب اور کثرت کی بنا پر بازار میں فروخت ہونے والے سارے مال کو تفتیش و تحقیق کے بغیر حلال سمجھا ۔ اسی طرح تم بھی بازار کی چیزوں کو حرام نہ سمجھو ۔ البتہ اگر ناجائز اور حرام طریقہ سے حاصل کی ہوئی چیزیں کسی شہر یا بازار میں بکثرت فروخت ہونے لگیں تو اس وقت تفتیش و تحقیق حال کے بغیر خریدنا اور استعمال میں لانا بے شک جائز نہیں ہے ۔

---

[1] دعوت ۱۲

آٹھویں اصل

مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت
اور
اُن کے ساتھ نیک برتاؤ

تمام مخلوق کے ساتھ حسنِ معاشرت

تمام مخلوق عمر کی کشتی پر سوار ہوکر دنیا کا سفر ختم کر رہی ہے۔ اور دنیا ایک مسافرخانہ ہے۔ اس لئے آخرت کے مسافروں یعنی مسلمانوں کا اپنی سرائے کے ہم جنس مسافروں کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا بھی دین کا ایک رکن ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ انسان کی تین حالتیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ یا تو مجرد اور تن تنہا ہوگا اور یا اہل وعیال اور دوست واحباب وغیرہ سے تعلقات رکھتا ہوگا اور یا بین بین حالت ہوگی کہ تعلق تو ہوگا مگر صرف اقربا اور رشتہ داروں یا پڑوسیوں سے ہوگا، عام مخلوق سے نہ ہوگا۔ پس تینوں حالتوں کے حقوق اور حسنِ سلوک سے تم کو واقف ہونا چاہئے، جن کو ہم جُداجُدا بیان کرتے ہیں۔

له بیچ بیچ ۱۲

تجرد کی حالت

پہلی حالت میں چونکہ آدمی کو صرف اپنی ذات سے تعلق ہے اس لئے اپنے نفس کی اصلاح اور اس غدائی لشکر کے حقوق ادا کرنے ضروری ہیں جو اس عالم اصغر[1] یعنی انسان میں حق تعالیٰ نے پیدا کئے ہیں ، اور چونکہ اس جگہ ہمیں اختصار مقصود ہے اس لئے جسم انسان میں غدائی لشکر کے صرف سرداروں کا تذکرہ کرتے ہیں اور متنبہ[2] کئے دیتے ہیں کہ ہر مجرد و تنہا مسلمان کو ان کی حفاظت اور نگہداشت ضروری ہے۔

بحالت تجرد اپنی ذات کے متعلق حقوق

جان لو کہ تمہارے اندر ایک خواہش پیدا کی گئی ہے جس کی وجہ سے تم ہر مفید اور پسندیدہ مرغوب شئے کو حاصل کرنے کی سعی کرتے ہو۔ اور ایک غصہ پیدا کیا گیا ہے جس کے ذریعہ سے تم ہر مضر اور مکروہ[3] چیز کو دفع کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ اور تیسری چیز عقل پیدا کی گئی ہے اس سے تم اپنے معاملات کا انجام سوچتے اور اپنی رعیت کی حفاظت کرتے ہو۔ پس غصہ کو کتا سمجھو اور خواہش کو گھوڑا اور عقل کو بادشاہ۔ اس کے بعد معلوم کرو کہ یہ تینوں قوتیں تمہاری ماتحت بنائی گئی ہیں۔ کہ ان میں عدل و انصاف کرنا اور اس قدرتی سپاہ سے مدد لیکر ابدی[4] سعادت حاصل کرنا تمہارا فرض ہے ، پس اگر تم کتے کو مہذب اور گھوڑے کو شائستہ کرکے بادشاہ عقل کا مطیع و فرمانبردار بنائے رکھو گے تو عدل کا حق ادا کرو گے اور ضرور مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔

---

[1] چھوٹا سا جہان ۱۲ [2] ہوشیار ۱۲

[3] تکلیف دینے والی اور ناپسند ۱۲ [4] ہمیشہ کی ۱۲

تہذیبِ نفس اور اس پر ظلم یا انصاف کی حقیقت

اگر محکوم کو حاکم کی مسند پر بٹھا دیا اور حاکم بادشاہ کو تابعدار غلام بنا دو گے تو انصاف کھو بیٹھو گے اور ظالم کہلاؤ گے۔ کیونکہ کسی شئے کا بے محل رکھنا ہی تو ظلم کہلاتا ہے۔ لہٰذا جب خواہشِ نفسانی کوئی چیز حاصل کرنا چاہے یا غصہ کسی شئے کو دفع کرنا چاہے تو عقل سے سوچا کرو کہ اس کا انجام کیا ہے؟ اگر انجام اچھا ہو تو عقل کو چاہئے کہ اس کام کے کرنے کی ان کو اجازت دیدے۔ اور اگر انجام بُرا دیکھے تو ہرگز اجازت نہ دے، بلکہ اپنے ماتحت غلاموں سے اس کو پکڑوا دے۔ مثلاً نفس اگر بے جا خواہش کرتا ہے تو غصہ کو اس پر حملہ کرنے کا حکم دے کہ وہ اس بدخواہ نادان خادم کو پابہ زنجیر کردے۔ اور اگر غصہ بھڑکنا اور بے راہ چلنا چاہے تو شہوت کا اس پر حملہ کرائے کہ وہ اس کو ٹھنڈا کردے اور اس کا خیال پورا نہ ہونے دے۔ اور اگر تم نے اپنی عقل سے دریافت ہی نہیں کیا یا دریافت کیا مگر اس کے حکم سماعت[1] و اطاعت نہ کی۔ بلکہ اس کو خادم و تابعدار غلام بنالیا کہ شہوت و غصہ جو کچھ کرنا چاہیں عقل ان کی ہاں میں ہاں ملا کر ان کا منشا پورا کرنے میں حیلے اور تدبیریں سوچے، تو گویا تم نے قدرتی سپاہ میں ادل بدل کردیا اور جن میں عدل و انصاف رکھنے کا حق تعالیٰ نے حکم فرمایا تھا ان میں ظالمانہ کارروائی کی۔ پس قیامت کے دن جب تمام اعراض[2] کو اجسام عطا کئے جائیں گے اور شہوتِ نفسانی کو کتے کی اور غصہ کو گھوڑے

---

[1] سن لینا اور فرماں برداری کرنا۔۱۲

[2] وہ چیزیں جو کسی کے تابع ہو کر موجود ہوتی ہیں خود بخود نہیں، رنگ و روپ، اعمال، غصہ، علم وغیرہ۔

کی صورت مرحمت ہوگی اور عقل شاہانہ لباس پائے گی تو اس وقت یہ راز کھل جائے گا اور تم کہو گے کہ " ہائے افسوس ہم نے کیسا ظلم کیا کہ بادشاہ کو کتے اور گھوڑے کے سامنے سربسجود رکھا ۔ کاش ! شکاری مرد کی طرح اس کتے اور گھوڑے کو بوقت ضرورت کام میں لاتے کہ بے موقع نہ ان کو بھگاتے اور نہ خلاف عقل ان سے کوئی کام لیتے اور نہ عقل کی ماتحتی سے ان کو باہر نکالتے بلکہ ان کو عقل کا ایسا تابعدار بنائے رکھتے کہ جہاں وہ چاہتی وہاں ان سے کام لیتی ورنہ بیکار اپنی جگہ پڑے رہتے گویا ہیں ہی نہیں "

مخلوق کے حقوق کی نگہداشت اور اس کا علاج ؛

دوسری حالت یعنی جب تم کو عام مخلوق سے تعلق ہو تو اس وقت اس کا ضرور لحاظ رکھو کہ مخلوق کو تم سے کسی قسم کی ایذاء[1] نہ پہنچے ۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ " مسلمان وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے اللہ کی مخلوق محفوظ رہے "[2] اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ مخلوق کو نفع پہنچاؤ ، اور اس سے بھی اعلیٰ درجہ صدیقین کا ہے کہ جن سے ایذاء اٹھاؤ ان کے ساتھ سلوک اور احسان کرو ۔ کیونکہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے[3] حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو نصیحت فرمائی تھی کہ " اے علی ! اگر صدیقین کا درجہ حاصل کرنا چاہو تو جو تم سے قطع تعلق کرنا چاہے تم اس سے تعلق رکھو اور جو تم پر ظلم کرے تم اس کے ساتھ سلوک کرو "

مخلوق کے حقوق قائم رکھنے میں بیس[4] باتوں کا لحاظ رکھو جن کی تفصیل یہ ہے :

اوّل :۔ جو کچھ اپنے لئے بہتر سمجھو وہی دوسروں کیلئے بہتر سمجھو کیونکہ حدیث[5]

---

[1] تکلیف ۱۲ [2] بخاری ۱۲
[3] کچھ مضمون مسند احمد ۱۲ [4] مضمون مسلم و مکارم الاخلاق ۱۲

میں ایسے شخص کیلئے ، بشرطیکہ اس کا خاتمہ بالخیر ہو جائے ، جہنم سے محفوظ رہنے کی بشارت آئی ہے۔

دوم ۔ ہر کسی کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ ، کیونکہ حق تعالیٰ مغرور اور متکبر کو پسند نہیں کرتا ۔ پس اگر کوئی دوسرا شخص تمہارے ساتھ تکبر سے پیش آئے تو اس کو برداشت کر جاؤ ، دیکھو حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ " عفو کی خصلت اختیار کرو ۔ بھلائی کی ترغیب دو ، اور جاہلوں سے پہلو تہی کرو ۔

سوم ۔ بڑوں کی تعظیم کرو اور چھوٹوں پر شفقت کی نظر رکھو ، رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں[۱] کہ " جو جوان کسی بوڑھے کی تعظیم کرے گا تو اس جوان کے بڑھاپے کی حالت میں اللہ تعالیٰ اس کی تعظیم کرنے والا شخص پیدا فرمائے گا " اس حدیث میں اشارۃً درازیٔ عمر کی بھی بشارت آگئی ہے کہ اس کو بوڑھا ہونا نصیب ہوگا ۔

چہارم ۔ ہر شخص کے ساتھ خندہ[۲] روئی سے پیش آؤ کیونکہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ایسے شخص کو دوزخ سے بچنے اور اللہ کے محبوب ہونے کی بشارت[۳] دیتے ہیں ۔

پنجم ۔ دو مسلمانوں میں رنجش ہو جائے تو صلح کرا دو ۔ شریعت میں ایسے موقع پر تالیف[۴] قلوب کی وجہ سے بضرورت جھوٹ بولنے تک کی اجازت آئی ہے اور شرعاً اس کا درجہ نفل نماز اور روزہ سے بھی افضل ہے ۔

ششم ۔ جو لوگ ایک کی دوسرے سے چغلی کھاتے ہیں یا اِدھر کی اُدھر لگا کر مسلمانوں میں باہم رنجش پیدا کرتے ہیں ان کی بات ہرگز نہ سنو

---

[۱] ترمذی حسن غریب ۱۲   [۲] ہنس مکھ ہونا ۱۲

[۳] ابن حبان صحیح ، بیہقی ضعیف ۱۲   [۴] الفت کرانا ۱۲

کیونکہ وہ اپنا دین برباد اور جہنم میں جانے کا سامان کر رہے ہیں۔

ہفتم۔ تمہاری کسی سے اگر رنجش ہو تو تین دن سے زیادہ علیحدگی مت رکھو، کیونکہ اگر تم مسلمان کی خاطر سے درگذر کرو گے تو اللہ تعالےٰ قیامت کے دن تمہاری خطاؤں سے درگذر فرمائیں گے[1]۔

ہشتم۔ سلوک اور احسان کرتے وقت اہل اور نااہل مت دیکھا کرو، کیونکہ اگر کوئی نااہل بھی ہو تو تم اس کے ساتھ کیوں نااہل بنتے ہو، سلوک کے لئے تو تمہارا اہل ہونا کافی ہے۔

نہم۔ لوگوں سے ان کی حالت کے موافق برتاؤ کیا کرو۔ یعنی جاہل میں اس کمال اور تقویٰ کو مت ڈھونڈو جو علماء میں ہوا کرتا ہے، اور عوام کی طبیعتوں میں خواص کی سی سمجھ اور سلیقہ کی توقع مت رکھو۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ الٰہی وہ طریق بتلا دے جس سے مخلوق بھی مجھ سے محبت کرے اور آپ بھی راضی رہیں، تو حکم ہوا کہ اے داؤد دنیا داروں سے ان کی حالت کے موافق برتاؤ کرو اور دینداروں سے ان کے حال کے مطابق۔

دہم۔ برتاؤ کے وقت لوگوں کے مرتبوں کا بھی لحاظ رکھو۔ یعنی اگر کوئی دنیا دار باعزت آدمی تمہارے پاس آجائے تو اس کی عظمت کرو۔ دیکھو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض[2] دنیا دار ذی عزت شخص کیلئے چادر مبارک بچھا دی اور یوں فرمایا ہے کہ جب کسی قوم کا بڑا شخص تمہارے پاس آیا کرے تو اس کی عزت کیا کرو۔

---

[1] مضمون بخاری و مسلم ۱۲ [2] بخاری، ابو داؤد ونسائی وغیرہ ۱۲ [3] ابن حبان صحیح ۱۲ [4] بزار، ابن خزیمہ، طبرانی، ابن عدی، حاکم۔ صحیح ہے۔ اور یہ جریر بن عبداللہ تھے ۱۲

یازدھم ۔ مسلمانوں کے عیب ہرگز ظاہر نہ کرو کیونکہ پردہ پوشی کرنے والے جنت[1] میں جائیں گے۔ غیبت بھی نہ کرو اور کسی کے عیب کی ٹوہ میں بھی نہ رہو۔ یاد رکھو کہ اگر آج تم کسی مسلمان کی عیب جوئی کرو گے تو کل[2] کو حق تعالیٰ تمہارا عیب ظاہر فرما کر رسوا کر دے گا اور جس کو وہ رسوا کرے پھر اس کو امان کہاں[3]؟

دوازدھم ۔ تہمت کی جگہ سے بھی بچو، ورنہ لوگ بدگمان ہوں گے، اور تمہاری غیبت کیا کریں گے، اور چونکہ ان کی غیبت میں مبتلا ہونے کا سبب تم بنے ہو کہ نہ تہمت کے موقع پر تم جاتے اور نہ ان کو غیبت کا موقع ملتا لہٰذا گناہ تم پر بھی ہوگا، اس لئے کہ گناہ کا سبب بننا بھی گناہ ہے۔ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ ازواج مطہرات میں سے کسی[4] کے ساتھ دروازۂ مکان پر کھڑے ہوئے کچھ باتیں کر رہے تھے، کسی شخص کا اس جانب گذر ہوا، چونکہ موقع تہمت کا تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً آواز دے کر اس شخص سے فرمایا، اے شخص! جس عورت سے میں باتیں کر رہا ہوں یہ میری بیوی صفیہ(رض) ہے۔ اس شخص نے عرض کیا، یا رسول اللہ! توبہ ہے، کہیں آپ کی جانب بھی بدگمانی ہو سکتی ہے؟ حضرت نے فرمایا تعجب ہی کیا ہے، شیطان تو بنی آدم کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہے، یعنی شاید تمہارے دل میں یہ وسوسہ پیدا کرتا، اور وہ تمہاری بربادی کا سبب بنتا اس لئے مجھے اطلاع دینی ضروری ہوئی۔

سیزدھم ۔ مسلمانوں کی حاجت روائی میں کوشش کیا کرو۔ حدیث

---

[1] طبرانی اوسط و صغیر ۱۲ — [2] ابو داؤد، عمر بن سعد ۱۲

[3] مضمون حدیث تاریخ بخاری ۱۲ — [4] وہ حضرت صفیہ(رض) تھیں ۱۲

میں آیا ہے کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اکثر کسی کو کچھ دینے دلانے میں تاخیر کرتے اور یوں ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میں صرف اس وجہ سے جلدی حکم نہیں دیتا کہ تم کو سفارش کرنے کا موقع مل جائے اور تم زبان سے کلمۃ الخیر نکال کر ثواب حاصل کر لو۔ مسلمانوں کی حاجت روائی میں سعی کرنا بہرحال نافع ہے۔ خواہ تمہاری کوشش سے اس کی حاجت پوری ہو یا نہ ہو۔ حدیث میں اس سعی کا اجر و ثواب سال بھر کے اعتکاف سے زیادہ آیا ہے۔

چہاردہم۔ ہر مسلمان سے سلام علیک اور مصافحہ میں پیش قدمی کیا کرو۔ حدیث میں آیا ہے کہ جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو رحمت خداوندی کے ستر حصوں میں سے انہتر حصے تو اس کو ملتے ہیں جس نے مصافحہ میں ابتدا کی ہے اور ایک حصہ دوسرے کو۔

پانزدہم۔ مسلمان بھائی کی عدم موجودگی میں بھی اس کی مدد کرو یعنی اس کی آبرو یا مال پر اگر دھبہ یا نقصان آئے تو اس کو مٹاؤ، کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ جہاں کسی مسلمان کی آبرو ریزی ہو رہی ہو تو جو مسلمان ایسے وقت میں اس کی مدد کرے گا تو حق تعالیٰ اس کی ضرورت کے وقت اس کی مدد فرمائے گا اور جو مسلمان اس کی پروا نہ کرے گا تو حق تعالیٰ بھی اس کی اعانت کے وقت اس کی کچھ پروا نہ فرمائے گا۔

شانزدہم۔ شریر لوگوں سے بھی اس نیت سے مدارات کر لیا کرو کہ اس طرح پر ان کے شر سے محفوظ رہو گے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ابوداؤد، مسند صالح ۱۲ [2] حاکم، مگر بجائے سال کے دو ماہ ۱۲ [3] حکیم ترمذی و ابوالشیخ، حسن لغیرہ ۱۲ [4] احمد و ابوداؤد، حسن ۱۲ [5] بخاری ۱۲

کے پاس حاضر ہونے کی اجازت چاہی، آپ نے فرمایا "اچھا آنے دو بُرا شخص ہے" اور جب وہ اندر آگیا تو آپ نے ایسی نرمی وملاطفت کے ساتھ اس سے باتیں کیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس کی وجہ پوچھی تب آپ نے فرمایا کہ "بدتر شخص قیامت کے دن وہ ہے جس کی بدی سے بچنے کے لئے لوگ اس کو چھوڑ دیں" نیز حدیث[1] میں آیا ہے کہ جس طریقہ سے بھی آدمی اپنی آبرو بچائے وہ صدقہ میں شمار ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت[2] ہے کہ لوگوں سے ان کے اعمال کے موافق میل جول رکھو۔ البتہ بدکاروں کو دل میں جگہ نہ دو۔

ہفتدھم۔ زیادہ تر مسکینوں کے پاس اٹھو بیٹھو، اور امراء کی صحبت سے پرہیز کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا[3] فرمائی ہے کہ "بارِ الٰہا میری موت وحیات مسکنت ہی کی حالت میں رکھیو اور مسکینوں ہی کی جماعت میں میرا حشر فرمائیو" حضرت سلیمان علیہ السلام باوجود اس جاہ واقتدار کے جب کبھی مسجد میں کسی مسکین کو بیٹھا دیکھتے تو اس کے پاس بیٹھ جاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ "مسکین اپنے ہم جنس مسکین کے پاس بیٹھ گیا" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ یا اللہ میں آپ کو کہاں ڈھونڈوں؟ تو حکم ہوا کہ شکستہ دل لوگوں کے پاس۔

ہشتدھم۔ حتی الامکان انھیں کے پاس بیٹھو جن کو کچھ دینی فائدہ پہنچا سکو یا جن سے دین کا کچھ نفع حاصل کرسکو، اور غفلت والوں سے

---

[1] دارقطنی وحاکم۔ حسن وصحیح ۱۲ [2] ابن عساکر ۱۲

[3] ابن ماجہ وحاکم۔ صحیح ۱۲

علیحدہ رہو۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "بُرے ہمنشین سے تنہائی بہتر ہے اور تنہائی سے نیک بخت ہمنشیں بہتر ہے"۔ یہ خیال کرو کہ اگر تم ایسے شخص کے پاس آتے جاتے رہو جو ہر دفعہ تمہارے کپڑے کا ایک تار یا ڈاڑھی کا ایک بال نوچ لیا کرے تو ضرور تم کو اندیشہ ہوگا کہ اس طرح پر تو عنقریب کپڑا ختم اور ڈاڑھی ندارد ہو جائے گی، اور تم اس کے پاس آمد و رفت ترک کر دو گے۔ پس اسی طرح جس کی صحبت میں حبہ برابر بھی دین کی کمی ہو تو اس سے پرہیز کرو ورنہ تھوڑا تھوڑا ہو کر ایک دن سارا دین برباد ہو جائے گا۔

نوزدہم۔ مسلمان بھائی اگر بیمار ہو تو اس کی عیادت کیا کرو، اور انتقال کر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ اور اس کے بعد بھی کبھی کبھی گورستان میں ان کی قبر پر ہو آیا کرو اور ان کے لئے ایصال ثواب اور استغفار و طلب رحمت کرتے رہا کرو۔

بستم۔ اگر ان کو چھینک آئے تو یَرْحَمُکَ اللہ کہو اور اگر وہ تم سے کسی بات میں مشورہ کریں تو نیک صلاح دیا کرو۔

المختصر جو اہتمام اپنے نفس کو نفع پہنچانے اور ضرر سے بچانے کا کر سکتے ہو تو وہی عام مسلمانوں کیلئے ملحوظ رکھو۔

متعلقین اور اقارب کے حقوق

خاص متعلقین سے برتاؤ میں نسبی اور صہری رشتہ دار یعنی بیوی، بچے، ماں، باپ اور ہمسایہ و غلام و نوکر و چاکر سب متعلقین میں داخل ہیں۔

۱؎ بیہقی۔ حسن ۱۲ ۲؎ خدا تم پر رحم کرے۔ یہ سب مضمون صحیح حدیثوں کے ہیں۔

۳؎ جو نکاح سے ہوں ۱۲

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "قیامت کے دن سب سے پہلے جن کا مقدمہ پیش ہوگا وہ ہمسایہ ہوں گے" لہٰذا پڑوس کے حقوق کا زیادہ خیال رکھنا چاہیئے، کیونکہ ہمسایہ کے پلے ہوئے کتے کے اگر ڈھیلا بھی مارو گے تو ہمسایہ کے ایذا رساں سمجھے جاؤ گے۔ ایک عورت نہایت پارسا تھی مگر اس کے پڑوسی اس سے نالاں رہتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دوزخی فرمایا ہے[1]۔

پڑوس کے حقوق

ایک مرتبہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا جانتے بھی ہو ہمسایہ کے کتنے حق ہیں؟ اگر ہمسایہ مدد چاہے تو مدد کرو، اور اگر قرض مانگے تو قرض دو، اگر تنگدست ہو جائے تو سلوک کرو، اگر بیمار پڑے تو عیادت کرو، اور انتقال کر جائے تو جنازہ کے ساتھ جاؤ، اگر اس کو کوئی خوشی حاصل ہو تو مبارکباد دو، اور رنج پہنچے تو تسلی دو، اس کی اجازت کے بغیر اپنا مکان اتنا اونچا نہ بناؤ کہ اس کو خاطر خواہ ہوا نہ پہنچ سکے، اگر کوئی پھل خرید کر لاؤ تو اس میں سے بقدر مناسب اس کو بھی دو اور اگر نہ دے سکو تو چپکے سے گھر میں لے جاؤ تاکہ دیکھ کر اس کو حرص نہ ہو اس کے بعد مناسب ہے کہ تمہارا بچہ بھی پھل لیکر باہر نہ نکلے کیونکہ ہمسایہ کے بچے کو حرص ہوگی تو اس کو رنج ہوگا، اسی طرح اگر ہانڈی چڑھے تو ایک چمچہ پڑوسی کو بھی پہنچاؤ جانتے ہو کہ پڑوسی کا حق کس قدر ہے؟ بس یہ سمجھ لو کہ پڑوسی کے حق وہی پورے کر سکتا ہے جس پر حق تعالیٰ کا فضل ہو۔

---

[1] طبرانی۔ صحیح ۱۲ [2] ابن ابی شیبہ ۱۲

[3] مکارم الاخلاق خرائطی وابو الشیخ ۱۲

قرابت کے حقوق

قرابت داری کے حقوق کا بھی لحاظ رکھو، کیونکہ رحم[1] کے معنی قرابت کے ہیں، رحمٰن سے مطابقت رکھتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا[2] ہے کہ جو شخص رحم سے میل رکھے گا میں اس سے میل رکھوں گا اور جو اس سے قطع تعلق کرے گا میں اس سے قطع تعلق کر دوں گا۔ صلۂ رحمی[3] کرنے والے کی عمر میں برکت ہوتی ہے۔ جنت کی خوشبو جو پانچ سو برس کی مسافت سے آتی ہے وہ قاطع[4] رحم کو ہرگز نہ آئے گی۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے[5] ہیں کہ ماں باپ کی خدمت کرنا نماز، روزہ، حج وعمرہ اور جہاد فی سبیل اللہ سے بھی افضل ہے۔ اور ماں کا حق باپ کی بہ نسبت دوچند[6] ہے۔ حدیث[7] میں حکم ہے کہ جو کچھ دینا ہو ساری اولاد کو مساوی دیا کرو۔

خادم کے حقوق

غلاموں کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد[8] ہے کہ ان کے متعلق خدا سے ڈرو اور جو کچھ خود[9] کھاؤ ان کو بھی کھلاؤ اور جو تم پہنو وہی ان کو بھی پہناؤ تحمل سے زیادہ ان سے کام نہ لو اور یہ سمجھو[10] کہ صاحب قدرت خدا نے ان کو تمہارا غلام بنا دیا ہے اگر وہ چاہتا تو تم کو ان کا غلام[11] بنا دیتا، جب کھانا لاکر تمہارے سامنے رکھے تو چونکہ آگ کی تپش اور دھوئیں کی کلونس اسی نے برداشت کی اور تم کو ان تکلیفوں سے بچایا ہے اس لئے اس کی دلدہی کرو اور اس کو شفقت کے ساتھ اپنے پاس بٹھا کر ساتھ کھلالو، یا کم از کم ایک لقمہ اس کے ہاتھ پر رکھ دو اور

---

[1] حدیث قدسی ابو داؤد و ترمذی۔ حسن ۱۲ [3] رشتہ داری باقی رکھنا۔ مضمون بخاری و مسلم ۱۲

[4] رشتہ داری قطع کرنیوالا، حدیث طبرانی [5] مضمون ابویعلیٰ و طبرانی صغیر ۱۲ [6] ابن منیع ۱۲ [7] طحاوی صحیح یعنی زندگی میں اور مرنے کے بعد بقاعدۂ وراثت ۱۲ [8] ابو داؤد ۱۲ [9] مسلم ۱۲

[10] بخاری ۱۲ [11] ابن عساکر، آخر تک ۱۲

پیار کے لہجے میں کہو کہ کھالو۔ ایسا کرنے میں اس کا دل خوش ہو جائے گا اور تمہاری عزت میں فرق نہ آئے گا۔ اگر وہ کوئی خطا کر بیٹھے تو درگذر کرو اور اس کو غرور اور حقارت کی نظر سے مت دیکھو۔[1]

بی بی کے حقوق

بی بی کے حقوق چونکہ غلام سے کئی حصے زیادہ ہیں لہٰذا بی بی کی تمام ضرورتوں کو پورا کرو اور حسنِ معاشرت و خوش کلامی سے برتاؤ کرو، کیونکہ بیبیوں کے ساتھ نیک برتاؤ رکھنے والوں کے بڑے درجے ہیں۔ دیکھو مقتدائے اُمّت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کے ساتھ کیسی خوش طبعی اور دلجوئی اور محبت و نرمی کا برتاؤ فرماتے تھے۔ حدیثوں میں حسن معاشرت کی بڑی تاکید آئی ہے۔[2]

فصل

دینی دوست بنانے کی فضیلت اور حُبّ فی اللہ کے درجے

انہیں اصول میں سے ایک اصل یہ بھی ہے کہ اپنے لئے کچھ دینی دوست تجویز کرلو جن سے محض اللہ ہی کے واسطے محبت ہو۔ قیامت کے دن حق تعالیٰ آواز دے گا کہ "کہاں ہیں وہ جو خاص میرے واسطے محبت باہم رکھتے تھے آج جب کہ میرے سایہ کے سوا کہیں سایہ نہیں ہے میں ان کو اپنے سایہ میں لے لوں گا"۔ حدیث میں آیا ہے کہ عرش کے گرد نور کے منبر ہیں جن پر ایک جماعت بیٹھے گی جن کے لباس اور چہرے سرتاپا نور ہوں گے اور وہ لوگ نہ نبی ہیں نہ شہید مگر انبیاء و شہدا

---

[1] ابوداؤد و ترمذی ۱۲ [2] مسلم شریف ۱۲

[3] سنن کبریٰ نسائی مضمون ابن حبان ۱۲

ان کی حالت پر رشک[1] کریں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہوں گے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اللہ کے مخلص بندے جو باہم اللہ کے واسطے محبت کرتے اور اللہ کے واسطے ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے اٹھتے اور آتے جاتے ہیں۔ یاد رکھو کہ ایمان کے بعد اللہ کے واسطے محبت کا مرتبہ ہے اور اس میں دو درجے ہیں:

پہلا درجہ یہ ہے کہ تم کسی شخص سے اس بنار پر محبت کرتے ہو کہ دنیا میں تم کو اس کے ذریعہ سے ایسی چیز حاصل ہے جو آخرت میں مفید ہے مثلاً شاگرد کو اپنے استاد کے ساتھ علم دین حاصل کرنے کے سبب محبت ہے اور مرید کو اپنے مرشد سے راہ طریقت معلوم کرنے کی وجہ سے محبت ہے، بلکہ استاد کو اپنے شاگرد کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے وہ بھی اس بنار پر ہوتی ہے کہ دین کا سلسلہ اس کی وجہ سے مدتوں تک میری طرف منسوب ہو کر جاری رہے گا اور مجھ کو آخرت میں صدقہ جاریہ کا اجر ملے گا۔ اسی طرح اپنے خادم اور محسن کے ساتھ اسی نیت سے محبت ہوتی ہے کہ ان کی خدمت اور احسان کی وجہ سے فارغ البالی حاصل ہوتی ہے اور اطمینان کے ساتھ عبادت و طاعت کا وقت نصیب ہوتا ہے۔ پس یہ سب اللہ ہی کے واسطے محبت ہے، کیونکہ کوئی دنیاوی غرض اس محبت سے مقصود نہیں ہے، مگر پھر بھی چونکہ خاص اللہ کی ذات مطلوب نہیں ہے، اس لئے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ کسی اللہ کے پیارے اور نیک

---

[1] رشک کبھی بڑے کو چھوٹے پر بھی آتا ہے جیسے حاکم اعلیٰ کے معائنہ تحصیل کے وقت چپراسی کی بیفکری اور اپنی ذمہ داری دیکھکر تحصیلدار کو اس پر رشک ہوتا ہے، اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امت کے فکر میں مشغول ہوں گے اور یہ لوگ ان سے چھوٹے درجہ میں ہونے کی وجہ سے ان فکروں سے آزاد ہوں گے ۱۲

بندے سے بغیر کسی دنیوی غرض کے صرف اس وجہ سے محبت ہو کہ یہ شخص اپنے محبوب یعنی حق تعالیٰ کا محبوب ہے، کیونکہ معشوق کے کوچہ کا کتا بھی دوسرے کتوں سے ممتاز ہوتا ہے، پھر بھلا کیسے ممکن ہے کہ حق تعالیٰ سے محبت ہو اور اس کے محبوب بندوں سے محبت نہ ہو۔ یاد رکھو کہ رفتہ رفتہ یہ تعلق یہاں تک قوی ہو جاتا ہے کہ اللہ کے محبوب بندوں کے ساتھ اپنے نفس کا سا برتاؤ ہونے لگتا ہے بلکہ اپنے نفس پر بھی ان کو ترجیح ہوتی ہے۔ پس جتنا بھی یہ علاقہ مضبوط ہوگا اسی قدر کمال میں ترقی ہوگی۔

بغض فی اللہ

ایسا ہی بغض کا حال ہے کہ حق تعالیٰ کے نافرمان بندوں سے عداوت ہونی چاہئے۔ جن کو یہ درجہ نصیب ہوتا ہے ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اللہ کے نافرمان بندوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور ان سے بات کرنا تک چھوڑ دیتے ہیں اور ان کی صورت نظر آتی ہے تو آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم[۱] نے دعا مانگی ہے کہ "خداوندا کسی فاسق شخص کا مجھ پر احسان نہ کرائیو کہ اس کے احسان کی وجہ سے میرے دل میں اس کی محبت آجائے۔"

حب فی اللہ اور بغض فی اللہ اسی کا نام ہے، اور جس مسلمان کو اپنے مولا سے اتنی بھی محبت نہیں جس کا اثر ہو کہ اللہ کے محبوب بندے اس کے محبوب بن جائیں اور خدا کے دشمنوں کو وہ اپنا دشمن سمجھے تو سمجھنا چاہئے کہ اس شخص کے ایمان میں ضعف ہے اور اس کو اپنے خدا ہی کے ساتھ محبت نہیں ہے۔

---

[۱] دیلمی ۱۲

نویں اصل

امر[1] بالمعروف اور نہی[2] عن المنکر

یعنی

وعظ و نصیحت کا بیان

اللہ پاک فرماتا ہے کہ تم میں کچھ لوگ ایسے بھی ہونے چاہئیں جو نیکی کی جانب بلائیں اور اچھے کام کا حکم کریں برائیوں سے منع کریں یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

واعظوں کی بے پروائی معصیت ہے

حدیث[3] میں آیا ہے کہ جب لوگ معصیت میں مبتلا ہو جائیں اور ان میں ایسے لوگ بھی موجود ہوں جو ان کو معصیت سے روک سکتے ہیں مگر وہ کاہلی کریں اور ان کو معصیت سے منع نہ کریں تو حق تعالیٰ ان پر عذاب جلد نازل فرمائے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "ایک ایسے قصبہ پر عذاب نازل ہو چکا ہے جس میں اٹھارہ ہزار مسلمان آباد تھے، اور ان کے اعمال انبیاء علیہم السلام جیسے[5] تھے، مگر اتنا نقص تھا کہ اللہ

---

[1] نیکی کا حکم ۱۲ [2] برائی سے روکنا [3] ابوداؤد مضمون ترمذی صحیح ۱۲ [4] تابعین عراقی
[5] یعنی قریب قریب، ورنہ انبیاء تک کسی کا عمل نہیں پہنچ سکتا۔ ۱۲

کی نافرمانیاں دیکھ کر ان کو غصہ نہ آتا تھا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑے ہوئے تھے لہٰذا ہلاک کر دئے گئے۔ اگر تم کسی جگہ پر کوئی ناجائز کام ہوتا ہوا دیکھو گے اور خاموش بیٹھے رہو گے تو اس گناہ میں تم بھی شریک سمجھے جاؤ گے کیونکہ غیبت کرنے والا اور سننے والا گناہ کے اندر دونوں برابر ہیں"

گناہگاروں سے میل رکھنا اور معصیت کے درجہ میں بیٹھنا

اسی طرح ریشمی لباس یا سونے کی انگوٹھی پہننے والے جس قدر گناہگار ہیں اسی قدر ان کے وہ یار دوست یعنی ان کے پاس بیٹھنے اٹھنے والے مسلمان بھی گناہگار ہیں جو ان کو ریشمی لباس اور طلائی انگشتری پہنے دیکھتے ہیں اور منع نہیں کرتے۔ اسی طرح ایسے مکانوں میں بیٹھنا جس کی دیواروں پر تصویریں ہوں، یا ایسی مجلس میں شریک ہونا جہاں کوئی بدعت ہو رہی ہو یا کسی مباحثہ یا مناظرہ کے ایسے جلسے میں جانا سب وشتم اور لغو مشغلہ ہو سب گناہ ہے۔ پس خوب سمجھ لو کہ ان گناہوں کے موقعوں پر صرف بچنا ہی ضروری نہیں ہے، بلکہ جب تک بے تامل نصیحت نہ کرو گے اور گناہوں سے ان کو روک نہ دو گے اس وقت تک عہدہ برآ[1] ہرگز نہ ہو سکو گے۔ یہی سبب ہے کہ گوشہ نشینی بہتر سمجھی گئی ہے، اور جتایا گیا ہے کہ کثرت اختلاط[2] سے ضرور معصیت ہوتی ہے، کیونکہ مسلمان کیسا ہی متقی کیوں نہ ہو جب تک ملامت کرنے والوں کی ملامت کا خوف دل سے نہ نکال اور گناہ ہوتا دیکھے تو اس کو روک نہ دے گناہ سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ غرض مداہنت حرام ہے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر واجب ہے۔ دو حالت میں اس کا وجوب قائم نہیں رہتا۔

---

[1] ذمہ داری پوری کرنا ۱۲   [2] بہت میل جول ۱۲

پھر بھی مستحب ہے۔ کیونکہ ایسے امر خیر میں جو کچھ ایذا پہنچے گی اس کے بھی بڑے اجر ہیں ایسی حالت میں سکوت کا جائز ہونا اس شرط پر ہے کہ بدنی تکلیف یعنی مارپیٹ یا مالی نقصان یا سبکیت یا آبروریزی یا ایذا رسانی کا یقین یا غالب گمان ہو، نہ کہ نصیحت کرنے سے ان کو میری محبت نہ رہے گی یا ناگوار گذریگا اور مجھ کو زبان سے کچھ بُرا بھلا کہنے لگیں گے یا مجھ کو اپنا دشمن سمجھنے لگیں گے اور آئندہ کوئی تکلیف پہنچانے کی فکر کریں گے یا جو کچھ دیتے ہیں وہ بند کرلیں گے یا آئندہ کوئی دینی مصلحت و بہبودی کی توقع ہے اور نصیحت کرنے سے وہ مصلحت ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ تو ایسی موہوم باتوں کی شریعت میں کچھ وقعت نہیں ہے اور نہ ان خیالات سے خلاف شرع امر پر نصیحت کئے بغیر چپ ہو رہنا جائز ہے۔ اس کو خوب سمجھ لو۔

فصل

واعظ کے خصائل و اخلاق

اوّل تو واعظ کو حلیم الطبع[1] نرم مزاج ہونا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ اپنی نیک بختی جتانے اور دوسروں پر اعتراض کرنے کی نیت سے وعظ کرنے کا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا بلکہ اس سے لوگوں کو صدمہ ہوتا اور برافروختگی بڑھتی ہے اور بجائے معصیت چھوڑنے کے وہ لوگ معصیت پر ضد اور اصرار کرنے لگتے ہیں۔ اور جب ضد بندھ گئی تو پھر نصیحت کرنا اللہ واسطے نہ رہا۔ بلکہ اپنے دل کی جلن نکالنے اور پھپھولے پھوڑنے کی غرض سے ہوگیا۔ لہٰذا جب وعظ کہو تو نہایت نرمی سے کہو اور نیت رکھو کہ کاش حق تعالیٰ کی یہ معصیت چھوٹ جائے اور کوئی دوسرا ہی واعظ اس کو چھڑا دے تو بہت ہے۔ کیونکہ خود معترض اور ناصح

---

[1] بردبار طبیعت رکھنے والا۔

علماء کا گناہوں پر سکوت کرنا

پہلی حالت ۔ اس کو معلوم ہو کہ میں اس گناہ سے منع کروں گا تو مجھ کو نظر حقارت سے دیکھا جائے گا ، اور نہ میری بات کی یہ لوگ پرواہ کرینگے اور نہ اس گناہ کو چھوڑیں گے ، تو ایسی حالت میں نصیحت کرنا واجب نہ رہے گا ۔ اور یہ حالت اکثر ان معصیتوں کے متعلق پیش آتی ہے جن کے مرتکب فقہاء و علماء یا ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو دیندار اور متقی سمجھتے ہیں کیونکہ اگر کوئی شخص ان کو نصیحت کرے تو ان کو سخت ناگوار گذرتا ہے اور وہ گناہ چھوٹتا نہیں جس کو انہوں نے اختیار کیا ہے ۔ ایسے موقع پر بیشک سکوت جائز ہے ، البتہ زبان سے پھر بھی نصیحت کر دینا مستحب ہے ۔ اس کے ساتھ اس کا بھی خیال رکھو کہ ایسی جگہ نصیحت کرنا واجب نہیں رہا مگر خود وہاں سے اٹھ آنا ضرور واجب ہے ، کیونکہ بیٹھا رہنا اپنا اختیاری فعل ہے اور باختیار خود معصیت کا دیکھنا بھی معصیت ہے ۔ پس جہاں دورِ شراب جاری ہو یا غیبت ہو رہی ہو یا ڈاڑھی منڈے بددین غیر متشرع[1] فاسق فاجر بیٹھے ہوں وہاں ہرگز نہ بیٹھو ۔

سخت ایذا کے قوی اندیشہ پر نصیحت چھوڑنا !!!

دوسری حالت یہ ہے کہ ناجائز فعل سے باز رکھنے پر قدرت تو ہو مگر اس کا غالب اندیشہ ہو کہ اگر دست اندازی کی تو ضرور یہ لوگ مجھ کو ماریں گے مثلاً کسی جگہ شراب کا شیشہ یا ستار وغیرہ یا اور کوئی سامان لہو و لعب رکھا ہوا دیکھو اور ممکن ہے کہ آگے بڑھ کر اس کو توڑ پھوڑ دو ، مگر غالب گمان یہ ہو کہ ایسا کرنے سے ان کا مالک تم کو ایذا دئے بغیر باز نہ رہے گا تو اس صورت میں بھی چپ ہو رہنا جائز ہے ، البتہ ہمت کرنا

---

[1] خلاف شرع ۱۲

بننے کی عزت کا خواستگار ہونا خلوص کے خلاف ہے۔ ایک مرتبہ مامون رشید کو ایک واعظ نے کسی بات کی سختی کے ساتھ نصیحت کی تو مامون رشید نے واعظ سے کہا کہ ذرا نرمی سے نصیحت کیا کرو۔ دیکھو تم سے بہتر ناصح حضرت کلیم اللہ پیغمبر مجھ سے بدتر بندہ فرعون مصر کی جانب ناصح بنا کر بھیجے گئے اور ان کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا۔ وَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا ؁ کہ اے موسیٰ اور اے ہارون! فرعون سے نرمی کے ساتھ باتیں کیجیو۔

حضرت امامہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک نوجوان شخص رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ مجھے زنا کرنے کی اجازت دیجئے۔ اس شخص کا یہ کلمہ سن کر لوگ اس کو ڈانٹنے لگے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چھوڑ دو، اور اس شخص کی جانب متوجہ ہو کر فرمایا کہ "یہاں آؤ" اور جب وہ شخص پاس آیا تو آپ نے کہا کہ "میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں، بھلا اگر تمہاری ماں سے زنا کرے تو کیا تم کو ناگوار نہیں گزرے گا؟" اس نے عرض کیا کیوں نہیں گزرے گا، ضرور گزرے گا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ "پھر تم ہی بتاؤ کہ دوسروں کو اپنی ماؤں کے ساتھ ایسا ہونا کیونکر گوارا ہوگا" اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ "اچھا تمہاری بیٹی کے ساتھ اگر کوئی ایسا فعل کرے تو کیا تم کو پسند ہے؟" اس نے جواب دیا کہ نہیں، آپ نے فرمایا کہ "پھر دوسرے اپنی بیٹیوں کے ساتھ اس کو کیوں پسند کرنے لگے" یہاں تک کہ آپ نے بہن اور پھوپھی اور خالہ سب ہی کا نام لیکر دریافت فرمایا اور یوں ہی جواب دیتے رہے کہ "پھر دوسرے لوگ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ایسی بے حیائی کیوں پسند کرنے لگے۔ آخر

۱؎ حضرت موسیٰ علیہ السلام ۔ ۲؎ احمد و طبرانی۔ صحیح ۔

یہ عورت کہ جس سے زنا کیا جائے کسی کی ماں یا بیٹی یا پھوپھی یا خالہ تو ضرور ہوگی اور جب تمہیں اپنے رشتہ داروں میں سے کسی کے ساتھ بھی زنا کرنا گوارا نہیں ہے تو دوسرے مسلمانوں کو ان کے کسی رشتہ دار سے تمہارا زنا کرنا کیونکر گوارا ہونے لگا ہے" اس کے بعد دست مبارک اس کے سینے پر رکھا اور دعا کی کہ "خداوندا! اس کا قلب پاک کر دیجئے اور گناہ بخش دیجئے اور اس کی شرمگاہ کی حفاظت فرمائیے" اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ سب سے زیادہ ناپسندیدہ گناہ اس کے نزدیک زنا ہی تھا۔

ایک مرتبہ مجمع میں حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ سے حکایت کی گئی کہ حضرت سفیان بن عیینہ نے شاہی تحفہ قبول کر لیا۔ شیخ نے سن کر مجمع میں تو صرف یہ کہہ کر ٹال دیا کہ نہیں جی، سفیان نے اپنا حق لیا ہوگا اور وہ بھی ناتمام۔ مگر خلوت میں سفیان کو پاس بٹھا کر نہایت نرمی سے نصیحت کی اور فرمایا کہ اے ابوعلی! ہم اور تم اگر بزرگ نہیں تو بزرگوں کے محب اور دوست رکھنے والے تو ضرور ہیں۔ مطلب یہ کہ ہم لوگ چونکہ اس زمرہ میں شمار ہوتے ہیں اس لئے تم کو ایسے افعال سے بچنا چاہیئے جن کو لوگ حجت پکڑیں اور بزرگوں کے نام پر عیب لگائیں۔

واعظ کو عالم باعمل ہونا چاہیئے مگر امر بالمعروف اس کے بغیر بھی ضروری ہے

دوم۔ واعظ کو اول اپنی اصلاح کرنی چاہیئے کیونکہ نصیحت کا اثر اسی وقت ہوتا ہے جب کہ ناصح خود بھی باعمل ہو ورنہ لوگ ہنستے اور مذاق اڑایا کرتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور سمجھ لینا چاہیئے کہ نصیحت کرنے کا جواز یا وجوب عامل ہونے پر موقوف نہیں ہے، اگر کوئی عالم خود عامل نہ بھی ہو تب بھی اس کو نصیحت اور وعظ کا

چھوڑ دینا اور گناہوں کو ہوتے ہوئے دیکھکر سکوت اختیار کرنا جائز نہ ہوگا۔ خوب سمجھ لو کہ یہ خیال بھی ایک شیطانی وسوسہ ہے کہ جب تک خود پورے عامل نہ بن جائیں اس وقت تک دوسروں کو کیا نصیحت کریں گے۔ اگر ایسا خیال معتبر سمجھا جاوے تو وعظ اور نصیحت کا سلسلہ مفقود اور دروازہ بالکل مسدود ہو جائے گا۔ یاد رکھو کہ امر بالمعروف واجب اور ضروری ہے، اور عاصی اور گنہگار شخص کو بھی وعظ کہہ دینا جائز ہے، البتہ واعظین پر یہ دوسرا وجوب مستقل ہے کہ اپنے علم پر عمل کریں اور جس کام کی بھی دوسروں کو نصیحت کریں اس پر خود بھی کاربند ہوں۔ پس اگر ایک واجب کو ترک کیا اور خود بھی عامل نہ بنے تو دوسرا واجب ترک کرنا کیوں جائز ہونے لگا کہ دوسروں کو نصیحت بھی نہ کریں۔

دسویں اصل

اتباعِ سُنّت کا بیان

چونکہ اصل سعادت یہی ہے کہ تمام حرکات و سکنات میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا جائے، اس لئے سمجھو کہ حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تمام افعال کی دو قسمیں ہیں:۔

اول : عبادات، مثلاً نماز، روزہ، زکوۃ، حج وغیرہ۔

دوم : عادات، مثلاً کھانا، پینا، سونا، اٹھنا بیٹھنا وغیرہ۔

کامل اتباع رسول یہ ہے کہ عبادات اور عادات دونوں میں ہو

مسلمانوں پر لازم ہے کہ دونوں قسم کے افعال میں آپ کی اقتدا کریں، کیونکہ حق تعالیٰ نے جس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا حکم فرمایا ہے وہاں کوئی قید نہیں لگائی، بلکہ یوں ارشاد فرمایا ہے کہ "پیغمبر جو کچھ بھی تم کو دیں اس کو لے لو، اور جس چیز سے منع کریں اس سے باز آجاؤ" شیخ محمد بن اسلم نے تمام عمر صرف اس خیال سے تربوز نہیں کھایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربوز کھانے کا انداز ان کو معلوم نہیں ہوا تھا۔ ایک بزرگ نے ایک مرتبہ موزہ سہواً اول بائیں پاؤں میں پہن لیا تو اس کے کفارے میں جب تک ایک گون گیہوں خیرات نہ کر لئے اس وقت تک چین سے نہ

بیٹھے۔ معلوم ہوا کہ کامل اتباع اور پوری سعادت مندی یہی ہے کہ عادتوں میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدار کیا جائے، کیونکہ اس میں بے شمار فائدے ہیں اور ذرا سے تساہل میں ایسی نعمت عظمیٰ کا کھو بیٹھنا بے وقوفی ہے۔ اب ہم اس کا سبب اور یہ بات بیان کرتے ہیں کہ اتباع کامل میں کیا فائدے ہیں۔ سنو! اس کی تین وجہ ہیں:۔

اول:۔ تمہیں معلوم ہے کہ قلب کو اعضاء سے خاص تعلق ہے۔ اور اعضائے[1] بدن کے تمام افعال کا اثر دل کے اندر پہنچتا ہے۔ لہٰذا جب تک اعضاء کی حرکات سکنات حد اعتدال پر نہ ہوں گی اس وقت تک قلب کو صلاحیت اور نور کبھی حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ انسان کا قلب آئینہ کی طرح ہے، اور آئینہ آفتاب کی روشنی سے اس وقت روشن ہو سکتا ہے جب کہ اس میں تین باتیں موجود ہوں:

اوّل یہ کہ اس کو صیقل[2] کیا جائے۔

دوم یہ کہ اس کا جرم[3] صاف اور شفاف ہو۔

سوم یہ کہ اس میں کجی[4] بالکل نہ ہو۔

اسی طرح جب قلب کے اندر تینوں اوصاف موجود ہوں گے کہ خواہشات نفسانی کے ترک کر دینے سے اس کی صیقل ہو جائے گی، اور ذکر الٰہی سے اس میں صفائی پیدا ہو گی، اور افعال اعضاء کو اعتدال پر رکھنے سے اس میں کجی نہ آنے پاوے گی، تو اس وقت بے شک اس میں تجلیاتِ باری تعالیٰ کا انعکاس[5] ہوگا۔

---

[1] درمیانی ۱۲ [2] صاف ۱۲ [3] جسم ۱۲

[4] ٹیڑھاپن ۱۲ [5] عکس ۱۲

عاداتِ محمدیہ کے اتباع میں منفعتِ دینیہ کی حکمتیں اور اسرار

اعتدال کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز کو اس کے موقع پر رکھا جائے۔ مثلاً چار سمت میں سے ایک سمت یعنی جانب قبلہ کو اللہ تعالیٰ نے عزت بخشی ہے۔ اس لئے تمام نیک کاموں میں خواہ ذکر الٰہی ہو یا تلاوت قرآن اور وضو ہو یا دعاء، قبلہ کی جانب منہ کیا جائے۔ اور جو افعال گھنیانے کے قابل ہوں مثلاً قضائے حاجت یعنی بول[1] و براز اور جماع[2] میں ستر کھولنا وغیرہ، اس وقت اس جانب سے رُخ پھیر لیا جائے، ایسا کرنا چونکہ سمتِ قبلہ کی عزت کا قائم رکھنا ہے، لہٰذا یہی اعتدال ہے۔ یا مثلاً حق تعالیٰ نے داہنی جانب کو بائیں جانب پر شرف بخشا ہے، اس لئے تم کو بھی اس کے شرف کا ہر وقت خیال رکھنا چاہئے کہ اگر اچھے کام کرے مثلاً کلام مجید اٹھانا یا روٹی کھانا ہو تو داہنا ہاتھ، اور میلے کام مثلاً استنجا کرنا، ناک سنکنا یا بضرورت کسی ناپاک چیز کو ہاتھ لگانا ہو تو بایاں ہاتھ آگے بڑھاؤ، کپڑا پہنو تو اول دائیں طرف، اور جوتا پہنو تو اول داہنے پاؤں میں پہنو مسجد میں جاؤ تو اول داہنا پاؤں رکھو اور جب باہر نکلو تو اول بایاں پاؤں نکالو۔ الغرض ہر شے کے مرتبے کا خیال رکھنا عدل اور انصاف کہلاتا ہے۔ اور اس ظاہری اعتدال سے قلب بھی معتدل اور مستوی ہو جائے گا۔

اگر یہ رمز تمہاری سمجھ میں نہیں آیا ہے تو تجربہ کر کے دیکھو، اور اس کا تو تم نے بھی تجربہ کیا ہوگا کہ جو لوگ سچ بولنے کے خوگر ہوتے ہیں ان کے خواب بھی اکثر سچے ہوتے ہیں، اور جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں ان کی خوابیں بھی زیادہ جھوٹی ہوتی ہیں۔ کیونکہ راست گوئی سے قلب میں اعتدال اور درستی و

---

[1] پیشاب پاخانہ ۱۲ [2] ہمبستری ۱۲

استقامت آجاتی ہے، اور دروغ گوئی سے اس میں کجی پیدا ہو جاتی ہے۔ دیکھو چونکہ شاعر اکثر جھوٹے اور لغو تخیلات کے عادی ہو جاتے ہیں اس لئے ان کے قلب میں کجی پیدا ہو جاتی ہے۔ لہذا جہاں تک ہو سکے قلب میں جھوٹے خیالات کو جگہ نہ دو ورنہ دل کا اعتدال ہاتھ سے جاتا رہے گا۔

دوسرا رمز یہ ہے کہ دوائیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ بعض وہ کہ جن کے اثر و تاثیر میں مناسبت ہے، مثلاً شہد چونکہ گرم ہے اس لئے گرم مزاج والوں کو نقصان دیتا ہے اور سرد مزاج والوں کو نفع پہنچاتا ہے۔ ایسی دوائیں تو بہت کم ہیں کیونکہ اکثر دوائیں دوسری قسم میں داخل ہیں یعنی وہ دوائیں کہ جن کی تاثیر کسی مناسبت سے معلوم نہیں ہوتی، اس کا نام خاصیت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ہر شئے کی خاصیت یا تو الہام سے معلوم ہوتی ہے یا وحی سے یا تجربہ سے۔ مثلاً سقمونیا دست آور ہے اور رگوں سے صفرا کو کھینچ لیتا ہے۔ یا مقناطیس کی یہ خاصیت ہے کہ لوہے کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ یہ دونوں تاثیریں تجربہ ہی سے معلوم ہوئی ہیں۔

اسی طرح اعمال و افعال کی تاثیریں بھی دو ہی طرح کی ہیں، یعنی بعض اعمال میں اور ان کی تاثیروں میں تو مناسبت کھلی ہوئی موجود ہے۔ مثلاً نفس کی خواہشوں کا پورا کرنا اور دنیوی لذتوں کے پیچھے پڑ جانا مضر ہے، کیونکہ جب مرتے وقت دنیا سے روانگی ہوگی، اور ظاہر ہے کہ یہ ایک نہ ایک دن ضرور ہونا ہے، تو اس وقت ضرور ان لذتوں کو چھوڑتے ہوئے حسرت ہوگی اور جب کچھ بن نہ پڑے گا تو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا ہوا رخصت ہوگا۔ پس لذتوں میں پڑنے اور ان کے نقصان و ضرر میں مناسبت کھلی ہوئی ہے۔

یا مثلاً ذکر الٰہی مفید ہے، کیونکہ ذکر کے سبب حق تعالیٰ کی معرفت

حاصل ہوگی اور معرفت کی بدولت محبت پیدا ہوگی۔ اور محبت خداوندی کا نتیجہ
یہ ہوگا کہ آخرت کی پائدار لذتوں کا شوق ہوگا۔ لہٰذا دنیا سے جاتے وقت کچھ
بھی حسرت نہ ہوگی۔ بلکہ اپنے محبوب سے ملنے کے شوق میں ہنسی خوشی روانہ ہوگا
پس ذکر اللہ اور اس کے ثمرہ واثر میں بھی مناسبت ظاہر ہے۔

البتہ دوسری قسم کے اعمال اور ان کی تاثیر میں کچھ مناسبت معلوم نہیں
ہوتی، اور یہ وہی خاصیت ہے جو وحی اور نور نبوت کے علاوہ کسی طرح بھی معلوم
نہیں ہو سکتی، اور اکثر اعمالِ شریعت چونکہ اسی قسم میں داخل ہیں لہٰذا
جب تم دیکھو کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مباح کاموں میں سے
باوجود دونوں پر قدرت ہونے کے ایک کو ترجیح دی ہے مثلاً استنجا دائیں
ہاتھ سے بھی کر سکتے تھے مگر پھر بائیں ہاتھ کو اس کام میں لگایا اور سیدھے
ہاتھ کو علیحدہ رکھا ہے۔ تو یہ علامت ہے کہ آپ نے اس کی خاصیت معلوم
فرما کر ہی ایسا کیا ہے، اور ضرور اس میں کوئی خاص نفع ہے جس کو ہر شخص
نہیں سمجھ سکتا۔ تعجب کی بات ہے کہ محمد بن زکریا طبیب پتھروں اور بوٹیوں کی
جو خاصیتیں بتلائے وہ تو بلا چون وچرا اور بے سوچے سمجھے صحیح مان لی جائیں
اور سید البشر محمد بن عبد اللہ علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام نور نبوت اور وحی ربانی
سے اعمال کی جو خاصیتیں بیان فرمائیں ان کو نہ مانا جائے اور خلاف عقل
بتایا جائے۔ مسلمانو! یقین جانو کہ طبیب روحانی جو کچھ بھی کرے گا ضرور
اس میں نفع ہوگا اگرچہ اس کی مصلحت تمہاری عقل اور علم میں نہ آسکے۔

تیسری غرض یہ ہے کہ انسان جانوروں کی طرح آزاد اور بیکار نہیں
پیدا کیا گیا بلکہ اس کو اشرف المخلوقات اور شریعت کا پابند بنایا گیا ہے۔
اس لئے تم کو مناسب ہے کہ جو کام کرو سنت کے موافق کرو، تاکہ نفس محکوم

اور مطیع بنا ہے، اور فرشتہ خصلت بن جاؤ، اور یوں سمجھو کہ بندگی بیچارگی کا نام ہے۔ اس لئے بندہ کو چاہیئے کہ جو حرکت بھی کرے وہ اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت اور پیغمبر کے حکم سے کرے تاکہ آثار بندگی ہر وقت ظاہر ہوتے رہیں اور ہر دم ریاضت و اطاعت کا اجر ملتا ہے۔ پابندی وہ چیز ہے کہ اگر فرضاً کوئی شخص اپنا تمام اختیار کسی جانور کے ہاتھ میں دیدے تب بھی یہ شخص اس سے اچھی حالت میں ہوگا جو سراپا اپنی خواہش پر چلتا ہے۔

یہ فائدۂ اخیرہ حکم شرعی کی ہر وضع سے حاصل ہو سکتا ہے، خواہ کسی طرح حکم مقرر ہو جائے کیونکہ اس کا جو مقصود اصلی ہے کہ ایک خاص طرز کی پابندی ہو، یہ ہر طور پر حاصل ہے تو شرائع مختلفہ کے احکام بدل جانے پر بھی یہ فائدہ خاصہ محفوظ رہا۔ بخلاف اور دوسرے فائدہ کے کہ حکمت اور خاصیت ایک متعین چیز ہے اور وہ اختلاف شرائع سے بدل نہیں سکتی۔ پس اگر تم تینوں رمزوں پر آگہی حاصل کر لو گے تو تمام حرکات و سکنات میں اتباعِ سنت کی ضرورت تم کو واضح ہو جائے گی۔

فصل

عبادات میں اتباعِ سنت بلا عذر چھوڑنا کفرِ خفی یا حماقتِ جلی ہے

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ امور عادیہ[1] میں اتباعِ سنت کی ترغیب کیلئے بیان کیا ہے۔ اور جن اعمال کو عبادات سے تعلق ہے اور ان کا اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے، ان میں بلا عذر اتباع چھوڑ دینے کی تو سوائے کفرِ خفی[2] یا حماقتِ جلی[3] کے اور کوئی وجہ

---

[1] جن کی عادت ہو ۱۲ [2] پوشیدہ ۱۲ [3] ظاہر ۱۲

ہی سمجھ میں نہیں آتی، مثلاً رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جماعت سے نماز پڑھنے میں تنہا نماز پڑھنے پر ستائیس درجہ فضیلت ہے" اس کے ماننے کے بعد اگر کوئی مسلمان بلا کسی معقول عذر کے جماعت کی نماز ترک کرے تو اس کا سبب یا تو اس کی حماقت ہے کہ اگر کوئی شخص دو پیسے چھوڑ کر ایک پیسہ لے تو اس کو احمق بتاوے اور خود ستائیس فضیلتیں چھوڑ کر ایک پر اکتفا کرے تو بیوقوف نہ ہوا۔ اور یا نعوذ باللہ یہ خیال ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد محض انتظامی مصلحت کی بنا پر ہے تاکہ اس رغبت سے لوگ ایک جگہ جمع ہو جایا کریں، کیونکہ ستائیس کے عدد اور جماعت سے نماز پڑھنے میں کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ پس اگر خدانخواستہ ایسا خیال ہے تو یہ کفر ہے اور کفر بھی ایسا خفی کہ اس کی اطلاع اپنے آپ کو بھی نہیں ہے۔ لوگوں کا ایسا حال ہو گیا ہے کہ اگر کوئی طبیب یا رمّال[2] یا نجومی کوئی بات بتا دے تو اس کی وجہ خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس کو فوراً تسلیم کر لیں گے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول میں مناسبت ٹٹولتے ہیں بھلا اگر کوئی نجومی یوں کہے کہ ستائیس دن گزرنے پر تم کو ایک مصیبت کا سامنا ہوگا۔ کیونکہ تمہارے طالع اور زحل میں ستائیس درجہ کا بُعد ہے اور ہر روز ایک درجہ کم ہوگا اس لئے اگر اپنا بھلا چاہتے ہو تو گھر میں بیٹھے رہو اور باہر نہ نکلو۔ اس کو سنکر یقیناً تم گھر کے پیوند ہو جاؤ گے اور سب کاروبار چھوڑ بیٹھو گے۔ اور اگر کوئی سمجھائے بھی کہ اسے میاں ایک درجہ کو اور ایک دن کو مناسبت کیا ہے؟ اور مصیبت اور زحل میں کیا تعلق ہے؟ نیز باہر نہ نکلنے اور مصیبت کے ٹل جانے میں کیا علاقہ ہے؟ یہ سب واہیات باتیں اور نجومی پنڈتوں کے ڈھکوسلے

---

[1] بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، احمد، مالک ۱۲ [2] علم رمل والا جو نجوم جیسا علم ہے ۱۲

رہیں اس کا خیال ہی مت کرو، تو تم اس کا کہنا کبھی نہ مانو گے اور اس کو احمق وبیوقوف اور علم نجوم کا منکر سمجھو گے۔ پھر افسوس صد افسوس کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اعمال میں تمام مناسبتوں کو سمجھنا چاہتے ہو اور اگر نہ سمجھ میں آئیں تو منکر و بداعتقاد بنے جاتے ہو۔ تم ہی بتاؤ کہ کیا یہ کفر اور انکار رسالت نہیں ہے؟ حالانکہ ان عبادات کا مؤثر ہونا تجربہ سے بھی معلوم ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ نبی کی دی ہوئی خبروں کی مناسبتیں اور مصلحتیں سب ہی کو معلوم ہو جایا کریں۔ بھلا میں تم سے پوچھتا ہوں کہ اگر طبیب کوئی دوا بتائے اور اس کی خاصیت تم سے بیان نہ کرے، یا نجومی کسی آئندہ واقعہ پر کوئی حکم لگائے اور اس کی مناسبت تم کو نہ بتائے تو کیا اس کی بات منظور نہیں کرتے؟ مگر افسوس کہ نبی ورسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی روحانی علاج فرمائیں اور اس کی مناسبت اور خاصیت نہ بتلائیں تو اس کو منظور نہیں کرتے۔ اس کا سبب سوائے اس کے اور کیا ہے کہ نجومی اور طبیب چونکہ موجودہ زندگی کے متعلق علاج بتا رہے ہیں، اور اس زندگی کے ساتھ تم کو محبت ہے، لہذا آنے والی مصیبت یا مرض کے فکر میں اس کی وجہ اور مناسبت پوچھنے کا ہوش تک نہیں رہتا، بلکہ دس برس بعد آنیوالی مصیبت کا آج ہی سے فکر و انتظام شروع ہو جاتا ہے حالانکہ وہ محض موہوم اور ایسے لوگوں کی بتائی باتیں ہیں جن کا ہزاروں دفعہ جھوٹ تم خود آزما چکے ہو اور جو کہ ٹکے پر ایسی باتیں بتاتے دربدر مارے مارے پھرتے ہیں۔ اور نبی چونکہ طبیب روحانی ہیں اس لیے قلبی امراض کا علاج اور دائمی صحت کی تدبیر بتلاتے ہیں اور اس کی مطلق پرواہ نہیں، فکر نہیں، اندیشہ نہیں۔ بلکہ آنے والی آخرت کی زندگی کا جیسا یقین ہونا چاہیئے وہ یقین حاصل

ہی نہیں اس لئے مناسبتیں پوچھتے ہو، اللہ تعالیٰ ایسی غفلت سے بچائے جس کی وجہ سے عبادتوں میں بھی اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہو سکے۔

خاصیت اعمال میں ضعیف حدیث پر بھی عمل کرنا مناسب ہے

مسلمانوں کی یہی شان ہے کہ جس امر میں بھی کوئی حدیث وارد ہوئی ہو اس میں بے چون وچرا اقتدار کر لیا کریں۔ مثلاً رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا ہے[1] کہ شنبہ اور چہارشنبہ کے دن پچھنے لگوانے سے برص کا اندیشہ ہے۔ ایک محدث نے اس حدیث کو ضعیف کہکر قصداً شنبہ کے دن پچھنے لگوائے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برص میں مبتلا ہو گئے۔ چند روز بعد ایک شب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے اور مرض کی شکایت کرنے لگے تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جیسا کیا ویسا بھگتو۔ شنبہ کے دن پچھنے کیوں لگوائے تھے۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس حدیث کا راوی ضعیف تھا۔ آپ نے فرمایا کہ حدیث تو میری نقل کرتا تھا[عہ]۔ عرض کیا کہ یا رسول اللہ! غلطی ہوئی، میں توبہ کرتا ہوں۔ یہ سنکر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی، اور صبح کو آنکھ کھلی تو مرض کا نشان بھی نہ رہا۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے[2] کہ عصر کے بعد سو جانے سے عقل کے جاتے رہنے کا خوف ہے۔ اور ایک حدیث[3] میں آیا ہے کہ جس شخص کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو جب تک اس کو درست

---

[1] حاکم و بیہقی۔ صحیح ۱۲ [2] ابویعلیٰ۔ ضعیف ۱۲ [3] مسلم ۱۲

عہ یعنی میری طرف منسوب کرنا درجۂ موضوعیت میں نہ تھا اور بیان تھا خاصیت عمل کا حلال اور حرام کا پھر عمل کرنا ہی احتیاط کی بات تھی ۱۲ (مولانا تھانوی رحمہ اللہ)

نہ کرالے تو اس وقت تک صرف ایک جوتا پہنکر ہرگز نہ چلے "

اور دوسری حدیث میں ہے کہ " زچہ کی اوّل خوراک تر کھجور ہونی چاہیئے اور اگر یہ نہ ہو تو خشک چھوارا ہی سہی، کیونکہ اگر اس سے بہتر کوئی غذا ہوتی تو حق تعالیٰ عیسیٰ رُوح اللہ کے پیدا ہونے پر بی بی مریم علیہا السّلام کو وہی کھلاتا "

نیز رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب کوئی تمہارے پاس مٹھائی لائے تو اس میں سے کچھ کھالیا کرو اور خوشبو لائے تو لگالیا کرو "

اسی طرح جو کچھ بھی طبیب روحانی فرمادیں اس میں مناسبتیں نہ ٹٹولو، بے چون وچرا مان لو۔ کیونکہ ان امور میں بیشمار اسرار اور رموز ہیں جن کی خاصیتیں ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔

لہ بیہقی۔ مگر مضمون جو ابوداؤد کا ہے وہ قوی ہے۔ ۱۲

خاتمہ

اور اورادِ مذکورہ کی ترتیب

مذکورہ عبادتوں میں بعض عبادتیں جمع ہو سکتی ہیں۔ جیسے نماز روزہ اور تلاوتِ کلام اللہ کہ تینوں ایک وقت میں پائی جا سکتی ہیں، مثلاً روزہ دار شخص نماز میں قرآن شریف پڑھے تو دیکھو ایک ہی وقت میں تینوں عبادتیں حاصل ہو رہی ہیں۔ اور بعض عبادت دوسری عبادت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی مثلاً یہ نہیں ہو سکتا کہ ذکرِ الٰہی بھی ہو اور تلاوتِ کلام اللہ بھی ہو، یا نماز بھی ہو اور مسلمانوں کے حقوق کی خبرگیری بھی ہو۔ اس لئے مناسب ہے کہ رات دن کے چوبیس گھنٹوں پر ان مختلف عبادتوں کو تقسیم کر لو۔ کیونکہ اوقات کا انضباط ہونے سے سہولت بھی ہو جائے گی اور جو عبادت کا مقصود ہے وہ بھی حاصل ہو جائے گا یعنی ذکر اللہ سے اُنس اور جہانِ فانی سے بیزاری اور نفرت پیدا ہو جائے گی۔

یاد رکھو کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور اس عالمِ فانی کے پیدا کرنے سے مقصود یہ ہے کہ انسان حق تعالیٰ سے محبت کرے تاکہ آخرت کی خوبی اس کو حاصل ہو۔ اور چونکہ محبت بغیر معرفت کے ہو نہیں سکتی اس لئے معرفتِ الٰہی مقدم اور ضروری ہے۔ اور معرفت حاصل کرنے کا

طریقہ یہی ہے کہ ہر وقت حق تعالیٰ کے دھیان اور یاد میں مشغول رہو اور
چونکہ جتنی بھی عبادتیں ہیں سب دھیان اور یاد ہی کی غرض سے ہیں، اور

عبادتوں کے مختلف اقسام ہونے میں حکمت

ان کو مختلف اقسام کا اس لئے بنایا گیا ہے
تاکہ ہر وقت ایک طرز کی عبادت میں مشغول رہنے سے دل گھبرا نہ جائے،
اور نیز اگر ہر وقت ایک ہی عبادت کی جائے گی تو طبیعت اس کی خوگر ہو
جائے گی اور عادت ہو جانے کی وجہ سے قلبی اثر ان سے جاتا رہے گا، اس
لئے ہر عبادت کے لئے جدا وقت تجویز کر لینا ضروری ہے۔ البتہ جو لوگ
فنا اور مستغرق[1] ہو جائیں ان کو ترتیب و تقسیم کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس
مرتبہ میں پہنچکر ایک ہی عبادت رہ جاتی ہے اور ہر وقت ذکر میں مشغولی ہوتی
ہے مگر یہ درجہ ایسا نہیں کہ ہر شخص اس کو حاصل کر سکے۔ اس لئے تمہیں
اوقات منضبط کرنے کی نہایت ضرورت ہے کہ فلاں وقت سے فلاں
وقت تک یہ عبادت اور اس گھنٹہ سے اس گھنٹہ تک یہ عبادت اور ط
کو یہ اور رات کو یہ۔ البتہ اگر علم دین پڑھتے پڑھاتے ہو یا کسی جگہ کے حاکم
ہو اور رعایا کی حفاظت میں مشغول ہو تو دن بھر اس میں مشغول رہنا دوسری
عبادتوں سے بہتر ہے۔ کیونکہ علم دین ہی کی بدولت حکم الٰہی کی تعلیم حاصل
ہوتی ہے اور جو نفع اس تعلیم یا مخلوق کی حفاظت و نگہبانی سے لوگوں کو
پہنچتا ہے وہ اصل دین ہے۔

عیالدار شخص اور عالم اور حاکم کیلئے عبادت

اسی طرح عیالدار آدمی کو محنت مزدوری کرنا اور

---

[1] غرق ۱۲

حلال معاش سے بال بچوں اور متعلقین کا پیٹ بھرنا بھی عبادت بدنی سے افضل ہے مگر ان حالتوں میں بھی ذکر الٰہی سے علیحدگی مت اختیار کرو، بلکہ جس طرح کسی حسینہ معشوقہ کا عاشق اپنے معشوق کے سوا جس کام میں بھی مشغول ہوتا ہے بحالتِ مجبوری صرف ہاتھ پاؤں سے مشغول ہوتا ہے اور دل ہر وقت معشوقہ ہی میں پڑا رہتا ہے اسی طرح تم بھی جس کام میں چاہے مشغول ہو اعضائے بدن سے اس کو انجام دو مگر دل کو حق تعالیٰ ہی کے خیال میں مصروف رکھو۔

حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ ہاتھ سے کسب کرتے اور محنت مزدوری سے مال حاصل کیا کرتے اور یوں فرمایا کرتے کہ ہمیں تین چیزیں مرحمت ہوئی ہیں یعنی ہاتھ زبان اور قلب، سو ان میں سے ہاتھ تو کسب معاش کیلئے ہے اور زبان مخلوق کے واسطے تاکہ پڑھائیں اور سمجھائیں اور باتیں کریں، اور قلب دنیا کے کسی شخص کا بھی نہیں ہے بلکہ صرف اللہ جل شانہٗ کیلئے ہے کہ ہر وقت اس کے حضور میں حاضر رہے۔

اعمال ظاہری کا بیان ختم ہوا عمل کرنے والوں کیلئے انشاءاللہ تعالیٰ یہی کافی ہے حق تعالیٰ توفیق مرحمت فرمائے۔

دوسری قسم

مذموم اخلاق کی تفصیل؛
اور
طہارتِ قلب کا بیان؛

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس نے اپنا قلب پاک بنالیا وہی فلاح کو پہنچا۔ اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "طہارت نصف ایمان ہے"؛ کیونکہ ایمان کے دو جز ہیں یعنی قلب کا ان نجاستوں سے پاک کرنا جو حق تعالیٰ کو ناپسند ہیں اور ان خوبیوں سے آراستہ کرنا جو اللہ پاک کو پسند اور محبوب ہیں. گویا نجاست سے طہارت کرنا ایمان کا ایک جزو ہے اور طاعت سے زینت و آرائش اس کا دوسرا ٹکڑا ہے۔ لہٰذا اوّل وہ اخلاق ذمیمہ معلوم ہونے چاہئیں جن سے قلب کو پاک رکھنا ضروری ہے. سو ان کے اصول بھی دس ہیں، جن میں سے ہر ایک کو جُدا جُدا بیان کیا جاتا ہے۔

---

[1] بری عادتیں ۱۲ [2] مسلم و ترمذی ۱۲ [3] پاک ۱۲

پہلی فصل

کثرتِ اکل اور حرصِ طعام کا بیان

زیادہ کھانا اور پیٹ بھرنے کی ہوس بیسیوں گناہوں کی جڑ ہے کیونکہ اس سے جماع کی خواہش بڑھتی ہے اور جب شہوت بڑھتی ہے تو مال حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے کیونکہ شہوتیں مال کے بغیر پوری نہیں ہوسکتیں اور اس کے بعد طلب جاہ کی خواہش ہوتی ہے کیونکہ جاہ کے بغیر مال حاصل ہونا دشوار ہے۔ اور جب مال وجاہ کی خواہش پیدا ہوگی تو تکبر، ریا، حسد، کینہ، عداوت غرض بہتیری آفتیں جمع ہوجائیں گی اور دین کی تباہی کا پورا سامان اکٹھا ہوجائے گا۔ اس لئے حدیث میں بھوک کی زیادہ فضیلت آئی ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ آدمی کیلئے بھرنے کے واسطے پیٹ سے زیادہ کوئی بُرا برتن نہیں ہے، آدمی کو ضرورت کے لئے تو چند لقمے کافی ہیں جن سے زندگی قائم اور کمر مضبوط ہے، اور اگر اس سے زیادہ ہی کھانا ضروری ہے تو پیٹ کے تین حصے کرلینے چاہئیں کہ تہائی حصہ کھانے کیلئے ہو اور تہائی حصہ پانی کیلئے اور تہائی حصہ سانس کیلئے خالی چھوڑ دیا جائے۔

---

[1] ترمذی ونسائی وابن ماجہ وحاکم۔ صحیح ۱۲

تقلیلِ طعام کے فوائد

بھوک میں فائدے تو بیشمار ہیں مگر ہم ان میں سے چند بڑے فائدوں کا ذکر کرتے ہیں جن کو اصول کہنا چاہیئے اور درحقیقت آخرت کی سعادت کا حاصل ہونا انہیں پر موقوف ہے ۔

اوّل :۔ قلب میں صفائی اور بصیرت میں روشنی حاصل ہوتی ہے کیونکہ پیٹ بھر لینے سے بلادتِ[1] پیدا ہوتی ہے اور قلب کی آنکھیں اندھی ہوجاتی ہیں اور ذکاوت جاتی رہی تو معرفتِ الٰہی ہرگز حاصل نہیں ہوسکتی ۔

دوم :۔ دل رقیق ہوجاتا ہے اور مناجات میں مزا آتا ہے، کیونکہ جب یہ توبرہ خالی ہوگا تو اپنے مالک کے سامنے سوال والتجا اور دعا کرنے میں لطف آئے گا اور خوف وخشیۃ وانکسار پیدا ہوگا جو معرفت کے حاصل کرنے کی کنجیاں ہیں ۔

سوم :۔ سرکش نفس ذلیل اور مغلوب ہوجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب دشمن خدا[2] کو شکست ہوئی اور غفلت کا دروازہ بند ہوگیا تو حق تعالیٰ کی جانب توجہ ہوگی اور سعادت کا دروازہ کھل جائے گا ۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسولِ مقبول[3] صلی اللہ علیہ وسلم پر دنیا پیش کی گئی تو آپ نے منظور نہیں فرمائی اور یوں عرض کیا کہ "بارِ الٰہا میں چاہتا ہوں کہ ایک دن پیٹ بھرے تاکہ شکر ادا کروں اور ایک دن فاقہ ہو تاکہ صبر کروں ۔

چہارم :۔ آخرت کی مصیبتوں اور عذاب کی تکلیفوں کا دنیا میں بھی کچھ مزہ چکھنا چاہیئے تاکہ ان کی اذیت سے نفس خبردار ہوکر ڈرے اور ظاہر ہے کہ بھوک سے زیادہ انسان اپنے نفس کو کوئی عذاب نہیں پہنچا سکتا

---

[1] سستی اور طبیعت کا کند ہونا ۱۲ [2] اللہ کا ڈر ۱۲ [3] ترمذی ۱۲

کیونکہ اس میں کسی قسم کے تکلف اور سامان فراہم کرنے کی حاجت نہیں ہے اور جب بھوک کی وجہ سے عذاب الٰہی کا ہر وقت مشاہدہ ہے گا تو حق تعالیٰ کی معصیت کی جانب توجہ بھی نہ ہوگی اور نافرمانی کی جرأت نہ ہو سکے گی۔

پنجم :- تمام شہوتیں کمزور ہو جاتی ہیں کہ کسی خواہش کے پورا ہونے کی آرزو نہیں رہتی اور دنیا کی محبت دل سے نکل جاتی ہے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب کبھی میں نے پیٹ بھر کر کھایا ہے تو ضرور کوئی نہ کوئی گناہ مجھ سے صادر ہوا یا کم سے کم گناہ کا قصد تو ہو ہی گیا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ " رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلی بدعت جو ایجاد ہوئی وہ پیٹ بھر کھانا ہے " پس جب مسلمانوں کے پیٹ بھرنے لگے تو ان کے نفس ان کو دنیا کی طرف کھینچ کر لے گئے۔

ششم :- زیادہ نیند نہیں آتی اور عبادت گراں نہیں گذرتی کیونکہ پیٹ بھر کھانے سے نیند کا غلبہ ہوا کرتا ہے اور نیند سے عمر بھی کم ہوتی ہے، کیونکہ وہ خدا کی عبادت نہیں کرنے دیتی۔ حضرت ابو سلیمان درانی فرماتے ہیں کہ جنہوں نے شکم سیر ہو کر کھایا ہے ان میں چھ خصلتیں پیدا ہوئیں:

اوّل عبادت کی حلاوت جاتی رہی۔ دوئم حکمت وفراست اور ذکاوت و نورِ معرفت کا حاصل ہونا دشوار پڑ گیا۔ سوئم مخلوقِ خدا پر شفقت اور ترس کھانے سے محرومی ہوئی کیونکہ سب کو اپنا ہی جیسا پیٹ بھرا ہوا سمجھا۔ چہارم معدہ بھاری ہو گیا۔ پنجم خواہشات نفسانی زیادہ ہو گئیں۔

لہ بخاری کتاب الضعفاء میں، ابن ابی الدنیا کتاب الجوع میں ۱۲

اور ششم یہ حالت ہوگی کہ مسلمان مسجدوں کی طرف آرہے ہوں گے اور بیت الخلا جا رہا ہوگا، اللہ کے بندے بیت اللہ کا چکر لگا رہے ہوں گے اور یہ کوڑیوں کا گشت کر رہا ہوگا۔

ہفتم :- دنیوی تفکرات کم ہو جائیں گے اور فکر معاش کا بار ہلکا ہو جائے گا، کیونکہ جب بھوک کی عادت ہوگئی تو تھوڑی سی دنیا پر قناعت کر سکے گا اور پیٹ کی خواہش پورا کرنے کو دوسروں سے قرض نہ لے گا، بلکہ اپنے ہی نفس سے قرض مانگ لے گا یعنی اس کو خالی رکھے گا۔ شیخ ابراہیم بن ادہمؒ سے جب کہا جاتا تھا کہ فلاں چیز گراں ہوگئی تو یوں فرمایا کرتے تھے کہ "ترک کردو اور اس کی خواہش چھوڑ کر اس کو ارزاں بنالو یہ اس سے زیادہ سستی چیز کیا ہو سکتی ہے کہ اس کو خریدا ہی نہ جائے۔

مقدار طعام کے مراتب

چونکہ شکم سیری اور زیادہ کھانے کی لوگوں کو عادت پڑی ہوئی ہے اس لئے یک لخت اس کا چھوڑنا دشوار ہے، لہذا اپنی خوراک مقررہ میں روزانہ ایک لقمہ کم کر دیا کرو تو مہینہ بھر میں ایک روٹی کم ہو جائے گی اور کچھ گراں بھی نہ گذرے گا، اور جب اس کی عادت ہو جائے تو اب مقدار اور وقت اور جنس کی طرف توجہ کرو کہ رفتہ رفتہ اعلیٰ درجہ پر پہنچ جاؤ۔ یاد رکھو کہ مقدار کے تین درجے ہیں:

اعلیٰ درجہ صدیقین کا ہے۔ یعنی بس اتنا کھانا چاہیئے کہ جس سے کمی کرنے میں زندگی جاتی رہے یا عقل میں فتور آ جائے، اس سے زیادہ کھانا اس مرتبہ میں گویا پیٹ بھر کر کھانا ہے جس کی ممانعت ہے۔

حضرت سہل تستریؒ کے نزدیک یہی مختار ہے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ بھوک کے ضعف کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھنا شکم سیری کی قوت سے

سبب کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے افضل ہے۔

متوسط درجہ یہ ہے کہ روزانہ نصف مُد یعنی دو تہائی رطل[1] پر اکتفا کیا کرو، حضرت عمر فاروق اور اکثر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عادت یہ تھی کہ ہفتہ بھر میں ایک صاع[2] جَو سے زیادہ نہ کھاتے تھے۔

ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ روزانہ ایک مُد کی مقدار کھاؤ، اگر اس سے زیادہ کھاؤ گے تو پیٹ کے بندے سمجھے جاؤ گے، اور چونکہ مقدار خوراک کے بارے میں لوگوں کی طبیعتیں اور حالات مختلف ہوتے ہیں لہذا سب کے لئے ایک مقدار معین نہیں ہو سکتی، چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ سیر بھر اناج کھا سکتے ہیں اور بعض آدمیوں سے پاؤ بھر بھی نہیں کھایا جاتا اس لئے قاعدہ کلیہ یاد رکھو کہ جب اشتہائے صادق ہو تو کھانے کی جانب ہاتھ بڑھاؤ اور یہ اشتہار پوری نہ ہونے پائے کہ ہاتھ روک لو۔ اور صادق اشتہار کی علامت یہ ہے کہ جیسی بھی روٹی سامنے آجائے اس کو سالن اور ترکاری کے بغیر کھانے کی رغبت ہو کیونکہ جب خالص گیہوں کی خواہش ہوئی یا سالن کے بغیر روٹی کھانا گراں گذرا تو معلوم ہوا کہ بھوک کی سچی خواہش نہیں ہے بلکہ طبیعت کو لذت اور ذائقہ کی جانب ایسا میلان ہے جیسا شکم سیر ہونے کے بعد پھل یا میوہ کا ہوا کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا نام بھوک نہیں ہے بلکہ تفکّہ اور تلذّذ ہے۔

وقت اکل کے مختلف درجات

کھانے کے وقت میں بھی کئی درجہ ہیں:

---

[1] ایک رطل چوالیس تولہ یعنی کچھ اوپر آدھ سیر کا ہوتا ہے ۱۲

[2] ایک صاع تخمیناً ساڑھے تین سیر انگریزی وزن سے ہوتا ہے ۱۲

اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ کم سے کم تین دن بھوکے رہ کر چوتھے دن کھایا کرو۔ دیکھو حضرت صدیقؓ پے در پے چھ چھ دن تک بھوکے رہتے تھے۔ اور حضرت ابراہیم بن ادہمؒ اور حضرت سفیان ثوریؒ سات دن بھوکے رہنے کے عادی تھے۔ اور بعض بزرگوں کے فاقہ کی نوبت چالیس دن تک پہنچی ہے۔ اور یاد رکھو کہ جو شخص چالیس دن تک بھوکا رہے گا اس پر ملکوتی عجائبات اور اسرار میں سے کوئی راز ضرور منکشف ہوگا، اور چونکہ یک لخت اس کا حاصل کرنا بھی دشوار ہے اس لئے آہستہ آہستہ بھوک کی عادت ڈالو۔

متوسط درجہ یہ ہے کہ دو دن بھوکے رہو اور تیسرے دن کھایا کرو۔ اور **ادنیٰ** درجہ یہ ہے کہ روزانہ صرف ایک دفعہ کھاؤ، کیونکہ دونوں وقت کھانے سے تو بھوک کی حاجت ہی نہ ہوگی۔ بس جو شخص دو وقتہ کھانے کا عادی ہے اس کو تو بھوک کا مزہ ہی نہیں معلوم ہو سکتا کہ کیسا ہوتا ہے۔

جنس طعام کے مراتب مختلفہ

جنس میں اعلیٰ درجہ گیہوں کی روٹی کا ترکاری کے ساتھ کھانا ہے، اور ادنیٰ درجہ جَو کی روٹی کو بلا ترکاری کھانا۔ یاد رکھو کہ ترکاری کی عادت اور مداومت بہت بری ہے۔ حضرت فاروقؓ نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی تھی کہ صاحبزادے کبھی گوشت روٹی کھاؤ اور کبھی روٹی و گھی۔ اور کبھی دودھ روٹی۔ کبھی سرکہ روٹی۔ کبھی زیتون کے ساتھ روٹی کھاؤ اور کبھی نمک کے ساتھ اور کبھی صرف روٹی پر قناعت کرو۔ حضرت فاروقؓ کا یہ ارشاد بھی ان لوگوں کے لئے ہے جن کو ترکاری کی ہمیشہ عادت ہے۔

سالکوں کو ترک لذائذ کی ضرورت

جو اہل طریقت اور سالک ہیں ان کو ترکاری کیا معنیٰ، ساری ہی مزہ دار

چیزوں اور خواہشوں کے پورا کرنے سے منع کیا جاتا ہے، بعض بزرگوں نے ایک چیز کی خواہش کو دس دس اور بیس بیس برس رد کے رکھا ہے اور پورا نہیں ہونے دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت میں بدتر لوگ وہ ہیں جن کے بدن عمدہ غذاؤں اور لذیذ طعام سے پرورش پائے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی ہمتیں بس طرح طرح کے کھانوں اور قسم قسم کے لباس ہی کی جانب متوجہ رہیں کہ منہ پھاڑ پھاڑ کر باتیں بناتے ہیں اور کام کچھ بھی نہیں کرتے
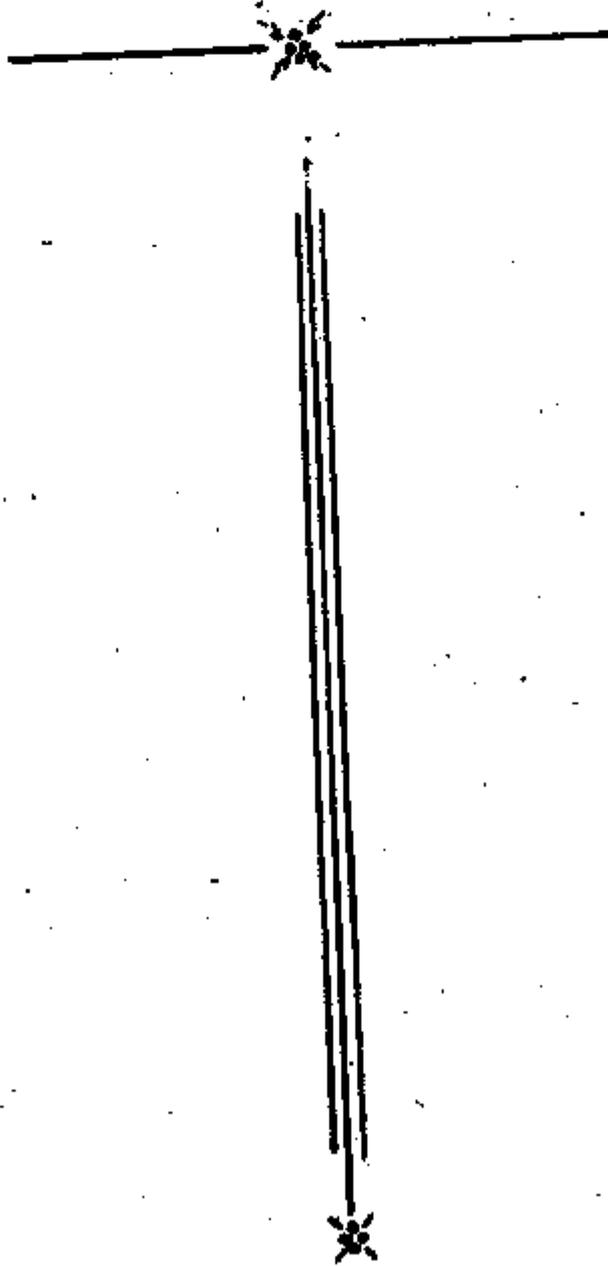
دوسری اصل

کثرتِ کلام کی ہوس اور فضول گوئی کا بیان

اس کا قطع کرنا بہت ضروری ہے، کیونکہ یوں تو اعضاء کے تمام کاموں کا اثر قلب پر پڑتا ہے، مگر زبان چونکہ قلب کی سفیر ہے، اور جو نقشہ قلب میں کھنچتا ہے اور جس چیز کا تصور دل میں آتا ہے اس کا اظہار زبان ہی کیا کرتی ہے، اس لئے اس کی تاثیر قلب پر زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔

عبث کلام کی عادت کا نقصان

یاد رکھو کہ جب زبان جھوٹی[1] ہو جاتی ہے تو دل میں بھی صورت کاذبہ[2] کی تصویر کھنچتی اور کبھی آجایا کرتی ہے۔ خصوصاً جب کہ جھوٹ کے ساتھ فضول و لغو گوئی بھی شامل ہو تو اس وقت تو قلب بالکل ہی سیاہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ کثرت کلام سے قلب مر جاتا ہے اور معرفت الٰہی حاصل کرنے کی قابلیت ہی اس میں نہیں رہتی۔ اس وجہ سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[3] ہے کہ جو شخص اپنی زبان اور شرم گاہ کی حفاظت کا کفیل[4] ہو گیا، میں اس کیلئے جنت کا کفیل ہوں۔" حدیث[5] شریف میں آیا ہے کہ "زبان ہی کے کرتوت اکثر لوگوں کو اوندھے منہ جہنم میں دھکیلیں گے" لہٰذا اس کی حفاظت بہت ضروری ہے، مسلمان کو چاہیئے کہ اگر زبان ہلائے تو نیک بات اور کلمۃ الخیر[6]

---

[1] جھوٹی [2] جھوٹی [3] بخاری و ترمذی ۱۲ [4] ذمہ دار کہ ان سے گناہ نہ ہو کیونکہ اکثر گناہ انہیں سے ہوتا ہے [5] طبرانی و ترمذی۔ صحیح ۱۲ [6] بھلائی کی بات ۱۲

بولے ورنہ چپ رہے کیونکہ جب زبان زیادہ چلنے لگتی ہے تو لغو گوئی بڑھ جاتی ہے، اور جب لغو گوئی بڑھ گئی تو خدا جانے کس حد تک پہنچے اور کیا کچھ منہ سے بکتا پھرے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے منہ میں پتھر رکھ لیتے تھے، تاکہ نفس متنبہ رہے اور زبان ضرورت سے زیادہ کلام نہ کرے۔

فصل

زبان کے متعلق گناہوں سے بچنے کیلئے اس آیت پر عمل کرنا کافی ہے لَاخَیْرَ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوٰھُمْ۔ جس کا خلاصہ منشا یہ ہے کہ فضول اور بے فائدہ کلام نہ کرو صرف ضروری بات کے اظہار پر اکتفا کرو اسی میں نجات ہے۔

کلام عبث کی ماہیت

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ کسی غزوہ میں ایک نوجوان شہید ہوگیا۔ لڑائی سے فراغت کے بعد شہیدوں کی نعشوں میں اس کی نعش بھی ملی اور دیکھا گیا کہ اس کے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ماں آئی اور فاقہ کی حالت میں اللہ کے نام پر جان دینے والے شہید بیٹے کے پاس بیٹھ کر اس کے منہ سے مٹی پونچھی اور کہا کہ بیٹا تجھ کو جنت مبارک ہو۔ یہ سنکر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "کیا خبر ہے؟ ممکن ہے کہ بے فائدہ کلام کرنے کا عادی ہو،

لے خبردار عہ نہیں بھلائی ہے ان کی بہت سی سرگوشی میں ۱۲ سہ ابن ابی الدنیا ابویعلی ۱۲
سے جس سے اس کے مرتبوں میں کمی آجائے گو شہادت کا ثواب ہے اور حدیث میں اس ثواب کی نفی نہیں۔ اور جنت سے رکنے کا مضمون مترجم صاحب نے بڑھایا ہے۔ اصل عربی میں نہیں ہے ۱۲

اس سے معلوم ہوا کہ فضول گوئی کی عادت جنت میں جانے سے روکنے والی چیز ہے۔ مسلمان کو وہی بات زبان سے نکالنی چاہیے جس میں یا کوئی ثواب حاصل ہو اور یا کوئی نقصان رفع ہو۔ اور جس بات کے زبان سے نکالنے میں نہ کوئی ثواب ہوتا ہے نہ کچھ نقصان رفع ہوتا ہے تو وہ عبث اور فضول ہے اور اس سے احتراز کرنے کی ضرورت ہے۔ جتنی دیر فضول گوئی میں مشغول رہتے ہو اگر یہ وقت ذکر الٰہی میں صرف ہو تو نیکیوں کا کتنا بڑا خزانہ جمع ہو جائے، پھر بھلا خزانے کو چھوڑنا اور پتھر ڈھیلے جمع کرنا کون سی عقلمندی ہے۔ اور اگر فضول گوئی سے بڑھکر دروغ گوئی تک نوبت پہنچی اور زبان سے غیبت اور گالیاں اور فحش یعنی ایسی باتیں نکلنے لگیں جن میں نفع تو درکنار الٹا دین کا ضرر اور نقصان ہے تب تو ایسی مثال ہوگی کہ بھرپور خزانہ چھوڑ کر آگ کے الاؤ میں جا گھسے۔ اللہ پناہ میں رکھے۔

ناول اور تاریخ وغیرہ کا مطالعہ اس حالت سے تمام قصے کہانیاں، سفرنامے، مختلف ملکوں کی تاریخیں اور باشندگانِ دنیا کے لباس و خوراک اور طرزِ معاشرت و تمدن کے تذکرے اور تجارتوں، حرفتوں، صنعتوں کے حالات سب اسی فضول اور عبث کلام میں داخل ہیں جس میں مشغول ہونا معیوب ہے اور آیت مذکورہ کے منشاء کے بالکل خلاف ہے۔

فصل

زبان کے متعلق بیس آفتیں ہیں اور چونکہ ہر ایک کی جدا جدا تشریح کا یہ موقع نہیں ہے اس لئے مختصر طور پر یہاں صرف ان پانچ گناہوں کو بیان کئے دیتے ہیں جن میں لوگ بکثرت منہمک ہیں اور جن سے زبان گویا

نجاستوں کی خوگر ہو گئی ہے۔

پہلی آفت جھوٹ بولنا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ آدمی جھوٹ بولتا ہے یہاں تک اس کا عادی ہو جاتا ہے اور خدا کے یہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے[1]

ہنسی مذاق کا جھوٹ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں[2] کہ "جھوٹ بولنا مسلمان کی شان نہیں اور ایمان اور جھوٹ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے"۔ یاد رکھو کہ جھوٹ بولنے سے قلب میں کجی آجاتی ہے اور خواب بھی سچے نظر نہیں آتے۔ اس لئے مذاق میں بھی دوسروں کے ہنسانے کو جھوٹ نہ بولو۔ اور ہمیشہ جھوٹے خیالات اور خطرات سے قلب کو بچائے رکھو ورنہ قلب میں کجی پیدا ہو جائے گی۔ اور تجربہ اس کا شاہد ہے کہ ایسے آدمیوں کو خواب بھی سچا نظر نہیں آتا۔ ایک مرتبہ کسی عورت[3] نے اپنے صغیر سن بچے کو بلایا اور کہا کہ آؤ ہم تمہیں ایک چیز دیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت سے دریافت فرمایا کہ اگر بلانے سے بچہ آگیا تو کیا چیز دے گی؟" عورت نے کہا چھوارے دیدونگی آپ نے فرمایا کہ "اگر کچھ دینے کا ارادہ نہ ہوتا اور صرف بہلانے کے لئے ایسا لفظ نکلتا تو یہ بھی زبان کا جھوٹ شمار ہوتا۔

کِذب مصلحت آمیز کا جواز اور اس کی حکمت؛

البتہ ضرورت کے وقت جھوٹ بولنا بھی جائز ہے، بشرطیکہ سچ بولنے سے کسی ایسے گناہ یا نقصان کا اندیشہ ہو جو جھوٹ کے گناہ سے زیادہ ہے۔ مثلاً دو مسلمانوں میں صلح کرا دینے یا

---

[1] بخاری و مسلم ۱۲ [2] ابن عبدالبر، مگر مضمون موطا میں صحیح ہے ۱۲
[3] بخاری تاریخ میں، و طبرانی و ابن سعد و دیلمی ۱۲

جہاد میں دشمن کو دھوکہ دینے یا بی بی کو رضامند اور خوش کرنے کیلئے جھوٹ بول دینے کی حدیث[2] میں اجازت آئی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مسلمانوں میں عداوت اور رنج رہنے سے جو بُرا نتیجہ پیدا ہوگا وہ جھوٹ کے نقصان سے بڑھا ہوا ہے اس طرح جنگ کے راز کا پوشیدہ رکھنا ضروری ہے کیونکہ اگر دشمن کو اطلاع ہوئی اس کو حملے کا موقع ملے گا اور ہزاروں پاک جانیں تلف ہو جائیں گی اس لئے اصل بات کا ظاہر نہ کرنا اور جھوٹی بات بنا دینا افضل ہوا۔ اسی طرح خاوند کے بعض اسرار بی بی سے مخفی رہنے کے قابل ہیں، پس اگر راست گوئی کے سبب کوئی خیال اس پر ظاہر ہو گیا اور میاں بی بی میں نااتفاقی ہو گئی تو جو بُرا اثر پیدا ہوگا اس میں جھوٹ بولنے کی نسبت زیادہ گناہ ہے، پس ایسی صورت میں جھوٹ بولنے کی اجازت ایسی ہے جیسے کوئی شخص دو بلاؤں میں مبتلا ہو جائے تو آسان اور ہلکی مصیبت کو ترجیح دے کر اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی مثال ایسی سمجھو کہ جیسے کسی شخص کے بھوکا مر جانے کا اندیشہ ہو تو اس کیلئے مُردار بھی حلال ہے۔ اسی طرح اپنا یا اپنے یا مسلمان بھائی کا مال ظالم کے ہاتھ سے بچانے کو یا کسی کی خفیہ رکھی ہوئی امانت کو محفوظ رکھنے کیلئے دوسروں کے سامنے انکار کر دینا اور جھوٹ بول دینا جائز ہے۔ اور اپنی معصیت کا انکار کر دینا بھی اسی وجہ سے جائز ہے کہ فسق وفجور کا اعلان حرام ہے۔ یا اپنی بیوی سے یہ کہہ دینا کہ میری دوسری بیوی تمہاری سوت مجھے تم سے زیادہ پیاری نہیں ہے۔ یہ سب باتیں اسی بنا ر

---

[1] اس سے بدعہدی مراد نہیں کہ وہ تو حرام ہے، بلکہ دھوکہ یہ ہے کہ حالت عدم صلح میں ایسی کارروائی کی کہ غنیم کچھ اور سمجھا اور بےفکر ہو گیا اور اس نے اپنا کام نکال لیا ۱۲ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ

[2] مسلم میں ہے ۱۲

پر جائز ہیں کہ اس جھوٹ سے ایک ضرر دفع کیا گیا ہے۔

تحصیل مال و جاہ کیلئے جھوٹ بولنا حرام ہے

البتہ روپیہ کمانے یا عزت وجاہ حاصل کرنے کی غرض سے جھوٹ بولنا ہرگز حلال نہیں ہے، کیونکہ اگر مال وجاہ نہ بڑھے تو کوئی نقصان نہیں ہوتا زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ نفع حاصل نہیں ہوتا اور نفع کا حاصل نہ ہونا نقصان نہیں کہلاتا ہے۔ اس باریکی کو اکثر لوگ نہیں سمجھتے اور اکثر اس غرض کے لئے جھوٹ بولا کرتے ہیں حالانکہ یہ حرام قطعی ہے، اور درحقیقت ان کے دین کی تباہی کا یہی سامان ہے، کیونکہ ضرورت اور بے ضرورت میں تمیز نہیں کرتے۔ افسوس کی بات ہے کہ جاہلوں نے خیالی اور فرضی ضرورتوں کو بھی ضرورت سمجھ لیا ہے، حالانکہ شرعی اور واقعی ضرورت جس کا نام ہے وہ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں کہ جب تک حالت اضطرار اور کسی بڑے نقصان کا غالب گمان نہ ہوجائے اس وقت تک مردار کا کھانا حلال نہیں ہے ایسے ہی جھوٹ بولنا جو شرعاً حرام ہے وہ بھی جائز نہیں ہے۔

ضرورت پر بھی توریہ کرنا چاہیئے نہ کہ صریح جھوٹ

اس شدید ضرورت کے موقع پر بھی حتی الامکان تعریض اور توریہ ہی کرنا چاہیئے کہ نفس کو جھوٹ بولنے کی عادت نہ ہوجائے۔ شیخ ابراہیمؒ گھر کے اندر کسی ضروری کام میں مشغول ہوتے اور کوئی شخص ان کو باہر بلاتا تو خادم سے کہتے تھے یوں کہدے کہ "مسجد میں ڈھونڈو"۔ اور حضرت شعبیؒ انگلی سے ایک دائرہ کھینچ کر خادم سے فرماتے کہ "اس دائرہ کے اندر انگلی رکھکر کہدے کہ یہاں نہیں ہیں"۔ اس تعریض سے اپنا مقصد بھی حاصل ہوجاتا تھا اور حقیقت میں جھوٹ بھی نہ ہوتا تھا، البتہ صورت جھوٹ کی سی تھی اور

یہی تعریض و توریہ کہلاتا ہے، اس قسم کی تعریضیں معمولی غرض کیلئے بھی جائز ہیں جب کہ کسی کا حق ضائع نہ ہو۔

مزاح و خوش طبعی میں توریہ کا استعمال

ایک بڑھیا عورت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاح کے طور پر یوں فرما دیا تھا کہ "بڑھیا جنت میں کبھی نہ جائے گی"۔ یہ سنکر بڑھیا رونے لگی، کیونکہ جو مطلب ظاہری لفظوں سے سمجھ میں آتا تھا وہ یہی تھا کہ کوئی بڑھیا بھی جنتی نہیں ہے حالانکہ مراد یہ تھی کہ بڑھاپے کی حالت ہی جنت میں نہ جائے گی بلکہ جو بڑھیا بھی جنت میں جائے گی وہ جوان بنکر جائے گی۔ یا مثلاً ایک شخص نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے سواری کے لئے اونٹ مانگا تو آپ نے فرمایا کہ "اچھا ٹھیرو ہم تمہیں اونٹ کا بچہ دیں گے"۔ یہ سنکر سائل نے عرض کہ بچہ لیکر کیا کروں گا۔ اس وقت آپ نے تعریض کا مطلب سمجھا دیا کہ "میاں بڑا اونٹ بھی تو آخر کسی اونٹ سے ہی پیدا ہوا ہے جس اونٹ سے پیدا ہوا اس کا تو بچہ ہی ہے"۔ یا مثلاً ایک شخص سے آپ نے فرمایا کہ "تمہاری آنکھ میں سفیدی ہے"۔ اور ظاہر ہے کہ سب کی آنکھ میں سفیدی ہوتی ہے مگر چونکہ بظاہر یہ مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ پتلی میں عیب اور سفیدی کا مرض ہوتا ہے اس لئے سننے والے کو فکر لاحق ہو کر اچھا خاصا مزاح ہو گیا۔ اس قسم کی تعریضیں بی بی بچوں سے خوش طبعی کے طور پر جائز ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کھانا کھانے کی صلاح کرے اور تمہیں باوجود بھوک ہونے کے کھانا منظور نہ ہو تو یہ ہرگز نہ کہو کہ "مجھے بھوک نہیں ہے"۔ کیونکہ جھوٹ ہو گا بلکہ تعریض کر لو بلکہ یوں کہدو کہ

۱؎ ترمذی ۱۲

۲؎ ترمذی و ابوداؤد ۱۲

۳؎ ابن ابی الدنیا و زبیر بن بکار ۱۲

"میں اس وقت نہ کھاؤں گا آپ نوش فرمایئے" وغیرہ

دوسری آفت غیبت کرنا ہے

حق تعالیٰ فرماتا ہے "کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے"۔ غیبت کرنا گویا[1] مسلمان کا گوشت ہی کھانا ہے، پس اس سے لازمی پرہیز کرو۔ حدیث[2] میں آیا ہے کہ "غیبت زنا سے بھی سخت تر ہے"۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ شب معراج میں میرا گذر ایسی جماعت پر ہوا جو اپنے منہ اپنے ناخن سے نوچ رہے تھے، یہ لوگ غیبت کیا کرتے تھے۔

غیبت کی حقیقت

کسی مسلمان کے پیٹھ پیچھے اس کے متعلق کوئی واقعی بات ایسی ذکر کرنی کہ اگر وہ سُنے تو اس کو ناگوار گذرے غیبت[3] کہلاتی ہے۔ مثلاً کسی کو بے وقوف یا کم عقل کہنا یا کسی کے حسب و نسب میں نقص نکالنا یا کسی کی کسی حرکت یا مکان یا مویشی یا لباس غرض جس شئے سے بھی اس کو تعلق ہو اس کا کوئی عیب ایسا بیان کرنا جس کا سننا اسے ناگوار گزرے خواہ زبان سے ظاہر کی جائے یا رمز و کنایہ سے یا ہاتھ اور آنکھ کے اشارے سے یا نقل اتاری جائے یہ سب غیبت میں داخل ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا[4] نے ایک موقع پر کسی عورت کا ٹھگنا ہونا ہاتھ کے اشارے سے ظاہر کیا اور یوں کہا تھا کہ یا رسول اللہ! وہ عورت جو اتنی سی ہے، اس پر آپ نے فرمایا "اے عائشہ! تم نے اس کی غیبت کی ہے"۔

---

[1] وہ یہ سمجھتا ہے کہ جیسے مردہ کو تکلیف کا احساس نہیں ہوتا ایسے ہی جس کی غیبت کی جائے اسے بھی نہیں ہوا۔ ۱۲

[2] ابن ابی الدنیا، یہ اس لئے کہ زنا حق اللہ ہے اور غیبت حق العبد ۱۲ [3] ابوداؤد، صحیح ۱۲

[4] مضمون حدیث ترمذی ۱۲ [5] ابن ابی الدنیا، معتبر ہے ۱۲

مولویوں کا انداز غیبت

سب سے بدتر غیبت وہ ہے جس کا رواج مقتدار اور دیندار لوگوں میں ہو رہا ہے کیونکہ وہ غیبتیں کرتے ہیں اور پھر اپنے آپ کو نیک سمجھتے ہیں۔ ان کی غیبتیں بھی نرالے انداز کی ہوتی ہیں۔ مثلاً مجمع میں کہنے لگے کہ "اللہ کا شکر ہے اس نے ہم کو امیروں کے دروازوں پر جانے سے بچا رکھا ہے ایسی بے حیائی سے خدا پناہ میں رکھے۔" اس کلمہ سے جو کچھ ان کا مقصود ہے وہ ظاہر ہو کہ امراء کے پاس بیٹھنے والے مولویوں پر طعن کرنا اور ان کو بے حیا کہنا منظور ہوا اور ساتھ ہی اپنی صلاحیت تقویٰ جتا ہے اور ریا کاری کا گناہ کما ہے ہیں۔
اسی طرح مثلاً کہنے لگے کہ "فلاں شخص کی بڑی اچھی حالت ہے اگر اس میں حرص دنیا کا شائبہ نہ ہوتا جس میں ہم مولوی مبتلا ہو جاتے ہیں۔" اس فقرہ سے بھی جو کچھ مقصود ہے وہ ذرا سے تامل سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس کا بے صبرا ہونا ظاہر کرتے ہیں اور اپنی طرف حرص کی نسبت اس نیت سے کرتے ہیں کہ سننے والا ان کو متواضع سمجھے، اور یہی غیبت ہے، ساتھ ہی ریا کاری بھی ہے۔
زیادہ تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ یہ حضرات غیبت کرتے ہیں اور اپنے آپ کو غیبت سے محفوظ اور پارسا سمجھتے ہیں۔ یا مثلاً بول اٹھے "سبحان اللہ بڑے تعجب کی بات ہے" اور جب اتنا کہنے پر لوگوں نے اس بات کے سننے کے شوق میں ان کی جانب کان لگائے تو کہنے لگے "کچھ نہیں فلاں شخص کا خیال آگیا تھا حق تعالیٰ ہمارے اور اس کے حال پر رحم فرمادے اور توبہ کی توفیق دے۔" اس فقرہ کا بھی جو کچھ منشا ہے وہ عقلمند پر مخفی نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا یہ کلمہ ترحم و شفقت یا دعا کی نیت سے نہیں ہوتا جیسا کہ ظاہری الفاظ سے وہم پڑتا ہے۔ اس لئے کہ اگر دعا کرنی مقصود ہوتی تو دل ہی دل میں کیوں نہ کر لیتے

سبحان اللہ کہکر لوگوں کو متوجہ کرنا اور معصیت کا اشارہ کرنا ہی کیا ضروری تھا ؟ یا کسی شخص کا عیب ظاہر کرنا بھی کوئی شفقت یا خیر خواہی کی بات ہے ؟ اسی طرح بعض لوگوں کی عادت ہے کہ غیبت سے منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھائی غیبت مت کیا کرو مگر دل ان کا غیبت کو مکروہ نہیں سمجھتا بلکہ اس نصیحت کرنے سے محض اپنی دینداری اور تقویٰ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی مجمع میں غیبت ہوتی ہے تو ناصح اور پارسا بنکر کہنے لگتے ہیں کہ " میاں غیبت کرنا گناہ ہے اس سے ہم سننے والے بھی گنہگار ہوتے ہیں ، یہ لوگ کہنے کو تو کہہ جاتے ہیں مگر دل ان کا مشتاق رہتا ہے کہ کاش یہ شخص ہماری نصیحت پر عمل نہ کرے جو کچھ کہہ رہا ہے کہے جائے اور ہمیں سناۓ جائے ۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ غیبت سننے کا انتظار بھی ہے اور پھر یوں بھی سمجھتے ہو کہ ہم منع کرکے گناہ سے سبکدوش ہوگئے ۔ یاد رکھو کہ جب تک غیبت کرنے اور سننے کو دل سے برا نہ سمجھو گے تو اس وقت تک غیبت کے گناہ سے ہرگز نہ بچوگے ۔ کیونکہ غیبت کرنے والا اور سننے والا دونوں برابر ہیں اور جس طرح زبان سے غیبت کرنا حرام ہے اسی طرح دل سے غیبت کرنا بھی حرام ہے ۔ البتہ چند صورتوں میں خاص لوگوں کی غیبت کرنا جائز ہے ، جس کی تفصیل ہم بیان کرتے ہیں ۔

مظلوم کو ظالم کی غیبت کرنا جائز ہے

اوّل مظلوم شخص ظالم کی شکایت اگر افسر اعلیٰ تک پہنچائے اور اپنے اوپر سے ظلم رفع کرنے کی نیت سے اس کے مظالم بیان کرے تو گناہ نہیں ہے ۔ البتہ ظالم کے عیوب کا ایسے لوگوں سے بیان کرنا جنہیں اس کو سزا دینے یا مظلوم کے اوپر سے ظلم رفع کرنے کی طاقت نہ ہو بدستور

غیبت میں داخل اور حرام ہے۔ ایک بزرگ کی مجلس میں حجاج بن یوسفؒ کا ذکر آگیا تھا تو انہوں نے یوں فرمایا کہ حق تعالیٰ انصاف کے دن مظلوموں کا بدلہ حجاج سے لے گا اور حجاج کا بدلہ اس کی غیبت کرنے والوں سے لے گا۔ اس لئے کہ بہتیرے آدمی حجاج کے مظالم ایسے آدمیوں کے سامنے بیان کرتے ہیں جن کو حجاج کے کئے ہوئے ظلم رفع کرنے کی طاقت نہیں ہے تو ایسے لوگوں کے سامنے حجاج کی غیبت کس طرح جائز ہو سکتی ہے۔

بدعتی کی غیبت کرنا جائز ہے

دوم۔ کسی شخص سے کوئی بدعت یا خلافِ شرع امر کے رفع کرنے میں مدد لینی ہو یا کسی کو اس کے فتنہ سے بچانا ہو تو اس سے بھی ان بدعتی لوگوں کا حال بیان کرنا اگرچہ ان کی غیبت کرنا ہے مگر جائز ہے۔

فتویٰ کی ضرورت ہو کسی کی غیبت کرنا درست ہے

سوم۔ مفتی سے فتویٰ لینے کیلئے استفسار میں امر واقعی کا اظہار کرنا بھی جائز ہے اگرچہ اس اظہارِ حال میں کسی کی غیبت ہوتی ہو۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! میرا خاوند ابو سفیانؓ اتنا بخیل ہے کہ بقدر کفایت بھی مجھ کو خرچ نہیں دیتا۔"[1] اور ظاہر ہے کہ یہ ابو سفیانؓ کی شکایت اور غیبت تھی مگر چونکہ مفتی شریعتؐ سے استفسار کیا جا رہا ہے کہ اس صورت میں میرے لئے شریعت کیا حکم دیتی ہے لہٰذا اس غیبت میں کچھ حرج نہیں مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس صورت میں بھی یہ غیبت اسی وقت جائز ہے کہ جب اس میں اپنا یا کسی مسلمان کا فائدہ متصور ہو

---

[1] بخاری ومسلم۔ ابو سفیانؓ حضرت معاویہؓ کے والد ہیں اور ہندہؓ انہیں کی زوجہ ہیں ۱۲

دوسرے کو نقصان سے بچانے کیلئے غیبت کرنا جائز ہے

چہارم۔ اگر کوئی شخص کسی سے نکاح یا خرید و فروخت کا معاملہ کرتا ہے اور تم کو علم ہو کہ اس معاملہ میں ناواقفیت کی وجہ سے اس کا نقصان ہے تو اس کو نقصان سے بچانے کیلئے اس کا حال بیان کر دینا بھی جائز ہے۔ اسی طرح قاضی کی عدالت میں کسی گواہ کا کوئی عیب اس نیت سے ظاہر کرنا کہ صاحب حق کو اس مقدمہ میں میرے خاموش رہنے سے نقصان نہ پہنچے جائز ہے۔ البتہ صرف اسی شخص سے ذکر کرنا جائز ہے جس کے نقصان کا اندیشہ ہو یا جس پر فیصلہ اور حکم کا مدار ہو۔

پنجم۔ اگر کوئی شخص ایسے نام ہی سے مشہور ہو جس میں عیب ظاہر ہوتا ہے، مثلاً اعمش (چندھا) اعرج (لنگڑا) تو اس نام سے اس کا پتہ بتلانا غیبت میں داخل نہیں ہے، پھر بھی اگر دوسرا پتہ بتلا دو تو بہتر ہے تاکہ غیبت کی صورت بھی پیدا نہ ہو۔

ششم۔ اگر کسی شخص میں کوئی عیب ایسا کھلا ہوا پایا جاتا ہے کہ لوگ اس کا یہ عیب ظاہر کرتے ہیں تو اسے ناگوار نہیں گزرتا۔ مثلاً مخنث یا ہیجڑا کہ ان کے اس فعل کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو ان کو خیال بھی نہیں ہوتا تو یہ تذکرہ بھی غیبت سے خالی ہے۔ البتہ اگر اس کو ناگوار گزرے تو حرام ہے۔ کیونکہ فاسق کے بھی کسی ایسے گناہ کا ذکر کرنا جو اسے ناگوار گزرے بلا عذر خاص جائز نہیں ہے[1]۔

فصل

نفس کو غیبت سے روکنے کی تدبیر یہ ہے کہ غیبت کی سزا اور نقصان میں

---

[1] بشرطیکہ کھلم کھلا گناہ نہ کرتا ہو ۱۲

غور کرو۔ حدیث میں آیا ہے کہ "آگ جو گھاس میں اثر کرتی ہے غیبت اس سے جلد اور زیادہ اثر مسلمان کی نیکیوں میں کرتی ہے" یعنی غیبت کرنے سے نیک اعمال جل جاتے ہیں۔ اب ذرا سوچو کہ جب کوئی نیکوکار شخص جس نے دنیا میں مشقتیں اٹھا اٹھا کر نیکیاں جمع کی تھیں جب قیامت کے دن اپنے نامۂ اعمال کورے دیکھے گا اور اس کو معلوم ہوگا کہ غیبت کی وجہ سے اس کی نیکیاں اس شخص کے نامۂ اعمال میں لکھ دی گئی ہیں، جس کی وہ غیبت کیا کرتا تھا، تو کس قدر حسرت و افسوس کرے گا۔

مسلمان کو سوچنے کیلئے اپنے ہی نفس کے عیوب بہتیرے ہیں، اس لئے مناسب ہے کہ جب فرصت ملے اپنی حالت پر نظر ڈالو اور جو عیب پاؤ اس کے رفع کرنے میں مصروف ہو جاؤ کہ دوسروں کے عیوب دیکھنے کا موقع ہی نہ آئے، اور یوں سمجھو کہ تمہارا ذرا سا عیب جتنا تم کو نقصان پہنچائے گا دوسرے کا بڑا عیب بھی تم کو اس قدر نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اور اگر تمہیں اپنا عیب نظر نہ آئے تو یہ خود ایسا عیب ہے جس کی برابر کوئی عیب نہیں۔ کیونکہ کوئی انسان عیب سے خالی نہیں ہے۔ پس اپنے آپ کو بے عیب سمجھنا تو بڑا سخت عیب ہے۔ اس لئے اول اس کا علاج کرو اور اس کے بعد جو عیب نظر آتے جائیں ان کی تدبیر کرتے رہو۔ اور اگر اتفاقاً اس پر بھی کسی شخص کی غیبت ہو جائے تو اللہ سے توبہ جدا کرو اور اس شخص کے پاس جا کر غیبت کی خطا جدا معاف کراؤ اور اگر اس سے نہ مل سکو تو اس کیلئے دعائے مغفرت مانگو اور خیرات کر کے اس کی روح کو ایصال ثواب کرو۔ غرض چونکہ تم نے غیبت کر کے اپنے مسلمان بھائی پر ظلم کیا ہے اس لئے جس طرح ممکن ہو اس ظلم کی جلد تلافی کرو۔

تیسری آفت فضول جھگڑا کرنا ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں[1] کہ جو مسلمان باوجود حق پر ہونے کے جھگڑے سے دست بردار ہو جائے تو اس کیلئے اعلیٰ جنت میں محل تیار ہوگا۔" یہ بالکل صحیح ہے کہ برسر حق ہو کر خاموش ہو بیٹھنا بہت دشوار ہے، اور اسی لئے حق پر ہو کر جھگڑے سے علیحدہ ہو جانا ایمان کا کمال شمار کیا گیا ہے۔

جھگڑے اور نزاع کی حقیقت

جان لو کہ کسی بات پر اعتراض کرنا اور اس کے لفظ یا معنیٰ میں غلطی اور نقص نکالنا جھگڑا کہلاتا ہے۔ اور اکثر یہ دو وجہ سے ہوتا ہے یعنی یا تو کبر کی بناء پر کہ اپنی بڑائی اور لسانی یا تیز زبانی کا اظہار مقصود ہوتا ہے اور یا دوسرے شخص کو چپ کرنے اور عاجز بنا دینے کا شوق ہوتا ہے۔ اس لئے مسلمان کو چاہئے کہ جو بات واقعی اور حق ہو تو اس کو تسلیم کرلے اور جتنی خلاف واقع یا غلط ہو تو اس پر سکوت اختیار کرلے۔ البتہ اگر اس غلطی کے ظاہر کرنے میں کوئی دینی فائدہ ہو تو اس وقت سکوت کرنا جائز نہیں ہے مگر پھر بھی اس کا ضرور خیال رکھے کہ جو کچھ بیان کرے وہ نرمی اور سہولت سے بیان کرے تکبر اور سختی کے ساتھ نہ کہے۔

چوتھی آفت مذاق اور دل لگی کرنا اور زیادہ ہنسنا ہنسانا ہے اس سے قلب مردہ ہو جاتا ہے اور ہیبت و وقار جاتا رہتا ہے۔ ایسا شخص لوگوں کی نظروں سے گر جاتا ہے، اور بسا اوقات دوسروں کو اس کے ساتھ کینہ و عداوت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ نورِ معرفت میں تاریکی آجاتی ہے اور تحت[2] الثریٰ میں پھینک دیا جاتا ہے۔

---

[1] ترمذی وابوداؤد وابن ماجہ ۱۲ [2] زمین کے نیچے ۱۲

شائستہ مزاح جائز ہے

البتہ تھوڑے مزاح میں کچھ مضائقہ نہیں، خصوصاً اگر بیوی بچوں کا دل خوش کرنے کو ہو تو سنت ہے۔ کیونکہ ایسا مزاح رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول ہے، مگر وہ مزاح درحقیقت واقعی بات ہوتی تھی کسی قسم کا جھوٹ نہ ہوتا تھا۔ مثلاً ایک بڑھیا سے آپ نے فرمایا کہ "جنت میں بوڑھی عورت کوئی نہ جائے گی" اس کا مطلب یہ تھا کہ جنت میں جو بھی عورت جائے گی وہ جوان ہو کر جائے گی۔ یا مثلاً حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کے لڑکے تھے اور انہوں نے لال پال رکھا تھا اتفاق سے لال مر گیا تو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کہو جی ابو عمیر تمہارا لال کیا ہوا؟" اسی طرح ایک دفعہ حضرت صہیب چھوہارا کھا رہے تھے اور ان کی ایک آنکھ دکھتی تھی تو آپ نے فرمایا "کیوں صاحب آنکھ تو دکھتی ہے اور چھوہارا کھا رہے ہو" انہوں نے مزاحاً جواب دیا کہ یا رسول اللہ دوسری طرف سے کھا رہا ہوں، یعنی جس طرف کی آنکھ دکھتی ہے اس ڈاڑھ سے نہیں کھاتا۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ محض دلجوئی اور خوش طبعی کے طور پر دوڑے بھی ہیں۔ غرض ایسے مزاح میں کچھ حرج نہیں البتہ اس کی عادت ڈالنی اچھی نہیں ہے۔

پانچویں آفت مدح کرنا ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا اکثر واعظوں، اور دنیا دار مسلمانوں کی عادت ہے کہ مالدار اور صاحب جاہ و حشم لوگوں کی تعریفیں کرتے، ان کی شان میں مدحیہ قصیدے لکھتے اور ان کو نذرانے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس میں چار خرابیاں مداح کے حق میں ہیں اور

---

۱ ہنسی کی بات ۱۲ ۲ جیسے کہ ص۱۵ پر گذرا ۱۲ ۳ بخاری و مسلم و ترمذی ۱۲
۴ ابن ماجہ، سب راوی ثقہ ہیں ۱۲ ۵ ابوداؤد ۱۲ ۶ بہت تعریف کرنے والا ۱۲

دو برائیاں ممدوح کے حق میں ۔

مداح کے حق میں مدح سرائی کا نقصان :

مدح خواں کی خرابیاں تو یہ ہیں :-

اول ۔ ایسی باتیں بیان کی جاتی ہیں جو واقع کے خلاف ہوتی ہیں اور جن کا ممدوح میں نشان بھی نہیں ہوتا ۔ ظاہر ہے کہ یہ صریح جھوٹ اور کبیرہ گناہ ہے ۔

دوم ۔ محبت کا لمبا چوڑا اظہار کرتے ہیں حالانکہ دل میں خاک بھی محبت نہیں ہوتی ، اور یہ صریح ریا اور نفاق ہے جو گناہ و حرام ہے ۔

سوم ۔ اٹکل کے تیر چلائے جاتے ہیں اور جو بات یقینی طور پر معلوم نہیں محض تخمینہ و گمان کی بنا پر ان کو واقعی ظاہر کیا جاتا ہے ۔ مثلاً یہ کہ آپ بڑے متقی ہیں ، نہایت منصف ہیں ۔ حالانکہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کسی کی مدح کرنی ہو تو یوں کہا کرے کہ میرا گمان یہ ہے کہ آپ ایسے ہیں ، کیونکہ ظنی باتوں کو واقعی بنانا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے ۔

چہارم ۔ اگر ظالم اور فاسق کی مدح کی جاتی ہے اور وہ اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے تو فاسق کو خوش کرنے والا مداح بھی فاسق اور نافرمان ہوا حدیث میں آیا ہے کہ فاسق کی تعریف سے اللہ تعالیٰ کا عرش کانپ اٹھتا ہے ۔ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فاسق کی زندگی و عمر کی زیادتی کی کرنے والا شخص بھی فاسق ہے ، کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ فسق و فجور قائم اور دنیا میں مدت

تک جس کی تعریف کی جائے ۔ ۔ اٹکل ۔

بخاری و مسلم ، مگر جب کہے کہ واقع میں ایسا سمجھتا بھی ہو ، ورنہ جھوٹ ہوگا ۔

ابن ابی الدنیا و بیہقی و ابو یعلیٰ ۔

تک باقی رہے۔ ظالم اور فاسق شخص کی تو مذمت کرنی چاہئے تاکہ گھبرا کر ظلم و معصیت چھوڑ دے، نہ کہ تعریف۔

مدح سرائی کا ممدوح کو نقصان

اور ممدوح کو جو دو نقصان پہنچتے ہیں وہ یہ ہیں :-

اوّل یہ کہ ممدوح مغرور ہو جاتا ہے اور اپنے نفس کو قابل تعریف سمجھنے لگتا ہے، حالانکہ یہ اس کی ہلاکت و تباہی کی جڑ ہے۔ حدیث[1] میں آیا ہے کہ ایک شخص نے مجمع میں اپنے دوست کی تعریف کی تو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تم نے اپنے دوست کی گردن کاٹ دی" مطلب یہ ہے کہ اس کے نفس میں خود پسندی اور بڑائی پیدا کر کے اس کو ہلاک کر دیا۔

دوم۔ اپنی تعریف سنکر پھولتا اور اعمال خیر میں سست پڑ جاتا ہے۔ حدیث[2] میں آیا ہے کہ مسلمان بھائی کو کند چھری سے ذبح کر دینا اس سے بہتر ہے کہ اس کے منہ پر اس کی تعریف کی جائے" کیونکہ قتل سے تو دنیا ہی کی زندگی تلف ہو گی اور ان بُرے نتیجوں سے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، آخرت کی باعظمت زندگی برباد ہو جائے گی۔ البتہ ان مضرتوں کا اندیشہ نہ ہو تو تعریف میں کچھ حرج بھی نہیں ہے، بلکہ بعض اوقات مستحب اور باعث اجر ہے، چنانچہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کی مدح فرمائی ہے مثلاً آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے[3] ہیں کہ "تمام دنیا[4] کے ایمان کو ابوبکرؓ کے ایمان کے ساتھ وزن کیا جائے تو ابوبکر ہی کا ایمان وزنی رہے گا" نیز فرماتے[5] ہیں کہ "اے عمر! اگر میں نبی بنا کر نہ بھیجا جاتا تو ضرور تم کو نبی بنایا جاتا"

---

[1] بخاری و مسلم ۱۲ [2] عراقی کہتے ہیں۔ ملی نہیں ۱۲ [3] ابن عدی ۱۲ [4] انبیاء کے علاوہ، کیونکہ ہر ہر نبی کا ایمان سارے ولیوں سے بھی بڑھا ہوا ہے ۱۲ [5] ترمذی حسن ۱۲

گویا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں نبوت و رسالت کی قابلیت کا انھیں سے اظہار فرمایا۔ پس چونکہ صحابہ میں خود پسندی اور کوتاہیٔ عمل کا اندیشہ نہ تھا اس لئے ان میں نشاط پیدا کرنے کیلئے یہ مدح مستحب تھی کہ ان کی طاعات میں ترقی کا وسیلہ تھی۔

فصل

مدح سے تکبر پیدا ہونے کا علاج

اگر کسی شخص کی کوئی مدح کرے تو اس کو چاہیئے کہ اپنے اعمال اور خطرات و وساوس کا دھیان کرے اور سوچے کہ خدا جانے میرا انجام کس حالت پر ہونا ہے؟ واقعی یہ خوبیاں جو یہ شخص بیان کررہا ہے اگر مجھ میں موجود بھی ہیں تو ابھی ان کا کیا اعتبار؟ نیز اپنی باطنی بیماریوں اور عیوب پر نظر کرے اور خیال کرے کہ یہ پوشیدہ عیب ایسے ہیں کہ اگر اس مداح کو معلوم ہو جائیں تو میری مدح کبھی نہ کرے۔ غرض مسلمان کو چاہیئے کہ اپنی تعریف سنکر خوش نہ ہو بلکہ اس کو دل سے مکروہ سمجھے۔ اسی کی جانب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اشارہ فرماتے ہیں کہ، "مداح کے منہ میں مٹی بھردو"[1] حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جب مدح ہوتی تھی تو یوں دعا مانگتے پھرتے تھے کہ بار الٰہا میرے جو گناہ انھیں معلوم نہیں ہیں وہ بخش دیجئے اور جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس کا مجھ سے مواخذہ نہ کیجئے اور مجھے ان کے گمانوں سے بہتر بنا دیجئے میں جیسا ہوں آپ ہی خوب جانتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے۔

[1] مسلم ۱۲

تیسری اصل

غصّہ کا بیان

غصہ آگ کا شعلہ ہے اس کا زور توڑنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ[1] "کسی شخص کے پچھاڑنے سے آدمی پہلوان نہیں ہوتا بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس کو پچھاڑے۔"

یاد رکھو کہ جس طرح تلخ ایلوے سے میٹھا شہد بگڑ جاتا ہے اسی طرح غصہ سے ایمان بگڑ جاتا ہے۔ غصہ بری بلا ہے۔ یہی مار پیٹ، گالی اور زبان درازی کھلے گناہ کرا دیتا ہے۔ اور اسی سے کینہ، حسد، بدگمانی اور افشائے راز[2] وہتک[3] عزت کے عزم کی باطنی معصیتیں ہوتی ہیں۔ غصہ کی وجہ سے مسلمان کو اپنے مسلمان بھائی کا خوش کرنا ناگوار گزرتا ہے، اور اس کا رنج و تکلیف میں رہنا پسند آتا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ سب تباہ کن معصیتیں ہیں۔

فصل

غصہ کا علاج اس کا علاج دو طرح کرنا چاہیئے:

اوّل تو ریاضت اور مجاہدہ سے اس کو توڑنا چاہیئے۔ مگر توڑنے

---

[1] حدیث طبرانی وبیہقی ۱۲ [2] راز ظاہر کرنا ۱۲ [3] عزت کو رسوا کرنا ۱۲

سے مقصود یہ نہیں ہے کہ غصہ کا مادہ ہی نہ رہے اس لئے کہ اگر مادہ ہی جاتا رہے گا تو کفار سے جنگ اور جہاد کیونکر ہوگا، اور فساق وفجار اور مبتدعین کی خلاف شرع باتوں پر ناگواری کس طرح ہوگی، ناجائز افعال دیکھکر غصہ آنا تو ضروری اور شرع کا عین مقصود ہے، لہٰذا غصہ کے توڑنے اور ریاضت کرنے سے یہ مراد ہے کہ اس کو مہذب اور عقل وشرع کا تابعدار بنالیا جائے اور ایسا کردیا جائے جیسا کہ شکاری کتا ہوتا ہے کہ جب اس کا مالک اس کو بھگاتا ہے تو وہ بھاگتا ہے اور جب وہ کسی پر حملہ کراتا ہے تو حملہ کرتا ہے ورنہ چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ یہی حالت غصہ کی ہونی چاہئے، اگر شریعت حکم دے اور غصہ کو بھڑکائے تو فوراً بھڑک اٹھے اور اپنا کام کرے ورنہ چپ رہے، اور بے حس وحرکت پڑا رہے۔

غصہ کو مہذب اور مسخر بنانے کی ترکیب

غصہ کو ایسا مہذب بنانے کی تدبیریں یہ ہیں کہ نفس کی باگ روکو، حلم وبرداشت کی عادت ڈالو، اور جب کوئی غصہ پیدا کرنے والا واقعہ پیش آئے تو نفس پر جبر کیا کرو اور غصہ کو بھڑکنے نہ دو۔ پس یہی وہ ریاضت ہے جس سے غصہ مطیع وفرمانبردار بن جائے گا۔

دوم۔ غصہ کے جوش کے وقت ضبط سے کام لو اور اس کو پی جاؤ۔ اور اس کا ایک علاج علمی ہے اور ایک عملی۔

علمی علاج تو یہ ہے کہ غصہ کے وقت سوچو کہ غصہ کیوں آتا ہے ظاہر ہے کہ اس کا سبب حکم خداوندی میں دخیل ہونا اور دست اندازی کرنا ہے کیونکہ غصہ کرنے والے کا مطلب یہ ہے کہ یہ کام میری مرضی کے موافق کیوں نہ ہوا، اور ارادۂ خداوندی کے موافق کیوں ہوا؟ اب تم ہی بتاؤ کہ یہ حماقت

ہے یا نہیں؟ کیا حق تعالیٰ کے ارادہ کو اپنے ارادہ اور منشاء کے تابع بنانا چاہتے ہو؟ یاد رکھو کہ خدا کے حکم کے بغیر ذرہ نہیں ہل سکتا پھر تم اس میں دخل دینے والے اور اس کو ناگوار سمجھنے والے کون؟

دوسرے اس بات کا خیال کرو کہ میرا اس شخص پر کیا حق ہے؟ اور خدا کا مجھ پر کیا حق ہے؟ اور پھر خدا کا تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہے اور تم اس شخص کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہتے ہو؟ ظاہر ہے کہ تم جس شخص پر غصہ کر رہے ہو اس کے مالک نہیں ہو، خالق نہیں ہو، رزق تم اس کو نہیں دیتے، حیات تمہاری دی ہوئی نہیں ہے۔ اور خداوند تعالیٰ کے تم پر ہر قسم کے حقوق ہیں کہ تم ہر طرح سے اس کے محکوم و مملوک ہو اور احسان مند ہو، بایں ہمہ تم اپنے مالک حقیقی کی بیسیوں خطائیں اور نافرمانیاں رات دن کرتے ہو اور باوجود اس احسان و استحقاق کے وہ سب کو برداشت کرتا ہے۔ اگر ایک قصور پر بھی سزا دے تو کہیں تمہارا ٹھکانا نہ ہے۔ اور تمہارا حالانکہ کسی پر بھی حق نہیں ہے پھر یہ حالت ہے کہ ذرا سی خلاف طبع حرکت پر غصہ سے باہر ہوئے جاتے ہو اور اس کو دنیا سے ناپید کر دینے کیلئے تیار ہو، کیا تمہاری اطاعت و رضامندی خدا کی عبادت و حکم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

عملی علاج یہ ہے کہ جب غصہ[1] آئے تو اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھو کیونکہ غصہ شیطانی اثر ہے اور شیطان کے شر سے جب پناہ مانگی جائے گی تو وہ اثر زائل ہو جائے گا۔ نیز اپنی حالت[2] بدل دو۔ یعنی اگر کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ اور بیٹھے ہو تو لیٹ جاؤ اور اگر اس سے

---

[1] بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے ۱۲ [2] ابوداؤد و احمد ۱۲

بھی غصہ ٹھنڈا نہ ہو تو وضو کر لو اور اپنا رخسارہ زمین پر رکھ دو تاکہ تکبر ٹوٹے اور عزت والا عضو جب زمین پر رکھا جائے تو نفس مرے۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے " اللہ کے نزدیک سب سے بہتر گھونٹ جو مسلمان پیتا ہے وہ غصہ کا گھونٹ ہے "

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ " جس مسلمان کو اپنے بی بی بچوں یا ایسے لوگوں پر غصہ آئے جن پر اپنا غصہ جاری کر سکتا اور سزا دے سکتا ہے اور وہ اس کو ضبط کر جائے اور تحمل سے کام لے تو حق تعالیٰ اس کا قلب امن اور ایمان سے لبریز فرما دے گا "

یاد رکھو کہ تحمل کی بدولت مسلمان شب بیدار، روزہ دار، عابد و زاہد کا مرتبہ پالیتا ہے۔

۱؎ ابوداؤد واحمد ۱۲ ۲؎ مضمون قریب قریب ترمذی میں

۳؎ ابن ابی الدنیا ۱۲ ۴؎ ابوداؤد ۱۲

چوتھی اصل

حسد کا بیان

حسد کی حقیقت حسد کے یہ معنی ہیں کہ "کسی شخص کو فارغ البالی یا عیش و آرام میں دیکھ کر کلپے اور اس کی نعمت کے جاتے رہنے کو پسند کرے"۔ حسد کرنا حرام ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا[1] ہے کہ "میرے بندے پر نعمت دیکھ کر حسد کرنے والا گویا میری اس تقسیم سے ناراض ہے، جو میں نے اپنے بندوں میں فرمائی ہے"۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "حسد نیکیوں کو اس طرح جلا دیتا ہے جس طرح آگ[2] سوکھی لکڑیوں کو جلا دیتی ہے"۔ البتہ ایسے شخص پر حسد کرنا جائز ہے جو اللہ کی دی ہوئی نعمت کو ظلم و معصیت میں خرچ کر رہا ہو۔ مثلاً مالدار ہو اور شراب خواری و زناکاری میں اڑا رہا ہو۔ لہذا ایسے شخص سے مال چھن جانے کی آرزو کرنا گناہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں درحقیقت مال کی نعمت چھن جانے کی تمنا نہیں ہے، بلکہ اس فحش و معصیت کے بند ہو جانے کی آرزو ہے۔ اور اس کی شناخت یہ ہے کہ اگر مثلاً وہ شخص اس معصیت کو چھوڑ دے تو اب اس نعمت کے

---

[1] یہ آیت نہیں بلکہ حضرت زکریا علیہ السلام کا قول ہے کہ حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں۔

[2] ابن ماجہ ۱۲

جاتے رہنے کی آرزو بھی نہ رہے۔

یاد رکھو کہ عموماً حسد کا باعث یا تو نخوت[1] وغرور ہوتا ہے اور یا عداوت[2] وخباثت نفس کہ بلا وجہ خدا کی نعمت میں بخل کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ جس طرح میں کسی کو کچھ نہیں دیتا۔ اسی طرح حق تعالیٰ بھی دوسرے کو کچھ نہ دے۔

غِبطہ جائز ہے البتہ دوسرے کو نعمت میں دیکھکر حرص کرنا اور چاہنا کہ اس کے پاس بھی یہ نعمت رہے اور مجھے بھی ایسی ہی حاصل ہو جائے غبطہ کہلاتا ہے، اور غبطہ شرعاً جائز ہے۔ کیونکہ غبطہ میں کسی کی نعمت کا ازالہ[3] مقصود نہیں ہوتا بلکہ اسی جیسی نعمت کے اپنے آپ کو حاصل ہو جانے کی تمنا ہوتی ہے، اور اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

فصل

حسد قلبی مرض ہے۔ اس کا علاج ایک علمی ہے اور ایک عملی۔

حسد کا علمی علاج علمی علاج تو یہ ہے کہ حاسد کو جاننا چاہئے کہ اس کا حسد اسی کو نقصان پہنچا رہا ہے، اس محسود[4] کا جس پر حسد کر رہا ہے کچھ بھی نہیں بگڑتا، بلکہ اس کا تو اور نفع ہے کہ حاسد کی نیکیاں مفت میں اس کے ہاتھ آرہی ہیں، برخلاف حاسد کے کہ اس کے دین کا بھی نقصان ہے اور دنیا کا بھی۔

دین کا نقصان تو یہ ہے کہ اس کے کیے ہوئے اعمال حبط[5] ہوئے جاتے ہوئے جاتے رہیں نیکیاں چلی جاتی ہیں اور حق تعالیٰ کے غصے کا نشانہ بنا ہوا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے وسیع خزانہ کی بے شمار نعمتوں میں بخل کرتا

---

[1] تکبر ۱۲ [2] دور کرنا ۱۲ [3] حسد کیا ہوا ۱۲ [4] [5] ساقط ۱۲

اور دوسرے پر انعام ہونا چاہتا ہی نہیں۔

اور دنیا کا نقصان یہ ہے کہ حاسد ہمیشہ رنج و غم میں مبتلا اور اسی فکر میں گھلتا رہتا ہے کہ کسی طرح فلاں شخص کو ذلت و افلاس نصیب ہو، پس جس پر حسد ہے اس کیلئے بھی خوشی کا مقام ہے کہ مجھے رنج پہنچانا چاہتے تھے اور خود ہر وقت کے رنج میں مبتلا ہو گئے۔ لہٰذا اس کے حسد سے اس کی تو مراد پوری ہو گئی، اور حسد کرنے والا بڑے خسارہ میں رہا۔ تمہیں سوچو کہ تمہارے حسد کرنے سے محسود کو کیا نقصان ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس کی نعمت میں کسی قسم کی بھی کمی نہیں آئی۔ بلکہ اور نفع ہوا کہ تمہاری نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں درج ہو گئیں۔ کیسا الٹا قصہ ہوا حاسد چاہتا تو یہ تھا کہ محسود دنیا میں تنگ دست ہو جائے اور نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی نعمتیں بحال رہیں اور دین کی نعمت نفع میں ملی۔ اور حاسد نے عذابِ آخرت بھی سر رکھا اور اپنی قناعت و آرام کی زندگی کو رخصت کر کے ہر وقت کی خلش اور دنیوی کوفت خریدی۔ یہ تو ایسی صورت ہو گئی کہ دشمن کے ڈھیلا مارنا چاہتا تھا اور وہ اپنے ہی آلگا، کہ جس سے اپنی آنکھ پھوٹ گئی اور طرہ یہ کہ دشمن یعنی شیطان کو بھی ہنسنے کا موقع مل گیا خصوصاً اگر کسی عالم یا متقی پر حسد کیا جائے کہ اس کا علم و تقویٰ زائل ہونے کی تمنا ہو تو یہ حسد سب سے زیادہ برا اور بدتر ہے۔

حسد کا عملی علاج

عملی علاج حسد کا یہ ہے کہ حسد کا مقصود تو یہ ہے کہ تم محسود کی عیب جوئی کرو اور رنج و غم کے گھونٹ رات دن پیو، لہٰذا تم نفس پر جبر کرو اور قصداً اس کے منشار کی مخالفت کر کے اس کی ضد پر عمل کرو، یعنی محسود کی تعریفیں بیان کرو اور اس کے سامنے تواضع اور اس نعمت پر خوشی و مسرت کا اظہار کرو جو

اسے مرحمت ہوئی ہے، جب چند روز بہ تکلف ایسا کروگے تو محسود کے
ساتھ تم کو محبت پیدا ہو جائے گی ۔ اور جب عداوت جاتی رہے گی تو حسد
بھی نہ رہے گا ، اور اس رنج و غم سے تم کو نجات مل جائے گی جس میں حسد کی
وجہ سے تم مبتلا ہو رہے تھے ۔

فصل

شاید تم کو یہ شبہ لاحق ہو کہ دوست میں اور دشمن میں فرق ہونا تو
انسان کا طبعی امر ہے ، اور اپنی اختیاری بات نہیں کہ جس طرح اپنے دوست
کو راحت میں دیکھ کر خوشی ہوتی ہے ، اسی طرح دشمن کو بھی راحت میں دیکھ
کر مسرت ہوا کرے ، اور جب اختیاری بات نہیں ہے تو انسان اس کا
مکلف بھی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا میں کہتا ہوں کہ بیشک اتنی بات صحیح ہے اور
اگر اسی حد تک بات رہے تو گناہ بھی نہیں ۔ لیکن اس کے ساتھ جتنی بات
اختیاری ہے اس سے بچنے کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور وہ دو امر ہیں :

ایک یہ کہ یہ اپنی زبان اور اعضاء اور افعال اختیاریہ میں حسد کا اثر
مطلق نہ ہونے دو ۔ بلکہ نفس پر جبر کر کے اس کی ضد پر عمل کرو جیسا کہ ہم
اوپر بیان کر چکے ہیں ۔

دوئم یہ کہ نفس میں جو حسد کا مادہ موجود ہے جو اللہ کی نعمتوں کو بندوں
پر دیکھنی پسند نہیں کرتا اس کو دل سے مکروہ سمجھو اور یہ خیال کرو کہ یہ
خواہش دین کو برباد کرنے والی ہے ۔

ان دو باتوں کے بعد اگر طبعی امر باقی رہے یعنی دل بے اختیار چاہے
کہ دوست خوش حال رہیں اور دشمن پامال ہوں تو اب اس کا خیال نہ کرو
کیونکہ جب اس کے ازالہ پر تم کو قدرت نہیں ہے تو اس پر گناہ بھی نہیں

ہوگا، مگر دل کی ناگواری ضروری بات ہے۔ اور اس کی علامت یہ ہو کہ اگر محسود کی نعمت کے زائل کرنے پر تم کو قدرت حاصل ہو جائے تو اپنی طبیعت سے تمہاری خواہش یہی ہو کہ کاش اس کی نعمت چھن جائے مگر اپنے ہاتھ پاؤں سے ایسا انتظام نہ کرو یا مثلاً محسود کی نعمت کے قائم رہنے یا بڑھانے میں مدد دے سکتے ہو تو باوجود اس کے ناگوار گذرنے کے اس کو مدد دو، اگر ایسی حالت ہو جائے تو سمجھ لو کہ جہاں تک اختیار اور قابو ہے یہاں تک ہم نے خدا کے حکم پر عمل کر لیا اور سبکدوش ہو گئے۔ ایسی صورت میں طبعی بات کا دور کرنا اپنے قبضہ میں نہیں ہے۔ اور موجود تو ہے، مگر چونکہ اختیاری کاموں نے اس کو چھپا اور دبا لیا ہے اس لئے گویا کالمعدوم ہو گئی ہے، اور یہ بھی یاد رکھو کہ جن کی نظر عالم دنیا سے اٹھ جاتی ہے تو وہ سمجھ جاتے ہیں کہ دنیا بھی ناپائدار ہے اور اس کی تمام نعمتیں بھی فنا ہونے والی ہیں، پس اگر اپنا دشمن فراغی یا وسعت و آرام ہی میں ہے تو کتنے دن کیلئے۔ اگر اعمال کے سبب مرنے کے بعد دوزخ میں جانے والا ہے تو اس کم نصیب کو اس چند روزہ آرام سے کیا نفع؟ اگر جنتی ہے تو جنت کی نعمتوں کو اس ناپائدار نعمت سے کیا مناسبت؟ پس حسد کرنا اور دشمن کو دنیا کی کسی خوشی میں دیکھ کر جلنا بہر حال محض بے سود اور عبث ہوا۔ ساری مخلوق خدا کی پیدا کی ہوئی ہے اور سارے آدمی اپنے پیارے خدا کے غلام ہیں، پس محبوب کی طرف سے جو انعام ہوں ان کے اثر اس کے غلاموں پر بھی ظاہر ہی ہونے چاہئیں لہٰذا جس کسی پر بھی تمہارے قدرت والے محبوب کی عطاؤں کے آثار ظاہر ہوں، تمہارے لئے خوش ہونے کا مقام ہے۔ نہ کہ رنج و حسد کرنے کا۔

پانچویں اصل

بُخل اور محبّتِ مال کا بیان

بُخل بھی ایک بڑا مہلک مرض ہے حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "جو لوگ اللہ کی دی ہوئی نعمت میں بخل کرتے ہیں وہ اس کو اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں بلکہ یہ ان کے لئے نہایت بُرا ہے کیونکہ جس میں بخل کریں گے اس کا طوق بنا کر ان کے گلے میں ڈالا جائے گا" اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ "اپنے آپ کو بچاؤ بخل سے کہ اس نے پہلی امتوں کو ہلاک کر دیا ہے" پس مسلمان کو شایانِ شان نہیں کہ بخل کرے اور جہنم میں جائے۔ اور چونکہ بخل درحقیقت مال کی محبت ہے۔ اور مال کی محبت قلب کو دنیا کی طرف متوجہ کر دیتی ہے جس سے اللہ کی محبت کا علاقہ ضعیف و کمزور ہو جاتا ہے اور بخیل مرتے وقت حسرت بھری نظروں سے اپنا جمع کیا ہوا محبوب مال دیکھتا اور جبراً قہراً آخرت کا سفر کرتا ہے، اس لئے اس کو خالق جل جلالہٗ کی ملاقات محبوب نہیں ہوتی۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ "جو شخص مرتے وقت اللہ تعالیٰ کی ملاقات پسند نہ کرے وہ جہنمی ہے" جس شخص کے پاس مال نہ ہو وہ بخیل تو نہیں ہے مگر یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے قلب میں مال کی محبت ہو اور اس آرزو میں ہو کہ کاش مالدار ہو جائے۔ اسی طرح

لہ ابوداؤد و نسائی سنن کبریٰ میں ابن حبان ۱۲ ٹہ لگاؤ تعلق ۱۲

بعض اہلِ ثروت سخی ہوتے ہیں مگر چونکہ سخاوت سے ان کو محض اپنی شہرت اور مدح مقصود ہوتی ہے اس لئے ان پر اگرچہ بخل کی تعریف صادق نہیں آتی مگر محبتِ مال کا مضمون ضرور صادق آتا ہے۔ پس بخل کے علاج کے ساتھ حبِ مال کا بھی علاج ہو جانا چاہئے۔ یاد رکھو کہ مال کی محبت خدا کے ذکر سے غافل بنا دیتی ہے۔ یہ مال مسلمان کیلئے بڑا فتنہ ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "جب انسان مرتا ہے تو فرشتے پوچھتے ہیں کہ کیا چھوڑا؟ پس اگر زندگی میں مال خرچ کر کے آخرت کا کچھ ذخیرہ جمع کر لیا تھا تو مرتے وقت خوش ہوگا کہ بھیجا ہوا مال وصول کرنے کا وقت آگیا، ورنہ رنجیدہ ہوگا اور اس پر مرنا شاق گزرے گا۔ روپیہ کا بندہ تباہ ہو، نگوں سار ہو، اس کو کانٹا چبھے تو نکالنے والا نہ ملے۔" یہ حدیث کا مضمون ہے، اب تم ہی سوچو کہ جس کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بد دعا دیں اس کا کہاں ٹھکانہ؟

فصل

مال مطلقاً مذموم نہیں ہے، اور مذموم کیسے ہو سکتا ہے جبکہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے کہ ساری مخلوق جسم کے گھوڑے پر سوار ہو کر سفرِ آخرت طے کر رہی ہو اور سواری کو اس مسافر خانۂ دنیا میں گھاس دانہ کی ضرورت ہے اور وہ مال کے بغیر نہیں مل سکتا کیونکہ جب تک پیٹ نہ بھرے اس وقت تک عبادت نہیں ہو سکتی لہذا قوت و حیات قائم رکھنے کی مقدار کے موافق حاصل کرنا ضروری ہوا۔

لہ ترمذی۔ ضعیف

ضرورت سے زائد مال کے مضر ہونے کے وجوہات

البتہ اس سے زیادہ مال و متاع ہلاکت کا سامان ہے کیونکہ مسافر بقدر ضرورت ہی توشہ اپنے ساتھ رکھتا ہے اور جہاں بوجہ زیادہ ہوا تو سفر کرنا بھی اس کو مشکل پڑ جاتا ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "اے عائشہ! مجھ سے ملنا چاہو تو اتنی ہی دنیا پر قناعت کرو جتنا مسافر کا توشہ ہوتا ہے کہ جب تک پیوند نہ لگ جایا کرے اس وقت تک کرتہ نہ اتارا کرو۔ الٰہی! محمد کے متعلقین کی معاش بقدر کفایت ہی رکھیو، اور زیادہ نہ دیجیو، ورنہ ہلاک ہو جائیں گے"۔

یاد رکھو کہ ضرورت سے زیادہ مال جمع کرنا تین وجہ سے مضر ہے:

اوّل:۔ مال کی وجہ سے معصیت پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے اور قدرت کے ہوتے ہوئے صبر کرنا اور گناہ سے بچنا بہت دشوار ہے اور جب ضرورت سے زیادہ مال ہی نہ ہوگا تو ظاہر ہے کہ گناہ پورا نہ ہو سکے گا۔

دوم:۔ اگر متمول شخص عابد و زاہد بھی ہو اور مباح ہی لذتوں میں پیسہ خرچ کیا تب بھی اتنا نقصان اس کو ضرور پہنچا کہ اس کے جسم نے چونکہ لذیذ نعمتوں سے پرورش پائی اس لئے لذتوں کا خوگر ہو گیا، اور مال کو چونکہ پائداری نہیں ہے، اس لئے اپنی عادتوں کو نباہنے کو مخلوق کا محتاج بنا رہے گا۔ اور کیا عجب ہے کہ ظالموں اور فاسقوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا یا ان کی چاپلوسی کرنی پڑے تاکہ جن لذتوں کا عادی ہو گیا ہے وہ مرتے دم تک حاصل ہوتی رہیں، اور جب یہ ہوا تو اب نفاق، جھوٹ، ریا، عداوت، بغض اور حسد سب ہی ظاہر ہوں گے۔

لہ مسلم و احمد و ترمذی و ابن ماجہ ۱۲

اسی لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ " دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے "[1] اور ضرورت سے زیادہ پیسہ میسر ہی نہ ہو تو مباح چیزوں کا مزہ بھی مُنہ کو نہ لگے گا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ذکر سے غفلت ہو جائے گی، کیونکہ کاشتکاروں محرروں اور ملازموں کی نگرانی اور شریکوں سے حساب کتاب کرنے اور ترقی کے اسباب فراہم کرنے کی تدبیروں میں ایسی مشغولی ہو گی کہ اصل سعادت یعنی ذکر الٰہی کا وقت ہی نہ مل سکے گا۔ اول روپیہ کی تحصیل اور وصولیابی پھر اس کی حفاظت و نگہبانی اور پھر اس کا نکالنا اور کسی کام میں لگانا یہ سب دھندے قلب کو سیاہ کرنے والے ہیں جس سے نور بصیرت جاتا رہتا ہے اور جب ضرورت سے زیادہ مال ہی نہ ہو گا تو یہ تفکرات و منغصات بھی پیش نہ آئیں گے۔

فصل

ضرورت کی تحدید اور کفایت کی حقیقت

اب معلوم کرنا چاہیئے کہ ضرورت کس چیز کا نام ہے اور بقدر کفایت کس قدر مال کو کہتے ہیں؟ کیونکہ یوں تو ہر شخص کتنا ہی مالدار کیوں نہ ہو جائے، یہاں تک کہ اگر ہفت اقلیم کی سلطنت بھی مل جاتی ہے، تب بھی یہی سمجھتا ہے کہ میری ضرورتوں کو کافی نہیں ہے۔ اس لئے جاننا چاہئے کہ زعمی ضرورتوں کا اعتبار نہیں ہے، اور واقعی ضرورت انسان کو صرف پیٹ بھرنے بدن ڈھکنے کی ہے۔ بس اگر زینت و تجمل کا خیال نہ ہو تو سال بھر

---

[1] بیہقی مرسل مگر معتبر ہے ۱۲

کے جاڑے گرمی کیلئے دو دینار کافی ہیں جن میں موٹے کپڑے جو گرمی و سردی رفع کر سکیں باآسانی تیار ہو سکتے ہیں۔ اور کھانے میں شکم سیری اور چٹورا پن اگر چھوڑ دیا جائے تو ایک مُد روزانہ کے حساب سے سال بھر میں پانچ سو مُد اناج اور کبھی کبھی معمولی دال ترکاری کیلئے ارزانی کے موسم میں تخمیناً تین دینار کافی ہیں۔
اب حساب لگاؤ کہ کتنے نفر کا نفقہ تمہارے ذمہ ہے؟ پس محنت مزدوری سے اسی مقدار کے موافق اپنا اور اپنے بال بچوں کا نفقہ روزانہ حاصل کرو اور خرچ کر ڈالو باقی سارا وقت اللہ کی یاد میں خرچ کرو۔ اور اگر اس سے زیادہ کماؤ گے جمع کرو گے تو دنیادار اور مالدار سمجھے جاؤ گے۔ اور اگر کوئی زمین جائداد جس کی سالانہ آمدنی مذکورہ مقدار کے موافق ہو جائے اس نیت سے خرید لو کہ روزانہ کسب اور محنت مزدوری سے سبکدوش ہو کر اطمینان کے ساتھ اللہ اللہ کر سکو گے تو فی زماننا اس میں بھی کچھ مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ جائداد کا خریدنا اور زمین دمنی میں روپیہ لگانا اس وقت ناجائز ہے جب کہ دنیا طلبی کیلئے ہو کہ عزت و جاہ میں ترقی یا زمیندار بننے کی دل میں خواہش ہو، اور مذکورہ صورت میں چونکہ دین ہی کا حاصل کرنا مقصود ہے، اس لئے یہ اس ممانعت سے خارج ہے جو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے[2]۔ اس کے ساتھ ہی اس کا لحاظ کرنا بھی ضروری ہے کہ طبائع اور ہمتیں مختلف ہوتی ہیں، ممکن ہے کہ بعض لوگ مذکورہ قدر کفایت پر قناعت نہ کر سکیں لہٰذا ان کیلئے اس سے دو چند کی بھی اجازت ہے۔ کیونکہ دین میں تنگی نہیں ہے۔ البتہ اس زیادتی میں نیت یہی ہونا چاہیے

---

[1] ایک دینار تقریباً تیرہ کا ہوتا ہے گویا تین دینار ۳۹ ہوئے اکنہ ذرا کی قیمت دینار بہت زیادہ ہو۔ نجیب۱
[2] احمد و ترمذی اور حاکم نے صحیح روایت کیا ہے " لا تتخذوا الضیعة فترغبوا فی الدنیا" تم جائداد نہ حاصل کرو کہ دنیا سے محبت کرنے لگو۔

کہ چونکہ تخفیف میں مشقت پیش آتی ہے اور عبادت میں اطمینان نہیں ہوتا اس لئے ہم کو باطمینان قلب یادِ حق میں مشغول رہنے کیلئے زائد خرچ کی ضرورت ہے، نہ کہ تلذذ اور تنعم[1] کیلئے۔ بس اس سے زیادہ جو کوئی جمع کر کے رکھے وہ دنیادار ہے، اور اس کو مال کی محبت ہے جو اس کا دین برباد کرنے والی ہے۔

یاد رکھو کہ مال جمع کرنے والوں کی غرض مختلف ہوتی ہے۔ یا یہ کہ مزہ اڑائیں گے اور لذتیں پائیں گے، اور یا یہ کہ موقع اور وقت پر آئندہ صدقات و خیرات کریں گے، اور یا تو وہ دوراندیشی اور اس مصلحت کیلئے جوڑ کر رکھتے ہیں کہ اگر کوئی وقت افلاس آگیا یا محنت مزدوری نہ ہو سکی یا فاقہ کشی کی نوبت آئی تو یہ پسماندہ پونجی کام آئے گی۔ حالانکہ یہ تینوں نیتیں درست نہیں ہیں۔ کیونکہ تلذذ اور تنعم تو خدا سے غافل بنانے والی ہے، اور خیرات کی نیت سے مال جمع کرنے کی بہ نسبت تو بہتر یہ ہے کہ مال ہی پاس نہ ہو، اب رہا آئندہ کیلئے مال جمع کرنا جس کا نام دوراندیشی ہے سو وہ تو کوئی چیز ہی نہیں، کیونکہ اگر تقدیر میں فاقہ کشی اور مصیبت لکھی ہے تو وہ اس مال کی بدولت ٹل نہیں سکتی، اور نیز جس طرح آفت ناگہانی کی طرف سے اطمینان نہیں اسی طرح اس بات سے بھی ناامیدی نہیں ہے کہ حق تعالیٰ ایسی جگہ سے رزق پہنچائے جہاں گمان بھی نہ جاتا ہو۔ اور بھلا اس بدگمانی کا موقع ہی کیا ہے کہ شاید کسی وقت میں حق تعالیٰ رزق بند کر لے اور فاقہ کرائے، غلام کو تو اپنے آقا کے ساتھ نیک گمان رکھنا چاہیئے نہ کہ گمان بد۔ اس کے علاوہ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اس کی ہوس کرنا کہ تمام عمر مالدار یا تندرست ہی رہیں اور کسی وقت بھی کسی قسم کی

---

[1] مزہ پانا، نعمت میں رہنا ۱۲

مصیبت یا رنج ہم کو نہ پہنچے، اچھی بات نہیں ہے۔ فراخدستی و آرام کی زندگی کو بہتر خیال کر لینا عقلمندوں کا کام نہیں ہے۔ اس لئے کہ مصیبتوں اور پریشانیوں کی بدولت بندوں کو بڑے بڑے درجے ملتے ہیں، اسی سے قلب کی صیقل ہوتی ہے، اسی سے گناہ معاف ہوتے اور وہ فائدے حاصل ہوتے ہیں جن کا حاصل ہونا آسان نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے زیادہ پریشانیاں انبیاء علیہم السلام کو برداشت کرنی پڑیں، اور ان سے کم پریشانیاں ان سے کم رتبہ والوں کو غرض قرب خدا میں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جتنی مناسبت ہوئی اسی نسبت سے اس کو پریشانیاں اور مصیبتیں بھی اٹھانی پڑیں۔

یاد رکھو کہ حق تعالیٰ بڑی حکمت والا ہے، اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں، وہ اپنے بندوں کی مصلحتوں سے خوب واقف ہے، پس تم کو جس حال میں رکھے گا تمہارے لئے اسی میں بھلائی ہوگی۔ لہٰذا اپنی طرف سے راحت کو اپنے لئے انتخاب کرنا اور اس ہوس میں آنے والی مصیبت کیلئے ذخیرہ جمع کرنا گویا اپنا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا اور اپنے انتخاب کو انتخاب خداوندی پر ترجیح دینا ہے، جو سراسر غلط ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی قابلِ غور ہے کہ قبل از مرگ واویلا کرنے سے فائدہ کیا اور آئندہ کی دنیوی زندگی یعنی بڑھاپے یا ضعیفی کے زمانہ کی فکر سے نتیجہ کیا؟ نہ تم اس فکر کیلئے پیدا ہوئے اور نہ تمہارے فکر کرنے سے تمہارا رزق جو مقدر ہو چکا ہے کم یا زیادہ ہو سکتا ہے۔ تم تو آخرت کے مسافر ہو، اور اسی کا سامان فراہم کرنے کیلئے دنیا میں بھیجے گئے ہو پس اس کی فکر کرو دنیا کی پرواہ بھی نہ کرو کہ کتنی ملتی ہے اور کیونکر گذر رہی ہے۔

فصل

کفایت کی مقدار کا جو حساب ہم نے بیان کیا ہے وہ چونکہ تخمینی ہے اس لئے

لوگوں کی طبیعتوں، حالتوں اور موسم کی ارزانی وگرانی کے اختلاف سے اس میں کمی بیشی ہوسکتی ہے ہمارا مقصود یہ ہے کہ مال کو دوا کی مثل سمجھو کہ بقدر ضرورت تو مفید و نافع ہوا کرتی ہے اور اس میں کچھ زیادتی کر دی جائے تو وہ بیماری کو بڑھا دیتی ہے اور اگر اس میں بہت ہی زیادتی کر دی جائے تو جان ہی سے مار دیتی ہے۔ پس جہاں تک ہو سکے اخراجات و مصارف میں کمی کرو، کیونکہ اگر تکلیف بھی ہے تو بس چند ہی روز کی ہے، کیونکہ زندگی ہی چند روزہ ہے۔ پس یہ تو جس طرح ہو گی گذر ہی جائے گی۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ کھانے کا مزہ بھی بھوک ہی میں معلوم ہوا کرتا ہے، پس جتنے یہاں بھوکے رہو گے اسی قدر جنت کی نعمتوں میں مزہ بھی زیادہ آئے گا۔

فصل

بخل کی حد اور حقیقت

بخل کی حد بھی معلوم ہونی چاہیئے کیونکہ اکثر آدمی خود اپنی حالت میں شک کرتے ہیں اور نہیں سمجھ سکتے کہ بخیل ہیں یا سخی؟ اس لئے جاننا چاہیئے کہ جہاں مال خرچ کرنے کا شرع حکم دے یا مروّت تقاضا کرے وہاں مال خرچ نہ کرنا بخل ہے۔ پس اگر کوئی شخص اپنے بی بی بچوں کو وہ نفقہ تو برابر دیئے جائے جو قاضی نے مقرر اور اس پر واجب کر دیا ہے مگر اس سے زیادہ ایک لقمہ بھی دینا گوارا نہ ہو تو چونکہ یہ سختی اگرچہ شریعت کے خلاف نہیں لیکن مروت کے خلاف ہے اس لئے بخل میں شمار ہے، یا مثلاً تم نے کسی دکاندار سے کوئی شئی خریدی اور ذرا سے نقص یا عیب کی وجہ سے اس کو واپس کر دیا تو اگرچہ یہ واپسی شرعاً جائز ہے، مگر چونکہ خلاف مروّت ہے اس لئے بخل کہلائے گا۔ یہاں یہ شبہ نہ ہونا چاہیئے کہ جب یہ صورتیں مروت کے خلاف ہونے کی وجہ سے

بخل میں داخل ہیں تو پھر شریعت نے ان کو جائز کیوں کہہ دیا ؟ بات یہ ہے کہ
شریعت کا منشا اس قسم کی بے مروتی کی باتوں کو جائز کہہ دینے میں یہ ہے کہ عام
لوگوں کی باہمی نزاع دور کرے اور بخیلوں پر اتنا قلیل بوجھ ڈال کر جس کے
وہ متحمل ہو سکیں انتظام دنیوی کو قائم رکھے مگر اس کے ساتھ ہی مروت کا برتاؤ
اور جو ضرورتیں اتفاقیہ پیش آجائیں ان کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ حدیث[1]
میں آیا ہے کہ جس مال کے ذریعہ سے آدمی اپنی آبرو بچائے وہ بھی صدقہ ہے۔
مثلاً کسی مالدار کو اندیشہ ہو کہ یہ شاعر میری ہجو کرے گا اور اگر میں اس کو کچھ
دے دوں تو اس کا منہ بند ہو جائے گا اور باوجود اس علم کے اس کو کچھ نہ
دے تو وہ شخص بخیل سمجھا جائے گا، کیونکہ اس نے اپنی آبرو محفوظ رکھنے کی تدبیر
نہ کی اور بدگو کو بدگوئی کا موقع دیا۔ یہ ظاہر ہے کہ مال کی ذات تو مقصود اور
محبوب نہیں ہے۔ چنانچہ کوئی اس کو چباتا یا نگلتا نہیں ہے، ہاں البتہ
چونکہ اس سے ضرورتیں پوری اور منفعتیں حاصل ہوتی ہیں اس لئے مال مرغوب
ہے لہٰذا جس جگہ اس کے خرچ کرنے میں فائدہ ہو وہاں خرچ نہ کرنا غلطی
کی بات ہے۔ پس جو شخص باوجود ضرورت کے مال خرچ نہ کرے تو سمجھ لو کہ
اس کی ذات کے ساتھ محبت ہے، اس نفع کے ساتھ جو کہ مال سے مقصود ہے
اس کو مطلق بحث نہیں۔ کبھی مال کی محبت یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ انسان
کو اپنا فائدہ اور نقصان بھی نظر نہیں آتا۔ ایسی حالت بہت خطرناک ہے۔
جس کو جہل مرکب کہنا چاہئے۔ پس ایسی صورت میں عقل و شرع کے پابند
بننے کی طرف زیادہ توجہ کرو اور جس جگہ پر خرچ کرنے کا یہ دونوں حکم کریں وہاں

---

[1] حاکم۔ صحیح ہے ۱۲

بے دریغ مال خرچ کرو۔

یہ تو بخل کا تذکرہ تھا۔ اب رہی سخاوت، تو اس کی تو کوئی حد ہی مقرر نہیں ہے۔ پس اتنا سمجھ لو کہ بخل کی حد سے باہر نکل کر جتنا بھی خرچ کیا جائے وہ سب سخاوت میں داخل ہے۔

فصل

بخل کا علاج علمی بخل کا علاج علمی بھی ہے اور عملی بھی۔ علمی علاج تو یہ ہے کہ بخل کے نقصانات معلوم کرو کہ آخرت کی تباہی اور دنیا کی بدنامی دونوں اس سے پیدا ہوتی ہیں۔ خوب سمجھ لو کہ مال بخیل کے ساتھ جانے والا نہیں ہے، صرف قبر کے گڑھے تک کا دھندا ہے۔ پس دنیا میں انسان کو جو مال دیا گیا ہے تو صرف اس غرض سے دیا گیا ہے کہ وہ اس کو اپنی ضرورتوں میں خرچ کیا کرے۔ سو اگر تم جانور بن کر اس کو اپنی نفسانی خواہشوں کے پورا کرنے میں خرچ کرو گے تو بڑی ضروری نعمت یعنی آخرت کی لذتوں سے محروم رہو گے اور اگر دنیا میں اولاد کے لئے چھوڑ مرو گے تو گویا اولاد کو تو آرام دے جاؤ گے مگر خود خالی ہاتھ چلے جاؤ گے، اب تم ہی بتاؤ کہ اس سے زیادہ حماقت کیا ہو سکتی ہے؟ ذرا غور کرو کہ اگر تمہارے پسماندہ بچے صالح اور نیکوکار اٹھیں گے تو خدا ان کی ضرورتوں کا کفیل نہ ہو گا؟ پھر تمہارے جمع کرنے سے کیا نفع؟ اور اگر خدانخواستہ وہ بدکار ہوئے، تو ظاہر ہے کہ یہ تمہارا جمع کیا ہوا مال حق تعالیٰ کی معصیت میں خرچ ہو گا اور اس کا تم پر وبال پڑے گا کہ معصیت کے سبب تم قرار پاؤ گے، جوں جوں دوسرے لوگ تمہارے مال سے مزے اڑائیں گے ویسے ویسے تم پر عذاب بڑھے گا۔ اس قسم کی باتیں سوچنے اور بخل کے نتائج پر غور کرنے سے امید

ہے کہ انشاء اللہ بخل سے نجات مل جائے گی۔

عملی علاج بخل

عملی علاج یہ ہے کہ نفس پر جبر کرو اور خرچ کرنے کی بہ تکلف عادت ڈالو، ضرورتوں کے وقت خرچ کرنے کی خوبی کا تصور باندھ کر اتنا زور ڈالو کہ خرچ کرنے کی رغبت ہونے لگے۔ اور پھر بتدریج برے خیالات اور مذموم اخلاق کو دور کرتے رہو یہاں تک کہ بخل کی جڑ کٹ جائے اور اب مال کا خرچ کرنا خالصاً لوجہ اللہ بن جائے۔

چھٹی اصل

رعونت[1] اور شہرت وجاہ[2] کی محبت کا بیان

خمول و عدم شہرت سے بڑے فائدے ہیں

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "دارِ آخرت کی بھلائیاں انھیں کیلئے مخصوص ہیں جو زمین پر رہ کر بڑھنا چڑھنا اور فتنہ فساد کرنا نہیں چاہتے"؛ اور رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں[3] کہ "بکریوں کے گلّے میں دو بھیڑیئے آپڑیں تو وہ اتنا نقصان نہ کریں گے جتنا مال وجاہ کی محبت دیندار مسلمان کے دین کا نقصان کرتی ہے۔"

خوب سمجھ لو کہ رعونت اور حبِ جاہ بُری بَلا ہے، ان سے قلب میں نفاق پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں وہ لوگ بڑے آرام میں ہیں جن کو کوئی جانتا بھی نہیں، پریشان حال، غبار آلودہ کہ نہ لوگ ان کو پاس بٹھانا پسند کرتے ہیں، نہ امراء ان کو اپنی کوٹھی بنگلوں میں گھسنے کی اجازت دیتے ہیں، اگر وہ نکاح کرنا چاہیں تو کوئی ان کو لڑکی دینا پسند نہیں کرتا، پھٹے پُرانے کپڑے پہنے اور ذلت و مسکنت کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں، انھیں میں ایسے بندے ہوتے ہیں کہ اگر کسی بات پر قسم کھا بیٹھیں تو حق تعالیٰ ان کی خاطر اس کو پورا فرماتا ہے۔

---

[1] خود آرائی ۱۲ [2] عزت ۱۲ [3] ترمذی واحمد۔ صحیح ہے ۱۲

یاد رکھو کہ جہاں انسان کی شہرت ہوئی اور اس کو مسندِ عزت کی جگہ بیٹھنا اور لوگوں کے آگے آگے چلنا پسند آیا تو بس تباہی آگئی۔ خدا کے بندے اپنے آپ کو بہت چھپاتے ہیں۔ البتہ بلا طلب بلا خواہش اگر حق تعالیٰ ہی ان کو ظاہر فرمادے تو اب ان کو چھپانا مناسب نہیں رہتا۔ دیکھو انبیاء علیہم السلام، خلفائے راشدین اور اکثر اولیاء کی دنیا میں شہرت ہوئی ہے مگر ان میں سے کسی نے بھی اپنی شہرت کی آرزو یا خواہش نہیں کی بلکہ محض حق تعالیٰ کی اطاعت تھی کہ اس نے جس حال میں بھی رکھا اس پر راضی ہوگئے۔ اس لئے نہ تکبر پیدا ہوا اور نہ حبِ جاہ۔ کیونکہ حبِ جاہ اس کا نام ہے کہ اپنی شہرت کی خود خواہش کرے۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے رعونت پیدا ہو جاتی ہے۔ حق تعالیٰ محفوظ رکھے۔

فصل

حُبِّ جاہ و حُبِّ مال کا فرق

حبِّ جاہ کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان لوگوں کے قلوب پر قبضہ کرنا چاہے اور اس کی خواہش کرے کہ ان کے دل میرے مطیع بن جائیں، میری تعریف کیا کریں، میری حاجت کے پورا کرنے میں لپکیں اور جان تک سے دریغ نہ کریں۔ مال کے ساتھ بھی انسان کو اسی غرض سے محبت ہوتی ہے کہ وہ رفعِ حاجت کا ذریعہ ہے۔ اور جاہ و شہرت کی خواہش بھی اسی لئے ہوتی ہے کہ کوئی ضرورت بند نہ رہے۔ پس مقصود کے اعتبار سے دونوں ایک ہی نفع کے سبب ہیں۔

مال کی نسبت جاہ کی محبت زیادہ ہونے کا پہلا سبب

چونکہ حبِّ جاہ سے مال بھی حاصل ہو سکتا ہے اور نہ اس کو کوئی چرا سکتا ہے نہ لوٹ سکتا ہے۔ اور مال کے ذریعہ سے

بسا اوقات جاہ حاصل نہیں ہوتا، اور مال میں چوری کا اور لوٹ کا خطرہ بھی رہتا ہے اس لئے حبِّ جاہ کا درجہ حبِّ مال سے بڑھا ہوا ہے۔ اور چونکہ یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کسی کی تعظیم کا اعتقاد لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے تو لامحالہ لوگ اس کی تعریفیں کرتے اور دوسروں کو اس مضمون میں اپنا ہم خیال بنانا چاہتے ہیں اور جب ان کو اس کی دھن لگتی ہے تو بسا اوقات کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ پس اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور آخر کار حبِّ جاہ میں بلا تکلّف و بلا مشقت کامیابی ہو جاتی ہے۔ برخلاف اس کے مال کے جمع کرنے میں بیسیوں تدبیریں اور حیلے کرنے پڑتے ہیں، اور پھر بھی خاطر خواہ مال جمع ہونا مشکل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے انسان کو مال کی نسبت جاہ کی محبت و خواہش زیادہ ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ فقرا بھی حبِّ جاہ میں مبتلا پائے جاتے ہیں

حُبِّ جاہ کا دوسرا سبب

حبِّ جاہ کے بکثرت ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہر آدمی کو اپنی بڑائی اور عزت کی بالطبع خواہش ہوتی ہے، اور ہر شخص چاہتا ہے کہ میں ایسا بےمثل و یکتائے روزگار ہوں کہ بس مَیں ہی مَیں ہوں۔ حالانکہ یہ حقیقت[1] الٰہیہ ہے اور خداوند تعالیٰ ہی کو شایاں ہے۔ کیونکہ یکتائی اسی کی شان ہے۔ اور تمام مخلوق اس واجب الوجود کے نورِ قدرت کا پرتو ہے۔ پس جو انسان حبِّ جاہ کے مرض میں گرفتار ہے وہ گویا اللہ عزّ اسمہٗ کے ہم پلّہ ہو جانے کا خواہشمند اور اس کے ساتھ اس نسبت کے قائم رکھنے سے ناراض ہے جو دھوپ کو آفتاب

---

[1] یعنی معبود ہونے کی تو حقیقت یہی ہے کہ ذات اور اوصاف میں یکتا ہو گویا یہ خدائی کا دعویٰ کرنا چاہتا ہے ۱۲

کے ساتھ ہوتی ہے گویا اس کا نفس فرعون کی طرح أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ پکار رہا ہے کہ (میں ہی تم سب کا بڑا پروردگار ہوں) بس اتنا فرق ہے کہ فرعون نے یہ کلمہ زبان سے لوگوں کے سامنے کہہ دیا تھا اور دوسرے لوگ اس کو اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ مگر چونکہ شانِ یکتائی کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی اور اس آرزو میں کامیاب ہونا محال ہے اس لئے انسان کا نفس چاہتا ہے کہ مستقل وجود میں کامیاب نہ ہو تو کم از کم اتنا ضرور ہو کہ ساری مخلوق پر قبضہ ضرور حاصل ہو جائے کہ جس شے پر جو چاہوں تصرف کروں مگر چونکہ آسمان، ستاروں پہاڑ، سمندر اور دوسری بڑی مخلوقات پر قبضہ ہونا دشوار نظر آیا اس لئے ذرا نیچے اتر کر اس کا متمنی نظر آیا کہ صرف زمین ہی کی مخلوق پر مالکانہ تصرف حاصل ہو جائے یعنی حیوانات مسخر ہو جائیں اور معدنیات[2] و نباتات تابع[1] فرمان بن جائیں اور ان علویات[3] آسمانی اور بڑی مخلوقات ارضی[4] کی، جن پر مالکانہ تصرف حاصل ہونا ناممکن ہے، پوری واقفیت اور تحقیق تام[5] حاصل ہو جائے تاکہ ہاتھ کا قبضہ نہ ہو تو علم ہی کا قبضہ قائم رہے، اور دنیا کی آبادی میں سے ذوی العقول[6] مخلوق یعنی انسان اپنے قلوب کے اعتبار سے میرے مطیع و فرماں بردار بن جائیں کہ میری عظمت و بڑائی کے معتقد ہو کر مجھ کو صاحبِ کمال سمجھنے لگیں، ہاتھ باندھے ہوئے میری تعظیم کریں اور میری شہرت کا آوازہ ان ملکوں تک پہنچ جائے جہاں میں خود نہیں پہنچ سکتا۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ۔

---

[1] تابع ۱۲ — [2] (پہاڑی) کان سے نکلنے والی چیزیں ۱۲

[3] بلندی والی چیزیں ۱۲ — [4] زمین والی ۱۲

[5] پوری — [6] عقل والے ۱۲

فصل

انسان ایک دن مرنے والا ہے، اور جاہ و شہرت مرنے کے بعد ختم ہو جائے گی۔ پس اگر یہ ناپائیدار شہرت حاصل بھی ہوئی اور مخلوق میں عزت اور جاہ مل بھی گئی تو ہوا کیا؟ یہ تو کوئی خوبی اور کمال کی بات نہیں، کمال تو ایسی چیز کا حاصل کرنا ہے کہ جس میں موت کوئی خلل یا کمی نہ پیدا کرے، اور وہ معرفت الٰہی ہے، کہ صاحب معرفت شخص دنیا سے انتقال بھی کر جائے تب بھی معرفت کے بیشمار مراتب میں اس کی ترقی رہتی ہے۔ لہذا اس رعونت اور طلب شہرت کا علاج کرو اور اس کی محبت دل سے نکالو۔ یوں سمجھو کہ اگر مثلاً تمام دنیا تم کو سجدہ بھی کرنے لگے تو کتنے دن کے لئے۔ آخر ایک دن وہ ہوگا کہ نہ تم باقی رہوگے اور نہ سجدہ کرنے والے باقی رہیں گے۔ تعجب ہے کہ زمانہ تو تمہارے ساتھ یہاں تک بخل کرتا ہے کہ شہر یا قصبہ تو درکنار تمہارے محلہ پر بھی تم کو پورا قبضہ نہیں دیتا، اور تم زمانہ کی ہمدردی میں ایسے ڈوبے کہ دائمی نعمت اور جاوید سلطنت چھوڑنے پر راضی ہو گئے کہ دنیا کی اس مکدر و حقیر شہرت اور چند ایسے احمق و ضعیف لوگوں کی تعظیم و تکریم پر نازاں ہو گئے۔ جن کو نہ کسی کی موت و حیات کا اختیار ہے اور نہ کسی کے ضرر اور نفع پر دسترس ہے اور اس کی بدولت اس پائدار عزت اور عالم ملکوتی کی شہرت کو کھو بیٹھے جو حق تعالیٰ اور اس کی برگزیدہ و پاک مخلوق یعنی فرشتوں میں تم کو حاصل ہوتی ہے۔

بقدر ضرورت جاہ کی تحصیل جائز ہے

یہ ضرور ہے کہ انسان مال کی طرح بقدر ضرورت جاہ کا بھی محتاج ہے تاکہ اس کی وجہ سے مخلوق کے ظلم و تعدی سے محفوظ اور ظالم حاکموں کی دست برد سے بے خوف ہو کر باطمینانِ قلب عبادت

میں مشغول رہ سکے، لہٰذا اتنی طلب جاہ میں مضائقہ نہیں ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہ بقدرِ ضرورت جاہ اپنی عبادتوں میں ریا اور دکھاوا کرکے نہ حاصل کرے، کیونکہ ریا حرام ہے۔ نیز متقی اور صوفی کی صورت بنا کر بھی مخلوق کو دھوکہ نہ دو کیونکہ اگر درویشانہ یا عالمانہ صورت کی بدولت مخلوق میں عزت حاصل کرو گے تو خدا کے نزدیک مکار سمجھے جاؤ گے کہ جو مضمون قلب کو حاصل نہ ہوا اور محض صورت بنا کر اس کا اظہار کیا جائے وہ دھوکہ اور مکر کہلاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ دھوکہ حرام ہے۔ بہر حال طلب جاہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ کیونکہ اس کی ہوس انسان کو ایک حالت پر قناعت نہیں کرنے دیتی۔ پس اگر سچ پوچھو تو دین انھیں لوگوں کا محفوظ ہے جن کا حال اتنا مخفی اور پوشیدہ ہے کہ ان کو کوئی جانتا ہی نہیں کہ وہ کس رتبہ کے ہیں۔

فصل

حبِ مدح کی وجوہات

اکثر حب جاہ کا سبب اپنی مدح وثنا کی خواہش ہوا کرتی ہے کیونکہ انسان کو اپنی تعریف ومدح میں لذت آتی ہے اور لذت آنے کی تین وجہ ہیں:-

اول: چونکہ کمال حق تعالیٰ کی صفت ہے اور ہر شخص کو مرغوب ہے کہ میرے اندر بھی یہ صفت پیدا ہو، لہٰذا نفس اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے، کیونکہ سمجھتا ہے کہ تعریف کرنے والا میرے کمال سے واقف ہے، اور یہی وجہ ہے کہ بے وقوف اور جاہل شخص کی تعریف سے اتنی خوشی نہیں ہوا کرتی جتنی کسی ہوشیار اور عقلمند آدمی کی مدح سے ہوتی ہے۔

دوم: تسخیر کی خواہش ہر شخص کو ہے۔ اور اپنی مدح سُنکر چونکہ معلوم

ہو جاتا ہے کہ مدّاح کے قلب پر میرا قبضہ اور اثر ہو گیا ہے ، لہذا نفس کو اس میں مزہ آتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی صاحبِ عزّت شخص تعریف کرے تو زیادہ مسرت ہوتی ہے اور اگر کوئی محتاج یا بھیک منگا فقیر مدح کرے تو بالکل خوشی نہیں ہوتی ، کیونکہ اس کے قلب پر قبضہ کرنا کوئی کمال یا خوبی نہیں سمجھی جاتی ۔

سوم : یہ خیال ہوتا ہے کہ میرے آوازۂ شہرت کے بلند ہونے کا ذریعہ پیدا ہو گیا ، کیونکہ لوگوں کو میری تعریف کرنے کی طرف توجہ ہوئی اور اب یہ آہستہ آہستہ پھیل کر دنیا بھر میں بہت جلد شہرت کرا دے گی ۔ لہذا مدح سے نفس پھولتا ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ مجمع میں تعریف ہونے سے جتنی مسرت ہوتی ہے تنہائی میں مدح ہونے سے اتنی مسرت نہیں ہوتی ۔

حُبِّ مدح کا علاج

خوب سمجھ لو کہ اس حبِّ مدح نے لوگوں کو برباد کر دیا ، اسی کی بدولت ریا اور طرح طرح کی معصیت میں مبتلا ہو گئے ۔ پس اس کا علاج کرنا چاہیئے ۔

غور کرو کہ تعریف کرنے والا کس بات کی تعریف کرتا ہے ؟ اگر تمہارے مال اور عزّت کی تعریف کر رہا ہے تو سمجھو کہ یہ تو کوئی کمال کی چیز نہیں ہے مسرت تو حقیقی کمال یعنی معرفتِ الٰہی کے حصول پر ہونی چاہیئے ، اور دنیوی کمال تو رونے کا مقام ہے نہ کہ مسرت کا ۔ اور اگر تمہارے زہد اور اتقار کی تعریف ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں ، یعنی یا تو یہ کہ درحقیقت تم زاہد اور متقی ہو اور تمہاری تعریف اس بارے میں سچی ہو رہی ہے ، اور یا محض تمہیں خوش کرنے کیلئے تمہاری جھوٹی تعریف کی جا رہی ہے ۔ بس اگر سچی تعریف ہے تو اس کا علاج اس طرح کرو کہ دل میں سوچو اور غور کرو کہ ان باتوں اپنے اندر

آجانا اور حق تعالیٰ کا قبول فرمالینا خوشی کی بات ہے نہ کہ دوسروں کا بیان کرنا۔ کیونکہ لوگوں کے اظہار کو قبولیت اور قرب الٰہی میں کچھ دخل نہیں ہے اور اگر زہد و اتقاء کی تعریف جھوٹی ہو رہی تب تو خوش ہونا کھلی حماقت ہے، کیونکہ اس کی مثال تو ایسی ہوئی کہ کوئی شخص تمہاری تعریف کرنے لگے کہ آپ کی آنتوں اور معدہ سے عطر کی خوشبو آرہی ہے، حالانکہ تم واقف ہو کہ اس میں تو نجاست اور فضلہ بھرا ہوا ہے۔ اور پھر اس بیجا مدح اور بے موقع بلکہ صریح جھوٹی تعریف پر خوش ہونے لگو، تم ہی بتاؤ کہ اس سے زیادہ بے وقوفی کیا ہوگی۔

اور جاہ و شہرت کا علاج ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اس پر عمل کرنے سے امید ہے کہ حبِّ مدح کی جڑ جاتی رہے گی۔

ساتویں فصل

دنیا کی محبت کا بیان

دنیا صرف مال و جاہ ہی کی محبت کا نام نہیں بلکہ موت سے پہلے جس حالت میں بھی تم ہو وہ سب دنیا ہے۔ اور دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے۔

حب دنیا کی ماہیت

دنیا کے تمام جھگڑوں، بکھیڑوں اور مخلوقات اور موجودہ چیزوں کے ساتھ تعلق رکھنے کا نام دنیا کی محبت ہے۔ البتہ علم و معرفت الٰہی اور نیک کام جن کا ثمرہ مرنے کے بعد ملنے والا ہے ان کا وقوع اگرچہ دنیا میں ہوتا ہے مگر درحقیقت وہ دنیا سے مستثنیٰ ہیں اور ان کی محبت دنیا کی محبت نہیں ہے، بلکہ آخرت کی محبت ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ " ہم نے دنیا کی تمام چیزوں کو زمین کی زینت کا سامان بنایا ہے تاکہ لوگوں کو آزمائیں کہ کون ان پر فریفتہ ہوکر آخرت ضائع کرتا ہے اور کون بقدر ضرورت سفر کا توشہ سمجھ کر اپنی آخرت سنوارتا ہے "

ہوائے نفس اشیائے دنیا کی محبت کا نام ہے!

یاد رکھو کہ آدمی کو جاہ و مال کے علاوہ زمین کی بھی محبت ہوا کرتی ہے۔ مثلاً مکان بنائے یا کھیتی کرے۔ نباتات[1] کی بھی محبت ہوتی ہے۔ مثلاً جڑی بوٹی ہو کہ اس کو دواؤں میں استعمال کرے یا ترکاری

---

[1] زمین سے اگنے والی چیزیں ۱۲

و دیگر پیداوار یا پھل پھول ہو کہ اس کو کھائے اور مزہ اڑائے ۔ اور معدنیات[1] کی بھی محبت ہوتی ہے ۔ مثلاً برتن اور اوزار بنائے یا زیور بنواکر پہنے یا نقد جمع کرے ۔ حیوانات کی بھی محبت ہوتی ہے ۔ مثلاً شکار کرے اور کھائے یا ان پر سواری کرے اور اپنی زینت بڑھائے ۔ اور آدمیوں کی بھی محبت ہوتی ہے ۔ مثلاً یہ کہ عورتوں کو منکوحہ اور خادمہ بنائے یا مردوں کو غلام اور نوکر اور خدمت گار بنائے ۔

انھیں چیزوں کی محبت کا نام ہوائے نفس ہے ۔ جس کو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ " جس نے اپنے نفس کو خواہش سے روک لیا اس کا ٹھکانہ جنت ہے "

تن پروری مسافر آخرت کیلئے مہلک ہے

یاد رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشہ ہے اور اسی میں اکثر باطنی امراضِ مہلکہ مثلاً غرور ، نخوت ، کینہ ، حسد ، ریا ، تفاخر اور بڑھوتری کی حرص پیدا ہوتی ہے ۔ اور جب انسان کو حیات دنیوی کی درستی و آرائش کا شوق پیدا ہوتا ہے تو صنعت و حرفت اور زراعت و تجارت کے ناپائدار مشغلوں میں ایسا پھنس جاتا ہے کہ آگے پیچھے اور مبدأ[2] و معاد کی اس کو کچھ خبر ہی نہیں رہتی اور ظاہر و باطن دونوں دنیا ہی کے ہو رہتے ہیں ، قلب محبت دنیا میں مشغول ہو جاتا ہے اور بدن اس کی اصلاح و تدبیر میں مصروف ۔ حالانکہ دنیا توشۂ آخرت ہے ، اور اس سے مقصود یہی ہے کہ مسافرانِ آخرت بآسانی اپنا سفر ختم کر سکیں ۔ مگر بے وقوف اور

---

[1] زمین کی کان سے نکلنے والی دھات ۱۲ [2] ابتدا و انتہا ۱۲

احمق لوگوں نے اسی کو مقصود اصلی سمجھ لیا اور طرح طرح کے مشغلوں اور قسم قسم کی خواہشوں میں ایسے پڑے کہ آنے والے وقت کو بالکل بھول گئے، ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص حج کی نیت سے روانہ ہو اور جنگل میں پہنچکر سواری کے گھاس دانہ اور مرکب[1] کے موٹا تازہ کرنے کی فکر میں لگ جائے اور ہمراہیوں سے پیچھے رہ جائے۔ افسوس ہے کہ اس کی حالت پر کہ تن تنہا جنگل میں رہ گیا اور قافلہ کوچ کر گیا۔ جس نیت سے چلا تھا، یعنی حج، وہ بھی ختم ہو گیا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ جنگلی درندوں نے موٹی تازی سواری کو بھی چیر پھاڑ ڈالا اور اس کو بھی اپنے منہ کا نوالہ بنا گئے۔

یاد رکھو کہ دنیا آخرت کی کھیتی اور منزل کا پڑاؤ ہے اور تم اپنے جسم خاکی پر سوار ہو کر سفر آخرت کر رہے ہو، اس لئے تم کو چاہیئے کہ اپنی سواری کا گھاس دانہ بقدر کفایت اٹھاؤ اور سفری ضرورتوں میں کام آنے والا سامان مہیا کر کے وہ بیج بوؤ جس کو آخرت میں کاٹو۔ اور پھر دائمی زندگی آرام سے گذار سکو۔ اگر اس ماتحت سواری کی پرورش و فربہی میں مشغول ہو جاؤ گے تو قافلہ کوچ کر جائے گا اور تم منزل مقصود تک نہ پہنچ سکو گے۔

مسافرانِ آخرت کی تمثیل اور تقسیم

دنیا میں مخلوق کی مثال ایسی ہے جیسے ایک کشتی پر کچھ آدمی سوار ہوں اور کشتی کسی جزیرے کے کنارے پر آٹھیرے اور کشتی کا ملاح سواریوں کو اجازت دیدے کہ جاؤ جزیرے میں اتر کر اپنی ضرورتیں پوری کر آؤ، مگر ہوشیاری سے کام لینا جگہ خطرناک ہے اور ابھی سفر دور دراز سر پر ہے۔

---

[1] سواری ۱۲

غرض سواریاں اتریں اور ادھر اُدھر منتشر ہو کر کئی اقسام پر منقسم ہوگئیں۔

بعض تو ضروری حاجت سے فارغ ہوتے ہی لوٹ پڑے اور فضول وقت گذارنا ان کو اچھا نہ معلوم ہوا، پس دیکھا کہ کشتی خالی پڑی ہے لہذا اپنی پسند کے موافق ساری کشتی میں اعلیٰ درجہ کی ہوادار اور فراخ جگہ منتخب کر کے وہاں بیٹھ گئے۔

اور بعض جزیرہ کی خوشگوار ہوا کھانے اور خوش الحان پرندوں کی سریلی آوازوں کے سننے میں لگ گئے، سبز مخملی فرش اور رنگ برنگ کے پھول بوٹوں اور طرح طرح کے پتھروں اور درختوں کی گلکاریوں میں مشغول ہوگئے۔ مگر پھر جلدی تنبہ ہو گیا اور فوراً کشتی کی جانب واپس ہوئے، یہاں پہنچ کر دیکھا کہ جگہ تنگ رہ گئی ہے اور پُر بہار و پُر فضا جگہوں پر ان سے پہلے آجانے والے لوگ بستر لگا چکے ہیں لہذا اس تنگ ہی جگہ میں تکلیف کے ساتھ بیٹھ گئے۔

اور چند لوگ اس جزیرہ کی عارضی بہار پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ دریائی خوشنما سیپوں اور پہاڑی خوبصورت پتھروں کے چھوڑنے کو ان کا دل ہی نہ چاہا پس ان کا بوجھ لاد کر انھوں نے اپنی کمر پر رکھا اور سمندر کے کنارے پر پہنچ کر کشتی پر سوار ہوں، دیکھا کہ کشتی لبریز ہو چکی ہے کہ اس میں نہ اپنے بیٹھنے کی جگہ ہے نہ فضول بوجھ کے رکھنے کا کوئی امکان ہے، اب حیران ہیں کہ کیا کریں، ادھر تو بوجھ کے پھینکنے کو نفس گوارا نہیں کرتا اور ادھر اپنے بیٹھنے تک کو جگہ نہیں ملتی، غرض قہر درویش بجان درویش۔ نہایت دقت کے ساتھ ایک نہایت تنگ جگہ میں گھس بیٹھے اور کنکروں، پتھروں کے بارگراں کو اپنے سر پر لاد لیا۔ اب ان کی حالت کا تم ہی اندازہ کر لو کہ کیا ہوگی، کمر الگ دکھے گی، گردن

جدا ٹوٹے گی اور جس مصیبت و تکلیف کے ساتھ وقت کٹے گا اس کو ان کا ہی دل خوب سمجھے گا۔

اور بعض لوگ جزیرہ کے دل افروز حُسن پر ایسے عاشق ہوئے کہ کشتی اور سمندر سب کو بھول گئے۔ پھول سونگھنے اور پھل کھانے میں مصروف ہو گئے۔ اور کچھ خبر نہ رہی کہ کہاں جانا ہے اور یہاں رہ کر درندوں اور موذی جانوروں کی غذا بنتا ہے۔ آخر جب سب کے بعد بادل نخواستہ ساحل پر پہنچے تو کشتی میں نام کو بھی جگہ نظر نہ آئی۔ تھوڑی دیر بعد کشتی لنگر اٹھا کر وہاں سے چل دی اور یہ لوگ کنارہ پر کھڑے حسرت بھری نظروں سے اپنے ہمراہیوں کو دیکھتے رہ گئے۔ آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ جزیرہ کے درندوں نے ان کو پھاڑ ڈالا اور موذی جانوروں نے ان کے نازک اور خوبصورت بدن کے ٹکڑے کر دیا۔ یہی حال بعینہٖ دنیاداروں کا ہے۔ اب تم خود غور کر کے سمجھ لو کہ کن لوگوں پر کونسی مثال چسپاں ہوتی ہے۔

فصل

جو شخص اپنے نفس کی ماہیت سے واقف ہو گیا اور معرفت الٰہی حاصل کر لی اور جس نے دنیائے دنی کی حقیقت سمجھ لی وہ خوب سمجھ سکتا ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت کے بغیر آخرت کی جاوید[۱] نعمتیں ہرگز نہیں مل سکیں، اور حق تعالیٰ کی محبت کے ساتھ دنیا کی محبت کا جمع ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جس طرح ایک برتن میں آگ اور پانی کا جمع ہونا ناممکن ہے۔ اور جب تک انسان دنیا سے منہ نہ پھیرے گا کہ ان فانی تعلقات کو منقطع کرے اور بقدر

---

[۱] ہمیشہ کی ۲

ضرورت دنیا پر قناعت کر کے با اطمینان ہر لحظہ فکر و ذکر الٰہی میں مشغول ہو جائے اس وقت تک حق تعالیٰ کی محبت پیدا نہ ہوگی۔ اگر تمہاری ایسی حالت ہو جائے اور نور بصیرت کے مشاہدے سے یہ اسرار منکشف ہو جائیں تب تو کسی کے سمجھانے اور بتلانے کی حاجت ہی نہیں، ورنہ شریعت کے تابع بنکر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی کس قدر مذمت فرمائی ہے۔ تقریباً تہائی قرآن اسی دلفریب سبزہ زار زہر ہلاہل[1] کی برائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ "جنھوں نے سرکشی کی اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دی وہ جہنمی ہیں"۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "تعجب ہے ان بندوں پر جو عالم بقا کو سچا سمجھیں اور پھر اس ناپائدار پر فریفتہ ہوں"[2]

خوب سمجھ لو کہ جو لوگ دنیا کو مقصود سمجھکر اس کے کمانے میں مشغول ہو جاتے ہیں وہ سدا پریشان رہتے ہیں کہ ان کی طلب کبھی ختم نہیں ہوتی اور ان کی فکر کبھی رفع نہیں ہوتی، ان کی آرزو کبھی پوری نہیں ہو سکتی، ان کا رنج و غم کبھی دور نہیں ہو سکتا۔

دنیا کی حقیقت کوڑی پر نظر آتی ہے

حدیث[3] میں آیا ہے کہ "رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ابوہریرہؓ کا ہاتھ پکڑا اور ایک کوڑے کے ڈھیر پر لاکھڑا کیا جہاں مُردوں کی کھوپڑیاں اور نجاست و غلاظت کے ڈھیر اور بوسیدہ ہڈیاں اور پھٹے پرانے کپڑے پڑے ہوئے تھے، اور فرمایا کہ "دیکھو ابوہریرہ یہ ہے دنیا کی حقیقت، ایک وقت وہ تھا کہ ان کھوپڑیوں میں بھی تمہاری طرح امیدیں اور آرزوئیں جوش مارتی اور

---

[1] زہر قاتل، لا علاج ۱۲ [2] و [3] ابن ابی الدنیا۔ مرسل ۱۲

حرص وہوس سے لبریز تھیں، اور آج کس بُرے حال میں کوڑے پر پڑی ہیں، کہ چند روز میں خاک ہو جائیں گی اور ان کا پتہ و نشان بھی نہ رہے گا۔ اور دیکھو یہ غلاظت اور فضلہ[1] جو تم کو نظر آرہا ہے وہی تمہاری غذا ہے جس کے پیٹ کے اندر بھرنے کیلئے حلال و حرام کا بھی امتیاز نہیں ہوتا۔ ایک دن تھا کہ رنگ برنگ کے کھانے بنکر تمہارے پیٹ میں تھا، اور آج یہاں کوڑے پر کس گندی حالت میں پڑا ہوا ہے کہ اس کی بُو سے لوگ بھاگتے اور گھنیاتے ہیں۔ دیکھو یہی پُرانے چیتھڑے کسی وقت تمہارے چمک دمک والے لباس تھے اور آج ان کو ہوائیں اِدھر اُدھر اڑائے پھرتی ہیں اور کوئی پُرسان حال نہیں ہوتا۔ اور دیکھو یہ ہڈیاں کسی دن تمہاری سواری کے جانور اور مویشی تھے کہ جن پر جانیں دیتے اور قتل وقتال کیا کرتے تھے۔

اے ابوہریرہ! یہ دنیا کی حقیقت ہے۔ جس کا قابل عبرت انجام دنیا میں ظاہر ہو گیا۔ بس جس کو رونا ہو رو دے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایک دن دنیا کی حقیقت منکشف ہوئی۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک بدصورت بڑھیا بناؤ سنگار کیے ہوئے زیور و پوشاک پہنے بنی ٹھنی بیٹھی ہے۔ آپ نے پوچھا کہ اے بڑھیا تو کتنے لوگوں سے نکاح کر چکی ہے؟ بڑھیا نے جواب دیا کہ بیشمار آدمیوں سے۔ آپ نے فرمایا کہ ان شوہروں کا انتقال ہو گیا یا تجھ کو طلاق دے بیٹھے؟ بڑھیا نے جواب دیا کہ طلاق دینے کی ہمت تو کس کو ہوتی ہے۔ میں نے سب کو مار ڈالا۔ یہ سنکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیرے موجودہ شوہروں پر افسوس ہے کہ ان کو گذشتہ شوہروں کی حالت پر عبرت نہیں ہوتی؟

---

[1] وہ نجاست اور پھوک جو بعد غذا معدہ سے خارج ہو۔

مسلمانو! ہوشیار ہو اور سنبھلو، دنیا بڑی بے وفا ہے، اس سے بچو۔ اس کا جادو ہاروت و ماروت[1] کے سحر سے زیادہ اور جلد اثر کرتا ہے۔ اگر پرانا نمک جو کی روٹی کے ساتھ کھا کر اور ٹاٹ پہن کر زندگی گذار دو گے تب بھی گذر جائے گی مگر آخرت کی فکر کرو کہ وہاں کی رتی برابر نعمت کا نہ ملنا بھی بڑی تکلیف کا سبب ہے۔

فصل

دنیا کی طلب ختم نہ ہوگی

بعض لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارا بدن کتنا ہی دنیا میں معروف ہے مگر ہمارا قلب دنیا سے فارغ اور خالی رہتا ہے۔ یاد رکھو کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ بھلا کوئی شخص دریا میں چلے اور پاؤں نہ بھیگے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر تم کو دنیا کی طلب ہوگی اور ضرورت سے زیادہ دنیا کمانے کی تدبیروں میں لگے رہو گے تو ضروری بات ہے کہ پریشان رہو گے اور دین کو ہاتھ سے کھو بیٹھو گے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ دنیا کی طلب کبھی ختم نہ ہوگی اور اس کی حرص ہمیشہ بڑھتی رہے گی، کیونکہ دنیا کی مثال سمندر کے کھاری پانی کی سی ہے کہ جتنا پیو گے اسی قدر پیاس زیادہ لگے گی۔ بھلا جو چیز ایک دن تم سے چھوٹ جانے والی ہو اس میں معروف ہونا اگر اپنے رنج کا سامان کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟ دنیا کی مثال سانپ کی سی ہے کہ چھونے میں نہایت نرم ہے مگر منہ میں قاتل و مہلک زہر لئے ہوئے ہے۔ اس بے وفا کی مفارقت یقینی ہے، لہٰذا اس کے ہاتھ آجانے پر خوش ہونا اور ہاتھ نہ آنے پر رنج و ملال کرنا دونوں فضول ہیں۔

---

[1] دو فرشتے ہیں جن پر جادو نازل ہوا تھا ۱۲

دنیا کے زر و مال کو اطمینان کا ذریعہ سمجھنا بڑی حماقت ہے، جہاں ہمیشہ رہنا نہیں وہاں اطمینان کیسا ؟

دُنیا مخلوق کا خانۂ ضیافت ہے

دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے کسی مہمان نواز نے اپنا مکان آراستہ کیا اور شیشہ و آلات سے سجا کر مہمانوں کو بلایا اور ان کو اس میں بٹھا کر عطر اور خوشبو اور پھولوں سے بھرا ہوا طباق ان کے سامنے رکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ صاحب مکان کا مطلب اس سے یہ ہے کہ طباق میں رکھے ہوئے پھولوں کو سونگھو اور پاس والوں کے آگے سرکا دو کہ اب وہ اسی طرح نفع اٹھائیں اور بخوشی خاطر برابر والوں کے سامنے کر دیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ سارے طباق پر تم ہی قبضہ کر بیٹھو۔ پس اگر کوئی شخص آدابِ مجلس سے واقف نہ ہو اور طباق کو اپنا نذرانہ سمجھ کر اپنے بغل میں دبائے تو اس کی حماقت پر تمام حضّارِ مجلس[1] ہنسیں گے اور اس کا مذاق اڑائیں گے، اور اس کے بعد یہ نتیجہ ہوگا کہ مالک مکان زبردستی طباق چھین کر دوسروں کے سامنے رکھ دے گا۔ تم ہی سوچو کہ اس وقت اس کو کیسی ندامت ہوگی۔

اسی طرح دنیا حق تعالیٰ کی میزبانی کی جگہ ہے۔ اس سے حق تعالیٰ کا یہ مقصود ہے کہ مسافرانِ آخرت آئیں اور بقدرِ ضرورت اس طرح نفع اٹھائیں جس طرح مستعار چیزوں سے نفع اٹھاتے ہیں اور اپنی حاجتیں رفع کیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد بخوشی خاطر اس کو دوسروں کے حوالہ کر کے اپنا راستہ لیں اور آخرت میں آ پہنچیں۔ پس مستعار چیزوں سے دل کا لگانا حقیقت میں چلتے وقت اپنے آپ کو شرمندہ کرنا اور رنجیدہ بنانا ہے۔

---

[1] حاضرین ۱۲

آٹھویں فصل

نخوت وتکبّر کا بیان

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "تکبر کرنے والے کا بہت برا ٹھکانہ ہے، کبریائی خاص میری چادر ہے۔" پس جو شخص بھی اس میں شریک ہونا چاہے گا میں اس کو قتل کردوں گا۔

کبر کی حقیقت اور آثار

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "جس کے قلب میں رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہ جائے گا۔" جو لوگ باوجود صاحبِ عزت ومال ہونے کے تواضع کرتے ہیں اور عاجزی وانکساری کے ساتھ لوگوں سے ملتے ہیں ان کو مبارک ہو کہ ان کے بڑے درجے ہیں۔ ان کی دنیا میں بھی عزت بڑھتی ہے اور آخرت میں بھی۔

تکبر کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو صفاتِ کمالیہ میں دوسروں سے زیادہ سمجھے۔ اور ظاہر ہے کہ جب انسان کا اپنے متعلق ایسا خیال ہوتا ہے تو نفس پھول جاتا ہے، اور پھر اس کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً راستہ میں چلتے وقت دوسروں سے آگے قدم رکھنا، مجلس میں صدر مقام یا عزت کی جگہ بیٹھنا، دوسروں کو نظرِ حقارت سے دیکھنا، یا اگر کوئی سلام کرنے میں پیش قدمی

۱؎ حاکم۔ مسلم ۱۲ ۲؎ حاکم واحمد ۱۲

نہ کرے تو اس پر غصہ ہونا، کوئی تعظیم نہ کرے تو ناراض ہونا، کوئی اگر نصیحت کرے تو ناک بھوں چڑھانا، حق بات معلوم ہوئے پیچھے بھی اس کو نہ ماننا۔ اور عوام الناس کو ایسی نگاہ سے دیکھنا جس طرح گدھوں کو دیکھتے ہیں۔ نعوذ باللہ منہا۔

چونکہ تکبر بڑی بڑی خباثتوں کا مجموعہ ہے اس لئے جہنم کا پورا ذخیرہ ہے۔

اوّل :۔ کبریائی کہ وہ حق تعالیٰ ہی کیلئے مخصوص اور اسی کی شان کو زیبا ہے۔ پس انسان ضعیف البنیان[1] جس کو دوسرے کا اختیار تو درکنار اپنے ہی نفس کا اختیار نہیں، اس صفتِ الٰہی میں ساجھی[2] ہونے کی کس طرح جرأت کرسکتا ہے؟ اور چونکہ متکبر شخص باوجود اس ذلت وضعف کے حق تعالیٰ کی مشارکت چاہتا اور اس صفت کمالیہ میں اس کے ساتھ منازعت کرتا ہے اس لئے پرلے درجے کا احمق اور خبیث النفس سمجھا جائے گا۔

دوم :۔ تکبر کے سبب حق بات کے انکار کی نوبت آتی ہے جس سے دینی سعادت کا دروازہ بند ہوجاتا ہے، اور متکبر اللہ کی مخلوق کو بہ نظر حقارت دیکھنے لگتا ہے، اور یہ بات حق تعالیٰ کو بہت ناگوار ہے۔

کسی طاعت اور کسی معصیت کو معمولی اور حقیر نہ سمجھو

کان لگاکر سنو! ایک بزرگ کی نصیحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رضامندی کو اپنی طاعت میں چھپا رکھا ہے لہذا کسی عبادت کو کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو حقیر نہ سمجھو، کیا خبر ہے کہ اس کی رضامندی اس میں چھپی ہوئی ہو۔ اور اسی طرح حق تعالیٰ نے اپنی ناراضی اور غصہ کو معصیت میں چھپا دیا ہے۔ پس کسی معصیت کو کیسی ہی ذرا سی کیوں نہ ہو

---

[1] کمزور بنیاد والا ۱۲ نجیب   [2] شریک ۱۲ نجیب

کبھی معمولی نہ سمجھو کیا خبر ہے شاید اسی میں اس کی ناراضگی و غصہ چھپا ہوا ہو۔ اسی طرح اپنی ولایت و قرب کو اپنے بندوں میں مخفی رکھا ہے۔ لہٰذا کسی بندہ کو کیسا ہی گنہگار کیوں نہ ہو کبھی حقیر نہ سمجھو، کیا خبر ہے کہ شاید یہ بندہ خدا کا ولی ہو اور اس کا ظہور اس کے انتقال کے وقت دفعتہً ہو جائے۔

سوم :- تکبر نفس کو کوئی پسندیدہ صفت حاصل نہیں کرنے دیتا۔ تکبر کرنے والا شخص تواضع سے محروم رہتا ہے۔ حسد اور غصہ کو دور کرنے پر قادر نہیں ہوتا، ریاکاری کا ترک اور نرمی کا برتاؤ اس کو دشوار ہوتا ہے۔ کسی مسلمان بھائی کی خیر خواہی اس سے ہو نہیں سکتی۔ غرض اپنی عظمت اور بڑائی کے غرہ میں مست اور ہمہ صفت موصوف ہونے کے خیال باطل میں ناصح کی نصیحت سے مستغنی اور نفس امارہ کی اصلاح سے بالکل محروم رہتا ہے۔

کبر کا علاج

جب تک یہ بدخصلت دفع نہ ہو جائے آئندہ بھی اس کی اصلاح کی توقع نظر نہیں آتی۔ لہٰذا اس کے علاج میں جلدی کرنی چاہیئے۔

اوّل تو یہی سوچنا چاہیئے کہ ہماری حقیقت اور اصلیت کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ ابتدا تو نجس اور ناپاک منی کا قطرہ ہے اور انتہا مردار لوتھ اور کیڑے مکوڑوں کی غذا۔ اب رہی متوسط حالت کہ جس کا نام زندگی اور حیاتِ دنیا ہے سو اس کی حالت یہ ہے کہ منوں نجاست پیٹ میں بھری ہوئی ہے۔ حق تعالےٰ کا ارشاد ہے هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ الخ[1] کہ انسان محض معدوم شے تھا اور اس قابل ہی نہ تھا کہ ذکر و بیان میں آسکے اس کے بعد

---

[1] مردہ لاش ۱۲ منہ

منی بنا اور پھر نطفہ ہوا پھر مضغہ گوشت بنا ، نہ کان تھے نہ آنکھ اور نہ حیات تھی نہ طاقت ۔ اس کے بعد حق تعالیٰ نے سب کچھ دیدیا مگر اس پر بھی بیسیوں امراض کا ہر وقت نشانہ بنا ہوا ہے ، بھوک و پیاس کا محتاج جدا ہے ، اور ذرا سی تکلیف میں بے کار ہو کر بیٹھ جاتا ہے ۔ کسی شئے کا علم چاہتا ہے مگر نہیں ہو سکتا ۔ نفع حاصل کرنا چاہتا ہے ، مگر نقصان ہو جاتا ہے ۔ کوئی لحظہ موت سے امن نہیں ۔ خدا جانے کس وقت بیمار ہو جائے ، کس وقت عقل چھن جائے ، کس وقت کوئی عضو بیکار ہو جائے اور کس وقت روح پرواز کر جائے ۔ پھر انجام کار موت کا شکار اور اس کے بعد تنگ و تاریک گھاٹیوں کا سامنا ہونا ہے ۔ حساب کتاب حشر و نشر پیش آنے ہیں ۔ جنت و دوزخ میں دائمی زندگی کا فیصلہ اور شاہنشاہی فرمان کا صادر ہونا ۔ بھلا تمہیں بتاؤ کہ ایسے گرفتار مصیبت اور ذلیل و ناکارہ غلام کو زبردست قدرت والے جبار و قہار شاہنشاہ کی ہمسری کا خیال کیونکر زیبا ہو سکتا ہے ؟ جس شخص کی یہ حالت ہو کہ اگر نجاست اس کے ہاتھ کو لگے تو تین تین مرتبہ دھوئے ، اور پھر اسی نجاست کو ہر وقت پیٹ میں لئے پھرے ، اس کو تکبر کرنا کسی طرح بھی زیب نہیں دیتا ۔

عموماً چار باتوں میں انسان کو تکبر ہوتا ہے ۔ علم ، تقویٰ ، حسب و نسب اور مال و جمال ۔ اور چونکہ ہر ایک کا علاج علیحدہ ہے لہٰذا ہم ہر مضمون کو مفصل جدا جدا بیان کرتے ہیں ۔

اول : علم :

عالم کے تکبر کے اسباب

علماء تکبر سے بہت کم خالی ہوتے ہیں کیونکہ علم کے برابر کسی چیز کی فضیلت نہیں ہے ،

لہٰذا اس کو حاصل کر کے دو خیال پیدا ہو جاتے ہیں:

اوّل: یہ کہ ہماری برابر اللہ کے یہاں دوسروں کا رتبہ نہیں ہے۔

دوم: یہ کہ لوگوں پر ہماری تعظیم واجب اور ضروری ہے، پس اگر لوگ تواضع کے ساتھ پیش نہ آویں، تو ان کو تعجب ہوا کرتا ہے۔

متکبّر کا علم جہلِ مرکب ہے

پہلا تکبّر دینی تکبر ہے اور دوسرا تکبّر دنیوی ہے۔ ایسے علم کو جاہل کہنا چاہئے کیونکہ علم کا منشار تو یہ تھا، کہ انسان اپنے شریر نفس کی حقیقت اور پروردگار جل جلالہٗ کی عظمت کو معلوم کرتا اور سمجھتا کہ اعتبار خاتمہ کا ہے، اور اس کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ پس جو شخص اپنے آپ کو قابلِ عظمت سمجھے ہوئے ہو تو گویا وہ اپنی اصلیت سے ناواقف اور خاتمہ کے اندیشہ سے بے خوف ہے، اور یہ بڑی معصیت ہے۔ کیونکہ جاہل شخص اگر کسی گناہ کے ارتکاب میں اپنی ناواقفیت کی وجہ سے معذور سمجھا جائے تو کچھ عجب نہیں، مگر عالم چونکہ جان بوجھ کر معصیت کر رہا ہے اس لئے وہ معذور نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ قانون داں شخص کا جرم عام لوگوں کے جرم سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ پس تعجب ہے کہ عالم ہو کر جاہل بن گیا اور باوجود اس کے اپنی جہالت سے بے خبر ہے اسی کا نام جہل مرکب ہے۔

یاد رکھو کہ جس علم سے تکبّر پیدا ہو وہ علم جہل سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ حقیقی علم انسان کو جتنا بھی زیادہ حاصل ہوگا اسی قدر اس کا خوف اور خشیت بڑھے گا۔ حق تعالیٰ نے تو اپنے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم فرمایا ہے کہ اپنے متبع مسلمانوں کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے جو قرآن پڑھیں گے مگر وہ ان کی زبان

پڑھا ہے گا، نہ حلق سے نیچے اترے گا اور نہ قلب تک اس کا اثر پہنچے گا۔ لوگوں سے کہیں گے کہ ہم قاری ہیں، ہم عالم ہیں، ہماری برابر دوسرا نہیں۔ سن لو! یہ لوگ دوزخ کا ایندھن ہوں گے۔"

سلف صالحین کے حالات دیکھو۔ ایک مرتبہ حضرت حذیفہؓ نماز میں امام بنے اور سلام پھیر کر کہنے لگے کہ صاحبو! اپنے لئے کوئی دوسرا امام تلاش کرلو یا علیحدہ علیحدہ نماز پڑھ لیا کرو، میں امامت کے لائق نہیں ہوں، کیونکہ اس وقت میرے دل میں یہ خطرہ آیا کہ چونکہ میرے برابر ساری جماعت میں کوئی شخص نہ تھا لہٰذا مجھ کو امام تجویز کیا گیا۔

یاد رکھو! کتنا بڑا عالم کیوں نہ ہو، یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا خاتمہ بخیر ہی ہو جائے۔ اور کیسا ہی جاہل کیوں نہ ہو، یہ یقین نہیں ہے کہ اس کا انجام بخیر نہ ہو اور بری حالت میں ہو۔ جب عالم ہو کر اتنا سمجھتے ہو تو پھر تکبر کس بنا پر کرتے ہو۔ کیا علم پر عمل کرنا تم پر فرض نہیں ہے؟ حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن عالم لایا جائے گا اور جہنم میں ڈال دیا جائے گا اس کی آنتیں اس کے گرد اس طرح گھومتی ہوں گی جس طرح چکی کے گرد گدھا گھومتا ہو یا کولھو کا بیل چکر لگاتا ہے، لوگ تعجب کے ساتھ پوچھیں گے کہ "آپ یہاں کیسے آئے؟" وہ کہے گا کہ میں اپنے علم پر عمل نہ کرتا تھا۔ دوسروں کو نصیحت کیا کرتا تھا، مگر اپنی خبر نہ لیتا تھا۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِنْہُ[1]۔

دیکھو! حق تعالیٰ نے بلعم باعور[2] کو، جو بڑا زبردست عالم تھا، اس گتے

---

[1] اے اللہ ہم کو اس سے محفوظ رکھ ۱۲

[2] حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا ایک عالم ۱۲

کی مثل فرمایا ہے جو زبان باہر نکال دے ، اور علمائے یہود کو گدھا فرمایا ہے، جس پر کتابیں لدی ہوئی ہیں ۔ اور یہ اسی لئے کہ وہ شہوات نفسانی میں گرفتار تھے، تکبر کرتے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھتے تھے ، دوسروں کو نصیحت کرتے تھے ، اور خود غافل تھے ۔

پس ان واقعات اور احادیث میں غور کرو گے تو تکبر جاتا رہے گا ۔ اور اگر اس پر بھی نہ جائے تو سمجھو کہ بے فائدہ علوم یعنی منطق و فلسفہ اور مناظرہ وغیرہ کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہنے کا ثمرہ ہے اور یا اپنی خباثت باطنی کا اثر ہے کہ اس کی وجہ سے دوا نفع نہیں دیتی بلکہ الٹا ضرر بڑھاتی ہے ، پس ان کے اثر کو کم کرنے کی کوشش کرو ۔

دوسرا تکبر کا سبب تقویٰ اور زہد ہے ۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ عابد بھی اکثر تکبر کرنے لگتا ہے ، اور بعض کی تو یہاں تک حالت ہو جاتی ہے کہ لوگوں کو ایذا پہنچانے کو اپنی کرامت سمجھنے لگتے ہیں ۔ مثلاً اگر کسی شخص سے ان کو ایذا پہنچے تو چلا کر کہتے ہیں کہ دیکھتے رہو اللہ تعالیٰ اس کو کیسی سزا دیتا ہے ، اس نے ہم پر ظلم تو کیا ہے ، مگر عنقریب سزا بھی ایسی ملے گی کہ یاد ہی تو رکھے گا ، اس کے بعد اگر تقدیر سے وہ شخص بیمار پڑ گیا یا مر گیا تو اپنے دعویٰ کا ثبوت بھی پیش کرتے اور کہتے ہیں کہ دیکھا اللہ کے فقیر بندوں کو ایذاء دینے کا کیا نتیجہ رہا ، اس احمق سے کوئی پوچھے کہ کافروں نے انبیاء علیہم السلام کو ہزار ہا ایذائیں پہنچائیں ، مگر کسی نے بھی انتقام کا فکر نہیں کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایذاء دینے والے کفار مشرف با یمان ہو گئے اور دنیا و آخرت کی بہبودی سے دامنوں کو بھر لیا ۔ اگر انبیاء علیہم السلام اپنے دشمنوں سے انتقام لیتے تو ان کا مرجانا چاہتے تو بھلا خدا کی مخلوق کیونکر ہدایت پاتی ، کیا کوئی عابد و ولی کسی نبی سے بڑھ سکتا ہے ، استغفر اللہ ۔ عابد کو ہر شخص کے سامنے تواضع کرنی چاہئے ۔

تقویٰ سے تکبر پیدا ہونے کا علاج

مثلاً کسی عالم گنہگار کو دیکھے تو اس کے سامنے علم کی وجہ سے جھک جائے اور اس کے گناہ کا خیال نہ کرے، کیونکہ علم کی بڑی فضیلت ہے۔ اور جاہل فاسق کو دیکھے تو یوں سمجھے کہ کیا خبر ہے، شاید اس کی باطنی حالت مجھ سے بدرجہا بہتر ہو، اور اس میں کوئی ایسی محمود صفت ہو جو اس کے ظاہری گناہوں کو چھپالے، اور میرے اندر کوئی ایسی خباثت ہو، جس کے باعث میری ظاہری عبادتیں بھی حبط ہو جائیں۔

سو حق تعالیٰ تو قلوب دیکھتا ہے۔ صورت کو نہیں دیکھتا۔ اور کسی کے قلب کا حال سوائے علام الغیوب کے دوسرے کو معلوم نہیں۔ پھر تکبر کیسا؟ علاوہ اس کے یہ کہ خود تکبر بھی تو ایک باطنی خباثت ہے۔ پس اپنی حالت کا بدتر ہونا تو خود ظاہر ہو گیا کہ اپنے اندر تکبر موجود ہے۔ اور وہ شخص جو فاسق نظر آرہا ہے، تکبر سے خالی ہے۔

بنی اسرائیل میں ایک فاسق شخص ایک مرتبہ ایک عابد کے پاس اس نیت سے آبیٹھا کہ حق تعالیٰ اس کی برکت سے مجھ پر رحم فرمادے گا، اس کو پاس بیٹھا دیکھ کر عابد اپنے دل میں کہنے لگا کہ مجھے اس سے نسبت کیا، کہاں یہ اور کہاں میں۔ اس کے بعد اس سے کہا کہ جاؤ دور ہو۔ اسی وقت اس زمانہ کے پیغمبر پر وحی نازل ہوئی کہ ان دونوں سے کہدو، کہ از سرِ نو عمل کریں، کہ بھلا کیا کرایا بُرا تھا یا بھلا دونوں کا حبط کر دیا گیا کہ فاسق کے گناہ محو ہو گئے اور عابد کی نیکیاں مٹ گئیں۔ اب آئندہ جیسا کریں گے ویسا بھریں گے۔

لے مٹ جائیں ۱۲

اسی طرح ایک گستاخ شخص ایک عابد کی گردن پر سجدہ کی حالت میں آسوار ہوا، عابد نے غصہ ہو کر کہا، واللہ! دفع ہو، اللہ تیری کبھی مغفرت نہیں کرے گا۔ اسی وقت الہام ہوا کہ بلکہ اے متکبر تیری مغفرت کبھی نہ ہوگی کیا میری مغفرت تیرے ہاتھ میں ہے، کہ قسم کھا کر سختی کے ساتھ ہمارے ایک بندہ کو اس سے نا امید بناتا ہے۔"

حضرت عطار سلمیؒ باوجود نہایت درجہ متقی اور عابد و زاہد ہونے کے جب کبھی تیز ہوا چلتی یا بادل گرجتا تو یوں فرمایا کرتے تھے، کہ "مجھ بدنصیب کی وجہ سے لوگوں پر مصیبت نازل ہوتی ہے، پس اگر عطار مر جائے تو ان مصیبتوں سے لوگوں کو خلاصی مل جائے۔"

دیکھو! اس اخلاص اور کثرت عبادت پر ان کو کس قدر تواضع اور خدا کا خوف تھا۔ اور اس زمانہ میں تو یہ حالت ہے کہ دو چار ظاہری اعمال پر نازاں ہوتے، اور حق تعالیٰ پر احسان جتاتے اور اس کی حکومت و سلطنت جبروتی کی باگ اپنے ہاتھ میں لینی چاہتے ہیں کہ کسی کو ماریں کسی کو جلائیں۔ حالانکہ ان عبادتوں میں ریا و سمعہ[1] کا احتمال جدا ہے اور انجام و خاتمہ کا خطرہ الگ۔

تیسرا سبب **نسب** ہے۔ کہ اپنے آپ کو شریف اور عالی خاندان سمجھ کر تکبر کرتے ہیں۔

حسب و نسب پر تکبر ہونے کا علاج اس کا علاج یہ ہے کہ اپنے نسب غور کرو کہ وہ کیا چیز ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص کا نسب اس کے باپ کا ناپاک نطفہ اور ذلیل مٹی ہی تو ہے کہ ہر

---

[1] دکھاوا اور سنانا ۱۲

شخص اسی سے پیدا ہوا ہے۔ پس دوسروں کے خصائل اور غیروں یعنی باپ دادا کی خوبیوں پر ناز کرنا کیسی غلطی کی بات ہے۔ اگر آباء واجداد کو گویائی مرحمت ہو تو یقیناً وہ بھی کہیں کہ "صاحبزادہ دوسروں کے محاسن پر فخر کرنے والا تو کون؟ تو تو ان کے پیشاب کا کیڑا ہے جنہوں نے قابل فخر کام کئے تھے۔" پس پیشاب کے کیڑے اور ناپاک نطفہ کو تو اپنی اصلیت دیکھنی چاہیئے نہ کہ آباؤ اجداد کے قابل تعریف اور بہادرانہ کام، کہ میرے باپ ایسے بہادر تھے، اور دادا ایسے سخی تھے۔ پھر اگر دنیاداروں کے نسب پر تکبر اور فخر کیا جائے تب تو حماقت کا کچھ ٹھکانہ ہی نہیں۔ کیا خبر ہے کہ وہ نسب والے کہاں گئے؟ ممکن ہے کہ جہنم کا کوئلہ بن گئے ہوں اور آرزو کرتے ہوں کہ کاش کتے اور سوٴر پیدا ہوتے تاکہ اس مصیبت سے نجات ملتی۔ پس ان کی حالت تو ایسی اندیشہ ناک اور ان کے صاحبزادے دنیا میں ان کی اولاد ہونے پر ناز کریں۔ اور اگر دینداروں کے نسب پر فخر و ناز ہو کہ ہم ایسے شیخ اور ولی کی اولاد میں ہیں تو اس تکبر میں دوسری حماقت ہے۔ کیونکہ ان کو جو کچھ عزت اور شرف حاصل ہوا تھا وہ ان کی دینداری اور تواضع کی بدولت ہوا تھا۔ سو جب وہ اپنی دینداری پر خود ہی متکبر نہ تھے تو ان کی اولاد کس عزت و شرافت پر تکبر کرتی اور ان کی ناخلف اولاد قرار پاتی ہے۔ دیندار آباء واجداد کا تو یہ حال تھا کہ وہ بعض وقت انجام و خاتمہ کے خوف سے لرزاٹھتے اور یہ تمنائیں کیا کرتے تھے کہ کاش گھاس ہوتے کہ کوئی جانور چرلیتا، کاش پرند ہوتے کہ کوئی شکاری جانور یا انسان کھالیتا۔ بھلا جن کو علم و عمل دونوں حاصل تھے وہ تو تکبر سے کوسوں بھاگتے تھے اور تم باوجودیکہ دونوں صفتوں سے بے بہرہ ہو محض ان کی اولاد ہو کر نسب پر فخر کرتے اور متکبر بنے جاتے ہو۔

مال اور جمال پر تکبر اور اس کا علاج

چوتھا سبب مال اور جمال ہے کہ آدمی اپنے مال یا حسن پر فخر کرتا ہے۔ سو ان چیزوں پر بھی تکبر کرنا حماقت ہے۔

بھلا مال جیسی ناپائدار چیز کہ ڈاکہ پڑ جائے یا کو بھل لگ جائے تو سب جاتا رہے۔ اسی طرح جمال جیسی عارضی چیز کہ جیسے بھر بخار آئے تو سارا حسن و جمال خاک میں مل جائے، اور چیچک نکل آئے تو صورت کا روپ بدل جائے، فخر کے قابل کس طرح ہو سکتے ہیں؟ حسین صورت اگر اندرونی نجاستوں میں غور کرے تو اپنے ظاہری جمال پر کبھی فخر نہ کرے۔ یاد رکھو کہ جس حسن و جمال کو بناوٹ اور آرائش کی حاجت ہے وہ ہرگز فخر کے قابل نہیں ہے۔ اگر ہفتہ غسل نہ کیا جائے تو دیکھ لو بدن کے رنگ و بو کا کیا حال ہوتا ہے۔ بلغم، تھوک، بول و براز جیسی نجاستوں سے سارا بدن بھرا ہوا ہے، پھر بھلا نجاست کے ڈھیر اور غلاظت کی کوڑی کو کیا زیبا ہے کہ اپنے آپ کو صاحب جمال سمجھے اور اس پر نازاں ہو اور متکبر ہو۔

نویں اصل

خودپسندی کا بیان

خودپسندی کی مذمت حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "نفس کو پاک صاف اور اچھا نہ سمجھا کرو" یہ کافروں کی شان ہے کہ اپنے اعمال اور اپنے آپ کو اچھا سمجھیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ "خودپسندی تباہ کردیتی ہے" کیونکہ آدمی جب اپنے آپ کو نیکوکار سمجھنے لگتا ہے تو مطمئن ہوجاتا ہے اور سعادت اخروی سے محروم ہوجاتا ہے۔ حضرت بشر بن منصور نے ایک مرتبہ نماز پڑھی اور دیر تک پڑھی۔ اتفاق سے ایک شخص ان کو دیکھ رہا تھا، چونکہ خودپسندی کے احتمال کا موقع تھا، اس لئے نماز سے فارغ ہوکر فرمانے لگے کہ "میاں میری اس حالت سے دھوکہ نہ کھائیو، شیطان نے چار ہزار برس اللہ کی عبادت کی مگر انجام اس کا جو ہوا وہ سب کو معلوم ہے" غرض مسلمان کی شان نہیں ہے کہ اپنی عبادت کو عبادت اور اپنی طاعت کو طاعت سمجھے۔ کیونکہ اول تو قبولیت کا علم نہیں ہے، جس سے معلوم ہو کہ عبادت واقع میں عبادت ہوئی یا یوں ہی بیکار گئی۔ دوم یہ کہ اعتبار خاتمہ کا ہے اور خاتمہ کا حال کوئی نہیں جانتا کہ کس حال پر ہونا ہے۔

نازاور خودپسندی اور تکبر کا فرق خودپسندی بھی تکبر کی ایک شاخ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تکبر میں دوسرے

لوگوں سے اپنے نفس کو بڑا سمجھا جاتا ہے، اور خود پسندی دوسرے لوگوں کی ضرورت نہیں بلکہ اپنے نفس کو اپنے خیال میں کامل سمجھ لینا اور حق تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو اپنا حق خیال کرنا یعنی ان کو اللہ کا فضل وکرم نہ سمجھنا اور ان کے زوال سے بے خوف ہو جانا خود پسندی اور عُجب کہلاتا ہے۔

نازکی علامت اگر یہاں تک نوبت پہنچ جائے کہ حق تعالیٰ کے نزدیک اپنے آپ کو ذی مرتبہ اور با وقعت سمجھنے لگے تو یہ ناز کہلاتا ہے۔ اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اپنی دعا کے قبول نہ ہونے سے تعجب اور اپنے موذی دشمن کو سزا و عذاب نہ ملنے پر حیرت ہوتی ہے کہ ہم جیسوں کی دعا قبول نہ ہو اور ہمارے دشمن پامال نہ ہوں۔

تنبیہ یاد رکھو کہ اپنی عبادت پر نازاں ہونا اور اپنے آپ کو مقبول خدا اور کسی قابل سمجھنا بڑی حماقت ہے۔ البتہ اگر اللہ کی نعمت پر خوش ہو اور اس کے چھن جانے کا بھی خوف دل میں رکھو اور اتنا ہی سمجھو کہ یہ نعمت حق تعالیٰ نے فلاں علم کے سبب مجھ کو مرحمت فرمادی ہے اور وہ مالک مختار ہے جس وقت چاہے لے لے، تو خود پسندی نہیں ہے۔ کیونکہ خود پسند شخص نعمت کا منعم حقیقی کی جانب منسوب کرنا بھول جاتا ہے اور جملہ نعمتوں کو اپنا حق سمجھنے لگتا ہے۔

غیر اختیاری خوبی پر ناز ہونے کا علاج خود پسندی بڑی جہالت ہے لہذا اس کا علاج کرنا چاہئے۔ پس اگر غیر اختیاری خوبیوں مثلاً قوت و زور یا حسن و جمال پر عجب ہو، تب تو یوں سوچو کہ ان چیزوں کے حاصل ہونے میں میرا دخل ہی کیا ہے کہ ناز کروں، حق تعالیٰ کا محض فضل و احسان ہے کہ اس نے بلا استحقاق یہ خوبیاں مجھ کو

عطا فرما دیں۔ علاوہ ازیں ظاہر ہے کہ یہ سب خوبیاں معرضِ زوال میں ہیں کہ ذرا سی بیماری اور ضعف لاحق ہوا تو سب جاتی رہیں گی۔ پس دوسرے کے ناپائدار عطیہ پر عجب کیسا ؟ اور اگر علم و عمل یا زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت یعنی اختیاری افعال پر ناز ہو تو اس میں غور کرو کہ یہ کمالات اور محاسن کیونکر حاصل ہوئے ؟ اگر حق تعالیٰ ذہنِ رسا، اور طاقت و ہمت، دماغ و بینائی، ہاتھ پاؤں، قصد و ارادہ مرحمت نہ فرماتا تو کوئی کمال کیونکر حاصل ہوتا۔ اسی کا حکم تھا کہ کوئی مانع پیش نہیں آیا ورنہ میں مجبور تھا کہ خود کچھ بھی نہ کر سکتا تھا، یہ ضرور مسلم ہے کہ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے جس سے وہ اچھے یا بُرے کام کرتا ہے۔ مگر اختیار و ارادہ کی عطا بھی تو اسی خدا کی ہے۔ اور پھر تمام اسباب کا مہیا کر دینا اور کامیابی دینا غرض ابتدا سے لیکر انتہا تک سب کچھ خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ پس ایسی حالت میں ناز کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ اگر خزانہ کی کنجی بادشاہ کے ہاتھ میں ہو اور وہ خزانہ کھول کر تمہارے سپرد کر دے اور تم اس میں سے جواہرات اپنی خواہش کے مطابق اپنی گود میں بھر لو اور پھر ناز کرنے لگو کہ میں نے اتنا روپیہ حاصل کیا تو ظاہر بات ہے کہ احمق سمجھے جاؤ گے۔ کیونکہ اگرچہ جواہرات کے سمیٹنے والے تم تھے مگر خزانہ تو شاہی تھا، اور کنجی تو بادشاہ ہی کے ہاتھ میں تھی، اسی نے تم پر احسان کیا اسی نے کنجی عطا فرمائی اور اسی کی اجازت سے تم خزانہ کی کوٹھڑی میں داخل ہوئے پھر اتنی بے اختیاری پر تم کو اپنے فعل پر ناز اور خود پسندی کیونکر درست ہو سکتی ہے۔

عبادات وغیرہ اختیاری خوبیوں پر نازاں ہونے کا علاج؛

تعجب تو اس بات پر آتا ہے کہ عاقل و سمجھدار اور پڑھے لکھے ہوشیار لوگ اس موقع

پر جاہل بن جاتے ہیں اور اپنی عقل و علم پر ناز کرنے لگتے ہیں، کہ اگر کسی جاہل و بے وقوف کو تونگر پاتے ہیں تو تعجب کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ ہم تو عالم و عاقل ہو کر مال سے محروم رہیں اور یہ جاہل و نادان ہو کر مالدار و متموّل بن جائے؟ بھلا کوئی پوچھے، علم و عقل تم کو نصیب ہوا اور جاہل اس سے محروم رہا، ایسا کیوں ہوا؟ کیا ایک نعمت کو دوسری نعمت کا سبب سمجھ کر اس پر استحقاق جتاتے ہو؟ اگر علم اور مال دونوں چیزیں تم ہی کو دیدی جاتیں اور جاہل فقیر دونوں سے محروم کر دیا جاتا تو یہ بات درحقیقت زیادہ تعجب کی تھی کہ مخلوق میں ایک کو تو سب کچھ مل گیا اور دوسرے کو کچھ بھی نہ ملا۔ بھلا کوئی بادشاہ تم کو گھوڑا مرحمت فرماوے اور دوسرے شخص کو غلام دیوے تو کیا یوں کہنے کی تم کو ہمت ہے کہ واہ صاحب اس کو غلام کیوں دیا گیا اس کے پاس گھوڑا تو ہے ہی نہیں، اور میں چونکہ گھوڑا رکھتا ہوں لہٰذا غلام بھی مجھ ہی کو ملنا چاہیئے تھا۔ ایسا خیال کرنا بڑی بیوقوفی اور جہالت کی بات ہے عقلمندی کی بات یہی ہے کہ عطائے خداوندی پر شکر ادا کرو اور سمجھ لو کہ حق تعالیٰ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے ابتداءً بلا استحقاق مجھ پر کرم فرمایا اور عقل و علم جیسی نعمت بخشی جس کے مقابلہ پر مال کی کوئی حقیقت ہی نہیں اور پھر شکر گذاری و عبادت کی توفیق مرحمت فرمائی، اور دوسروں کو اس سے محروم رکھا۔ حالانکہ یہ محرومی بھی کسی جرم سابق کی سزا یا قصور کا بدلہ نہیں ہے۔ پس جب ایسا خیال کرو گے تو خوف الٰہی پیدا ہوگا اور سمجھو گے کہ جس نے بلا استحقاق انعام فرمایا ہے۔ وہ اگر بلا قصور اس نعمت کو چھین بھی لے تو کوئی چون و چرا نہیں کر سکتا اور کیا خبر ہے کہ یہ نعمت مکر اور استدراج[1] ہو اور

---

[1] ڈھیل ۱۲

وبالِ جان اور عذاب کا سبب بن جائے۔ کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہو کہ
"ہم نے ان پر ہر نعمت کے دروازے کھول دیے یہاں تک کہ جب وہ
خوش ہو گئے اور پھولے نہ سمائے تو یکایک ان کو پکڑ لیا"
جب یہ خیالات ذہن نشین ہوں گے تو خشیت اور خوف تم سے کسی
وقت بھی دور نہ ہوگا۔ اور کسی نعمت پر نازاں اور خوش نہ ہوؤ گے، پس
عجب سے بآسانی نجات مل جائے گی۔

دسویں فصل

ریاء کا بیان

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "افسوس ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں جو دکھاوا کرتے ہیں۔" ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اعمال میں اخلاص پیدا کرے اور ریاء و نمود سے اپنے اعمال اور طاعتوں کو بچائے، کیونکہ ریا شرک اصغر ہے۔

ریاء و نمود کا صلہ یعنی شہرت دنیا میں پورا ہوگا

حدیث[1] میں آیا ہے کہ "قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ بندوں کو جزاء و سزا دے گا اور انعامات عطا فرمائے گا، تو ریاکاروں کو حکم دے گا کہ انہیں کے پاس جاؤ جن کے دکھانے کو نمازیں پڑھتے اور عبادتیں کیا کرتے تھے، اپنی عبادتوں کا ثواب انہیں سے لو، دیکھو کیا دیتے ہیں۔"

دوسری طویل حدیث[2] میں آیا ہے کہ قیامت کے دن احکم الحاکمین کی شاہنشاہی عدالت میں غازی اور عالم اور سخی کی پیشی ہوگی اور تینوں اپنے جہاد فی سبیل اللہ، تعلیم و تعلم اور مشغلۂ علم دین اور اپنی خیرات و صدقات

---

[1] احمد و بیہقی۔ راوی ثقہ ہیں ۱۲ [2] مضمون مسلم ۱۲

کا اظہار کریں گے۔ حکم ہوگا کہ "یہ سب اعمال تم نے چونکہ محض دکھاوے اور نام کیلئے اسی غرض سے کئے تھے تاکہ لوگ کہیں کہ فلاں شخص غازی ہے فلاں شخص بڑا عالم ہے فلاں شخص بڑا سخی ہے۔ سو یہ باتیں حاصل ہولیں کہ دنیا میں تم کو شہرت حاصل ہوئی اور لوگوں نے تم کو غازی اور عالم اور سخی کہکر پکارا پھر جس مقصود کیلئے اعمال کئے تھے، جب وہ حاصل ہوچکا تو اب کیا استحقاق رہا۔ اور یہاں کیا چاہتے ہو، لہذا جاؤ جہنم میں۔"

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "جس عمل میں ذرہ برابر بھی ریار ہوگا اس کو حق تعالیٰ ہرگز قبول نہ فرمائے گا۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو بگوش ہوش سنو! اور عبرت پکڑو۔

حضرت عیسی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص روزہ رکھے تو اس کو چاہیے کہ اپنے سر اور ڈاڑھی اور ہونٹوں کو چکنا کرلیا کرے تاکہ لوگ اس کو روزہ دار نہ سمجھیں، اور خیرات کیا کرے تو اس طرح کرے کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو، اور نماز پڑھے تو پردہ کر لیا کرے تاکہ کوئی دیکھے نہیں۔"

اسی لئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو جو اپنے سر جھکائے بیٹھا تھا، تنبیہ کے طور پر یوں فرمایا تھا کہ "میاں گردن اٹھاؤ خشوع قلب سے ہوا کرتا ہے، نہ کہ گردن سے۔"

ریار کی ماہیت اور شرک ہونا

ریار کی اصلیت یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اپنی عبادت اور عمل خیر

لے یہ حدیث نہیں بلکہ یوسف بن اسباط کا قول ہے ۱۲ شرح احیار العلوم

کے ذریعہ سے وقعت اور منزلت کا خواہاں ہو ، اور یہ عبادت کے مقصود کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ عبادت سے مقصود حق تعالیٰ کی رضامندی ہے۔ اور اب چونکہ اس مقصود میں دوسرا شریک ہوگیا کہ رضائے خلق وحصول منزلت مقصود ہے لہٰذا اس کا نام شرک اصغر ہے۔

ریا کی صورتیں یاد رکھو کہ ریا چھ طرح سے ہوا کرتا ہے۔

اوّل ۔ بدن کے ذریعہ سے ، مثلاً شکستگی وضعف اور غنودگی اور پلکوں کا جھپکانا ظاہر کیا جائے تاکہ روزہ دار اور شب بیدار خیال کریں۔ یا مثلاً غمگین صورت بنائے تاکہ لوگ سمجھیں کہ ان کو آخرت کی بڑی فکر ہے۔ یا مثلاً پراگندہ حال رہے تاکہ لوگ سمجھیں کہ دین میں اس قدر مشغول ہیں کہ بال سنوارنے کی بھی فرصت نہیں اور نہ خط بنوانے کا موقع ملتا ہے۔ یا مثلاً آواز پست اور آہستہ نکالے تاکہ لوگ سمجھیں کہ ریاضت ومجاہدہ کرتے کرتے اتنا ضعف ہوگیا ہے کہ آواز تک نہیں نکلتی۔

دوم ۔ ہیئت کے ذریعہ سے ۔ مثلاً رفتار میں نرمی اور ضعف ظاہر کرنا یا سر جھکانا۔ مونچھوں کا منڈوا لینا۔ سجدہ کے نشان کا باقی رکھنا۔ آنکھ کا بھینچنا اور ایسی صورت بنانا جس سے لوگ سمجھیں کہ حالت وجد میں ہیں ، یا مکاشفہ میں مشغول ہیں اور فکر کے اندر مستغرق اور محو ہیں۔

سوم ۔ شکل وشباہت ولباس میں ۔ مثلاً صوف اور موٹے جھوٹے کپڑے پہننا۔ پنڈلی تک پائنچہ چڑھانا ۔ کپڑوں کا بوسیدہ اور میلا کچیلا رہنا تاکہ لوگ سمجھیں کہ صوفی صاحب ہیں ، حالانکہ تصوف سے اتنے کورے ہیں کہ اس کی حقیقت وماہیت بھی نہیں جانتے۔ یا چوغہ یا ڈھیلی آستینوں کا جبّہ

پہننا تاکہ لوگ عالم سمجھیں ۔ یا عمامہ پر رومال باندھے رکھنا اور جرابیں پہنے رہنا تاکہ لوگ سمجھیں کہ اس درجہ متقی ہیں کہ راستہ کے گرد وغبار تک سے پرہیز کرتے ہیں کہ خدا جانے کس کی ملکیت ہوگی ۔

پھران میں بھی دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں :

دینداروں میں نمود و وقعت کی طلب سے

بعض تو وہ لوگ ہیں جو صوفیوں اور دینداروں کے دلوں میں قدر و منزلت کے طالب ہوتے ہیں ۔ اور ہمیشہ اسی نیت سے میلے کچیلے پرانے کپڑے پہنتے اور اس حالت میں رہتے ہیں کہ اگر کوئی نیا کپڑا جس کا پہننا شرعاً مباح ہو اور سلف نے بھی ایسا لباس پہنا اور استعمال کیا ہو ان کو دیا جاوے کہ اس کو پہن لیجئے، تو ان کو ایسا ناگوار گذرتا ہے جیسے کسی نے ذبح کر دیا ۔ اور وجہ اس کی یہی ہے کہ اس سے ان کا مطلب فوت ہوا جاتا ہے ۔ کیونکہ لوگ صاف ستھرا کپڑا پہنے دیکھیں گے تو ان کی وہ قدر نہ کریں گے جو میلے کپڑوں میں کرتے تھے ، بلکہ یوں کہیں گے کہ اب صوفی صاحب کے زہد میں کمی آگئی اور تصوف کا رنگ بدل چلا ۔

امرا میں نمود و عزّت کی طلب

بعض لوگ امیروں اور تاجروں میں وقعت پیدا کرنے کے خواہشمند ہوتے اور سوچتے ہیں کہ اگر پرانے پھٹے کپڑے پہنے تب تو امرا کی نظروں میں وقعت نہ ہوگی ، بلکہ ان کو ہمارے پاس بیٹھنے سے بھی نفرت ہوگی ۔ اور اگر لباس فاخرہ پہنا تو لوگ زاہد اور صوفی نہ سمجھیں گے لہذا ایک نئی صورت اختیار کرتے ہیں کہ بیش قیمت باریک کپڑوں کو گیروا یا آسمانی رنگ کا رنگوا لیتے ہیں ۔ اگر ان کی قیمت دیکھئے تو شاہانہ لباس کے برابر ہے اور رنگ و روپ ملاحظہ کیجئے تو درویشانہ

صوفیانہ ہے ، اس طرح پر اپنا مطلب حاصل کرتے اور ریاکار بنتے ہیں چنانچہ اگر ان کو موٹے کپڑے پہنے کو دے جائیں اور کہا جائے کہ ان کو پہن لیجئے تو سخت ناگوار گذرتا ہے۔ کیونکہ ایسے کپڑوں کا پہننا امیروں کی نظروں سے گر جانے کا سبب ہے۔ اور اگر پشمینہ یا بانات یا کوئی دوسرا بیش قیمت کپڑا جو شرعاً مباح اور جائز ہو انہیں پہنایئے تو وہ بھی موت سے زائد ہے۔ کیونکہ اس کو پہن کر لوگوں میں زاہد اور صوفی نہ سمجھے جاویں گے اور گویا درویشوں کی جماعت سے خارج ہو جاویں گے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ ان کا لباس ریاکاری کا لباس ہے۔ اللہ پناہ میں رکھے۔

چہارم ۔ گفتگو اور زبان سے ریا کیا جاوے جیسا کہ تم نے بعض دنیا دار واعظوں کو دیکھا ہوگا کہ زبانیں موڑ موڑ کر مقفیٰ و مسجع عبارتیں بنا بنا کر سلف صالحین کی نقل اتارتے اور محض دکھاوے کی غرض سے کبھی آواز کا لہجہ پتلا بناتے ہیں اور کبھی غمگین کہ دل میں تو اثر خاک بھی نہیں مگر بناوٹ اور تصنع یوں بتا رہا ہے کہ بڑے عالم اور صوفی ہیں کہ بالکل سلف کا نمونہ ہیں۔ اسی طرح مثلاً حفظِ حدیث اور مشائخ وعلمائے زمانہ سے ملاقات کا دعویٰ اور اظہار کرنا کہ فلاں بزرگ کی ہم نے زیارت کی اور فلاں شیخ سے ملے۔ یا مثلاً کسی حدیث کے متعلق صحیح یا ضعیف کہنے کا جلدی سے حکم لگا دینا تاکہ لوگ محقق اور محدث سمجھیں۔ یا بدکاری ومعصیت کے تذکرے پر زبان سے آہ اور ہائے افسوس کے کلمے نکالنا یا خلاف شرع باتوں سے نفرت ظاہر کرنا اور کڑھنا حالانکہ ان کے دل میں رنج یا نفرت کا اثر نام کو بھی نہیں ہوتا بلکہ سب کچھ محض اس غرض سے ہوتا ہے کہ لوگ ان کو پارسا اور اللہ والا متبع شریعت سمجھیں۔

❊ ❊ ❊

افعال اور اعمال میں ریاء

پنجم ۔ عمل میں ریاء مثلاً قیام زیادہ کرنا رکوع وسجدہ میں دیر تک رہنا سر جھکانا کسی طرف توجہ نہ کرنا ، پلکوں کو جھکائے رکھنا وغیرہ۔ تاکہ لوگ ان کو عابد وزاہد اور باعفت وپارسا سمجھیں۔ حالانکہ اللہ خوب جانتا ہے کہ ان کے دل ان خوبیوں سے خوب کورے اور خالی ہیں ۔ اور اس کی شناخت یہ ہے کہ جب اکیلے نماز پڑھتے ہیں، تو تھوڑا سا چھوڑ دیتے ہیں ۔ اور اگر کسی کو معلوم کرلیں کہ وہ ان کی نماز کو دیکھ رہا ہے تو فوراً سکینت[1] و وقار کے ساتھ نماز کو ٹھیرا ٹھیرا کر پڑھنے لگتے ہیں۔ تاکہ دیکھنے والا سمجھے کہ ان کی نماز خشوع[2] اور خضوع سے بھری ہوئی ہے ۔ تم ہی بتاؤ کہ یہ ریاء نہیں تو اور کیا ہے ؟

ششم ۔ اپنے شاگردوں اور مریدوں کی کثرت اور مشائخ کی کثرت کا تذکرہ کرنا تاکہ لوگ سمجھیں کہ ان کی بڑے بڑے مشائخ سے ملاقات ہوئی ہے اور بعض لوگ اس کے خواہاں ہوتے اور تدبیر کرتے ہیں کہ کسی طرح سلاطین و امراء اور علماء وصلحاء ان کی زیارت کرنے کو آنے لگیں تاکہ ان کی شہرت ہو جائے کہ فلاں شخص ایسے بزرگ ہیں کہ ان کی خدمت میں ایسے ایسے بڑے لوگ حاضر ہوتے ہیں، اور بادشاہ و عالم سب ہی آستانہ بوسی[3] کو اپنی عزت سمجھتے ہیں ۔ یاد رکھو کہ یہ سب دین میں ریاکاری ہے ، اور ریا حرام اور کبیرہ گناہ ہے ۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے ۔

فصل

ریا کے حرام ہونے کی دو وجہ ہیں :۔

---

[1] آہستگی ۱۲ [2] عاجزی وانکساری ۱۲ [3] چوکھٹ چومنا ۱۲

ریاء کے حرام ہونے کی وجہ اوّل

اوّل تو یہ کہ اس میں لوگوں کو دھوکہ دے کر اپنا معتقد بنانا لازم آرہا ہے۔ اور دھوکہ دینا حرام ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کسی کو ایسی طرح روپیہ دے کہ دیکھنے والے یوں سمجھیں کہ اس کو ہبہ کررہا ہے حالانکہ وہ ہبہ نہیں کرتا بلکہ اس کو قرض دیتا ہے، تو چونکہ اس میں بھی دھوکہ لازم آرہا ہے اس لئے یہ بھی معصیت ہے۔ چہ جائیکہ بناوٹ اور تصنع کی صورت بناکر لوگوں کے خیالات میں اس بات کا ڈالنا کہ یہ نیکوکار اور قابل تعظیم ہیں اور اس طرح پر لوگوں کے دلوں پر قبضہ کرنا۔ سو اس کے دھوکہ ہونے میں کون شبہ کرسکتا ہے۔ پھر ایسے مکار شخص کو فاسق کیونکر نہ کہا جائے۔

وجہِ دوم

ریاکاری حق تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص بادشاہ کے حضور میں خادم بنکر کھڑا ہو اور اس کھڑا ہونے سے اس کی غرض اپنے آپ کو شاہی خدمت گار اور ذلیل و محتاج غلام ظاہر کرنے کی نہ ہو، بلکہ بادشاہ کے غلاموں میں سے کسی کو تکنا یا کسی کنیز کو گھورنا مقصود ہو، تو ظاہر ہے کہ وہ بادشاہ کے دربار کا گستاخ سمجھا جائے گا، اور بے ادبی کا مجرم قرار پائے گا۔ اسی طرح جب عبادت میں حق تعالیٰ کی خوشنودی مقصود نہ ہوئی بلکہ بندوں کی رضا مطلوب ہوئی کہ وہ اس کو نیکوکار سمجھیں اور اس کے معتقد ہوں تو گویا بندوں کو خدا کی بہ نسبت اپنے نفع اور نقصان پر زیادہ قادر سمجھا اور دل میں بندوں کی یہاں تک عظمت بٹھالی کہ عبادت بھی انھیں کے نذر گزار دی۔

ریاء کی کیفیت میں کمی بیشی پر گناہ کی زیادتی

ریاء کو شرک اصغر کہا گیا ہے پھر اس غرض اور نیت

میں جتنا فساد زیادہ ہوگا اسی قدر گناہ بھی زیادہ ہوگا۔ کیونکہ

بعض ریاکاروں کا مقصود تو صرف یہی ہوتا ہے، کہ لوگ ہماری عزت کیا کریں اور ہمیں متقی سمجھیں۔

بعض کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لوگ ہم کو دیندار سمجھ کر ہمارے پاس امانتیں رکھیں، ہم کو اپنی اوقاف کا متولی بنائیں، یا یتیموں کا مال ہماری سپردگی دیں، پس ان کو اپنے قبضہ میں لاکر اڑانے کھانے کا موقع ملے۔ ظاہر ہے کہ اس کا گناہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ ہے۔

بعض کا منشا یہ ہوتا ہے کہ ہم کو نیک بخت سمجھ کر عورتیں اور لڑکے ہمارے پاس آنے لگیں اور اس ٹٹی کی اوٹ میں شکار کھیلنے یعنی زنا ولواطت کرنے کا بخوبی موقع ملے یا ان ضعیف دل عورتوں بچوں سے مال ہمارے ہاتھ آئے اور اس کو فسق وفجور اور لہو ولعب میں خرچ کرسکیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس کا گناہ پہلی دونوں صورتوں سے زیادہ ہے۔ کیونکہ اس شخص نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو معصیت کا آلہ اور جبار وقہار پروردگار کی مخالفت کا وسیلہ بنالیا ہے۔ (والعیاذ باللہ)

فصل

عبادت کے فرق سے ریار کی کمی بیشی!!

اسی طرح جن عبادتوں میں ریار ہوتا ہے وہ بھی مختلف درجہ کی ہیں کہ ان میں بعض کا گناہ بعض سے بڑھا ہوا ہے :۔

اوّل : اصل ایمان میں ریار، جیسے منافق کہ اس کے دل میں ایمان تو نام کو بھی نہیں مگر اس نے اپنی صورت مسلمانوں کی سی بنا رکھی ہے تاکہ لوگ کافر سمجھ کر اس کے جان اور مال کو حلال نہ سمجھیں۔ یا مثلاً ملحد ومرتد جس کا ایمان

جاتا رہا مگر وہ کسی مصلحت یا لحاظ سے اپنے آپ کو مسلمان ہی ظاہر کر رہا ہے اس ریا کا گناہ بہت سخت ہے۔ چنانچہ کلام مجید میں مذکور ہے کہ "منافق جہنم کے سب سے نیچے کے طبقہ میں جائیں گے"

دوسرا درجہ اصل عبادتوں میں ریا کرنے کا ہے۔ مثلاً لوگوں کے سامنے نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا اور اگر تنہا ہوں کہ کوئی شخص پاس نہ ہو تو نہ نماز ہے نہ زکوٰۃ۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبادت یہ محض لوگوں کو دکھانے کی تھی ہمگر اللہ تعالیٰ تو دلوں کے حالات سے واقف ہے وہ خوب جانتا ہے کہ عبادت کس نیت سے ہو رہی ہے۔ لہٰذا اس کا درجہ اگرچہ پہلے درجہ سے کم ہے مگر تاہم سخت اور شرک اصغر ہے۔

تیسرا درجہ جو سب میں ادنیٰ ہے یہ ہے کہ فرائض عبادتوں میں تو ریا نہ ہو مگر مستحب اور نوافل عبادتیں لوگوں کے دکھلانے کو کی جائیں۔ مثلاً اگر لوگ موجود ہوں تو نفلیں زیادہ پڑھے اور فرضوں کو بھی سنبھال کر ادا کرے جب عرفہ[1] اور عاشورہ[2] کا دن آئے تو اس کا روزہ بھی ضرور رکھے۔ اگر زکوٰۃ کا وقت ہو تو لوگوں کی موجودگی میں اس مد کے اندر عمدہ اور نفیس مال نکالے اور اگر سفر وغیرہ کی حالت یا خلوت وعلیحدگی کا وقت ہو تو نہ نماز ٹھیک طرح ادا ہو نہ وہ نفل نمازیں قائم رہیں اور نہ نوافل روزے رکھے جائیں۔ فرض نماز بھی پڑھے تو کوے کی سی ٹھونگیں گویا از بریاد ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ تو ضرور دیتا ہے مگر سر کے اوپر سے محض بوجھ اتارنے کیلئے ردی مال سے زکوٰۃ دیتا ہے۔ پس اس کا گناہ ایمان اور فرائض میں ریا کرنے کے گناہ سے کم ہے،

---

[1] ۹ ذی الحجہ ۱۲ [2] عاشورہ ۱۰ محرم ۱۲

مگر یہ بھی حرام ہے اور دین کی بربادی کیلئے کافی ہے۔

ریاء کے قصد میں تفاوت کی وجہ سے سزا میں کمی بیشی

یہ بھی یاد رکھو کہ ریاء کے قصد میں تفاوت کی وجہ سے بھی گناہ کے اندر بھی کمی بیشی ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک صورت تو یہ ہے کہ عبادت سے مقصود محض دکھاوا ہو کہ عبادت کا قصد ہی نہ ہو مثلاً بلا وضو لوگوں کے دکھانے کو نماز پڑھنا یا لوگوں کے دکھاوے کو روزہ رکھنا کہ خلوت میں گئے اور افطار کر لیا۔ پس اس کا گناہ تو نہایت ہی سخت ہے۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ عبادت بھی مقصود ہو اور اس کے ساتھ ہی اس میں ریا کی بھی آمیزش ہو۔ سو اس کے تین درجے ہیں :

پہلا درجہ تو یہ ہے کہ مقصود محض عبادت ہے جس کی صورت یہ ہے کہ اگر تنہا ہوتا تب بھی نماز پڑھتا، جیسے لوگوں کی موجودگی میں پڑھ رہا ہے۔ مگر چونکہ دوسرے نے نماز پڑھتے ہوئے اس کو دیکھا ہے اس لئے طبیعت اس کی خوش ہو گئی اور نماز کا پڑھنا اس کو گراں معلوم نہ ہوا۔ پس اگر اتنی ہی بات ہو تب تو امید ہے کہ حق تعالیٰ اس عبادت کو قبول فرمالے اور اس پر ثواب بھی مرحمت فرمادے۔ باقی یہ دوسری بات ہے کہ اس ریا کی سزا بھی دے یا اس کی وجہ سے عبادت کے اجر و ثواب میں کمی فرمادے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ عبادت کا قصد مغلوب اور دکھاوے کا خیال غالب ہو، یعنی یہ حالت ہے جتنی عبادت لوگوں کی موجودگی میں کرتا ہے تنہائی اور خلوت کی حالت میں اتنی عبادت ہرگز نہیں ہو سکتی۔ پس یہ عبادت جس کی ریاکاری کی یہ حالت ہو کسی طرح بھی قبول ہونے کے قابل نہیں ہے کیونکہ اس میں عبادت کا بھی اگرچہ ذرا سا قصد اور ارادہ شامل ہے مگر وہ اتنا مغلوب

ہے کہ اس کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ لہذا اس کو صریح ریاکاری سمجھا جائے گا اور ایسی عبادت پر سخت عذاب کا اندیشہ ہے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ عبادت اور ریا دونوں مساوی اور برابر ہیں۔ مثلاً عبادت سے جس قدر طاعت خداوندی مقصود ہو اسی قدر لوگوں کو دکھلانا بھی مقصود ہو، یہ ایسی حالت ہے جس میں نفع اور نقصان چونکہ برابر ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس پر نہ عذاب ہو اور نہ ثواب ملے مگر چونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "جملہ شرکا میں سب سے زیادہ شرکت سے بے نیاز میری ذات ہے۔" لہذا کچھ عجب نہیں کہ اس صورت میں بھی نقصان کو نفع پر ترجیح دیکر عبادت کو باطل کہا جاوے۔ پس غیب کی خبر تو خدا کو ہے کہ ایسے شخص سے کیا معاملہ ہوگا مگر بظاہر بہر حال یہ حالت گناہ سے خالی معلوم نہیں ہوتی۔

فصل

ریائے جلی و خفی اور اخفیٰ اور اشد خفاء ریا کبھی تو جلی و ظاہر ہوتی ہے مثلاً یہ حالت کہ تنہائی میں ایسی عبادت نہیں ہوتی جیسی لوگوں کے سامنے ہوتی ہے۔ اور کبھی خفی اور پوشیدہ ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص تہجد پڑھتا تو ہمیشہ ہے مگر جب کوئی مہمان آجاتا ہے تو اس کے سامنے تہجد کے لئے اس کا نشاط اور مسرت زیادہ ہو جاتی ہے پس یہ بھی تو ریا ہے مگر پہلے کی نسبت اس میں خفا ہے اور اس سے زیادہ مخفی یہ ریا ہے کہ کسی کے موجود ہونے سے نشاط میں بھی زیادتی نہ ہو مگر اثنا ئے عبادت میں یا عبادت سے فارغ ہونے کے بعد اگر کوئی شخص اس عبادت

---

۱ پوشیدہ ۱۲ ۲ پوشیدہ کیا ہوا ۱۲ ۳ درمیان ۱۲

پر مطلع ہو جائے تو اس کے دل میں ایک قسم کی فرحت اور خوشی پیدا ہو جاتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ دل کے اندر ریا اس طرح چھپا ہوا ہے جیسے راکھ کے اندر آگ چھپی ہوتی ہے کہ دوسروں کے مطلع ہونے پر اسی لئے تو سرور پیدا ہوتا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ خفی ریا یہ ہے کہ اطلاع سے بھی خوشی نہ ہو لیکن اس کا آرزومند رہے کہ کاش لوگ میری تعریف کریں، سلام اور مصافحہ میں ابتداء اور معاملات میں میری رعایت کریں اور اگر کوئی شخص اس کے ساتھ کچھ برائی کر بیٹھتا ہے تو اس کو تعجب ہوتا ہے۔ یاد رکھو کہ یہ بھی ریا ہے کیونکہ ان خیالات اور آرزوؤں سے معلوم ہوا کہ لوگوں پر اپنی طاعت و عبادت کا احسان رکھنا چاہتا ہے اور اگرچہ لوگوں سے اس نے اپنے ریا کو چھپا رکھا ہے مگر اس کا اتنا اثر ضرور ظاہر ہے کہ توقیر اور احترام کی خواہش ہے۔ اس قسم کے ریا بھی جن سے صدیقین ہی خالی ہوتے ہیں، گناہ میں داخل ہیں اور اعمال حبط ہو جانے کا اندیشہ ضرور ہے۔

البتہ اگر اس عبادت پر لوگوں کے مطلع ہو جانے سے خوشی اس بنا پر ہوئی ہو کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے نیک عمل اور فعل جمیل ہی کا اظہار فرمایا اور ہماری کسی معصیت یا فعل قبیح پر کسی کو مطلع نہیں ہونے دیا محض اپنے فضل سے شانِ ستاری کا ظہور فرمایا، اگرچہ میں، طاعت ہو یا معصیت، دونوں میں سے کسی کا اظہار بھی نہیں چاہتا تھا، مگر خیر الحمدللہ لوگ مطلع ہوئے تو فعل جمیل ہی پہ ہوئے فعل شنیع پر نہ ہوئے۔

یا مثلاً اس وجہ سے خوشی ہو کہ اس عبادت پر لوگوں کے مطلع ہونے سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ حق تعالیٰ قیامت کے دن بھی مجھ سے اچھا ہی معاملہ

۱؎ پوشیدہ ۱۲ ۲؎ ساقط ۱۲ ۳؎ عمدہ کام ۱۲ ۴؎ برا کام ۱۲ ۵؎ گناہ ہیں گو صغیرہ ۱۲ مولانا تھانویؒ

فرمائے گا۔ کیونکہ دنیا میں ستاری فرمانا علامت ہے کہ آخرت میں بھی رسوائی سے بچائے گا۔

یا اس وجہ سے خوشی ہو کہ اس اطلاع کے سبب دوسروں کو بھی ہمت ہوگی اور میرا یہ فعل دوسروں کی عبادت کا سبب بن جائے گا۔ تو اس قسم کی خوشی میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

اور اس کی علامت یہ ہے کہ دوسرے شخص کی عبادت پر بھی کوئی مطلع ہو جائے تو اس اطلاع سے بھی اس کو اتنی ہی خوشی ہوتی ہو جتنی اپنی عبادت پر دوسروں کے مطلع ہونے سے ہوتی ہے۔ کیونکہ کسی کی عبادت دیکھ کر لوگوں کا اس عبادت میں رغبت وہمت کرنا اپنی عبادت ہو یا دوسرے کی دونوں صورت میں حاصل ہے۔ پس اگر مطلع ہونے والے کی اس عبادت میں رغبت وہمت کرنے کا خیال اس خوشی کا سبب ہوا ہوگا تو اپنا نفس اور غیر دونوں اس خوشی میں ضرور مساوی ہوں گے۔

چونکہ ریا کا مادہ نظر سے پوشیدہ ہوتا اور لوگوں کے دلوں پر چپکے چپکے حملہ کر کے بُرا اثر ڈالا کرتا ہے لہٰذا متقدمین نے اس میں بہت ہی کچھ احتیاط ملحوظ رکھی اور اپنی عبادتوں کو لوگوں کی نظروں سے بے حد مخفی رکھا ہے۔

گمنامی کا دینی فائدہ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن اُمراء سے خطاب ہوگا کہ کیوں صاحبو! کیا ہم نے تمہارے لئے ارزانی نہیں رکھی تھی، کیا تم کو لوگ سلام میں ابتداء نہیں کرتے تھے، کیا تمہاری ضرورتیں دوسروں کی بہ نسبت جلد رفع نہیں ہوتی تھیں، پس چونکہ تم اپنے اعمال کا بدلہ دنیا میں لے چکے ہو، لہٰذا یہاں تمہارے لئے کچھ نہیں رہا ہے

پس اے مسلمانو ! اگر خلاصی چاہتے ہو تو لوگوں کو چوپاؤں اور بچوں کی طرح لایعقل سمجھو کہ ان کا موجود ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہوں، ان کا جاننا اور نہ جاننا ان کی واقفیت اور عدم واقفیت غرض کوئی بات بھی قابل اعتبار نہ رہے۔ پس چونکہ خدا ہی کا جاننا کافی ہے لہٰذا اپنی عبادت اسی کو دکھلاؤ۔ کیونکہ وہی جزا دے سکتا ہے اور وہی عبادت کا قدردان ہے۔ باقی اس کے سوا تو دنیا اور دین میں کوئی بھی ایسا نہیں جو کسی کو کچھ بھی دے سکے۔ اگر ایسا کرو گے تو اپنی عبادتوں سے ضرور نفع پاؤ گے ورنہ سخت ضرورت کے دن یعنی میدان حشر میں خالی ہاتھ رہ جاؤ گے۔

فصل

شاید تمہارا یہ خیال ہو کہ اس قسم کے خفی ریا سے تو بچنا محال ہے البتہ جلی ریا سے آدمی بچ سکتا ہے پھر نہ معلوم کون سی عبادت صحیح ہے اور کونسی فاسد، لہٰذا ہم اس کی بھی تشریح کئے دیتے ہیں۔

عبادت میں ریا تین قسم کی ہوتی ہے۔

شروع عبادت میں ریا۔ یا تو اول ہی سے ہو، مثلاً نماز کا پڑھنا اول سے لیکر آخر تک سارا محض لوگوں کے دکھانے اور نمازی کہلانے کو ہو۔ یہ صورت تو نماز کیلئے مفسد ہے کہ ایسی نماز ہی صحیح نہ ہوگی کیونکہ اس میں عبادت کی نیت ہی نہ ہوتی اور بلا نیت کے کوئی عبادت

لہ اس صورت میں چونکہ ایک قسم کی تحقیر ہے اس لئے میرے نزدیک سب کو فرشتے سمجھے، کیونکہ فرشتوں سے انسان ریا نہیں کرتا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سے کوئی کام نہیں پڑتا، اس لئے ان سے طالب توقیر و تعظیم نہیں ہوتا ۱۲ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ۔

معتبر نہیں ہے۔ اور اگر کوئی شخص نماز تو جلوت ہو یا خلوت دونوں موقعوں میں پڑھتا ہے مگر اول وقت میں پڑھنا ریا کی نیت سے ہوتا ہے تو اس صورت میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرض ادا ہو جائے گا۔ البتہ اول وقت کی فضیلت حاصل نہ ہوگی اس لئے کہ اس میں ریا موجود ہے۔ اب رہی یہ بات کہ ریا کا قصد عبادت میں شامل ہوا سو اس کا گناہ جدا ہوگا۔

اثنائے عبادت میں ریا

دوسری صورت یہ ہے کہ اثنائے عبادت اور تکمیل طاعت میں ریا ہو۔

مثلاً نماز پڑھنے میں کوئی بھولی ہوئی چیز یاد آگئی یا کوئی تماشہ ہونے لگا تو دل للچایا کہ نماز توڑ کر ادھر متوجہ ہوتے، پس اگر ایسی حالت ہے کہ تنہائی کا موقع ہوتا اور کسی کا لحاظ مانع نہ ہوتا تو ضرور نماز کو توڑ دیتا مگر چونکہ آدمی بیٹھے ہوئے ہیں اس لئے ان کی شرم اور اس خیال سے کہ دیکھنے والے یوں کہیں گے کہ دیکھو فضول شغل کیلئے میاں نے اپنی نماز توڑ دی، نماز کو نہ توڑے اور بادلِ ناخواستہ پڑھے جائے تو اس نماز کو بھی باطل کہیں گے۔ کیونکہ عبادت میں اوّل سے لیکر آخر تک نیت کا قائم رہنا ضروری ہے۔ اور جب درمیان میں ریا کی وجہ سے نیت عبادت جاتی رہی تو نماز بھی جاتی رہی۔

یا مثلاً کوئی شخص نماز پڑھ رہا تھا اور لوگوں کو اپنی طرف دیکھتا ہوا پاکر اس خیال سے کہ میری عبادت پر یہ لوگ مطلع ہو گئے ہیں اس کی طبیعت کو اس قدر خوشی ہوئی کہ عبادت کی اصل نیت بالکل مغلوب ہوگئی اور نماز کا کوئی رکن ایسی حالت میں ادا ہوا جس میں لوگوں کی آگاہی کے سرور کو زیادہ دخل تھا، تو غالب ہے کہ یہ نماز بھی صحیح نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس میں اگرچہ نیت منقطع نہیں ہوئی مگر تاہم ایسی مغلوب ہوگئی ہے کہ اس کا عدم اور وجود برابر

ہے، پس اس نماز کو بھی باطل کہا جائے گا۔ ہاں اگر ایسی معمولی خوشی ہو کہ وہ نیت پر غالب نہ آئے اور عبادت کا محرک اور اصل باعث رضائے حق اور حکم خداوندی ہی رہے تو یہ نماز تو صحیح ہو جائے گی، مگر قصد ریا کا گناہ ضرور ہوگا۔

عبادت کے بعد ریا کا حکم

تیسری صورت یہ ہے کہ عبادت سے فارغ ہو جانے کے بعد ریا ہو۔ مثلاً لوگوں کے اس عبادت پر آگاہ ہو جانے سے اس کو مسرت ہو یا لوگوں سے خود ہی اس کا اظہار فخر کے انداز پر کرتا پھرے، تو اس کو عبادت کے صحت اور فساد سے کوئی علاقہ نہیں اس لئے کہ جس وقت ریا ہوا ہے اس وقت عبادت ختم ہو چکی تھی۔ البتہ اس مسرت اور اظہار کا گناہ ہوگا۔ اور پھر عبادت کا اظہار صراحۃً یا کنایۃً یا تعریضاً جس طرح اور جس حیثیت سے ہوگا اس سے ریا کے جلی اور خفی ہونے کا اندازہ خود ہو سکے گا کہ صراحۃً اظہار ہے تو ریا بھی جلی ہے اور اظہار اشارۃً ہے تو ریا بھی خفی ہے۔

فصل

ریا کے سبب اول یعنی حب مدح کا علاج

ریا بڑا مہلک مرض ہے اس کا علاج پوری مستعدی کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ یاد رکھو کہ ریا کا سبب اکثر یا تو حب مدح اور اپنی تعریف کی خواہش ہے، یا مال دنیا کی حرص و طمع اور یا مذمت کا خوف و اندیشہ۔

مثلاً کوئی شخص میدانِ جنگ میں اس غرض سے بہادری دکھائے کہ لوگ اس کو شجاع کہیں، یا اس نیت سے عبادت کرے کہ لوگ اس کو عبادت گزار و پرہیزگار کہیں تو یہ حبِ مدح ہے اور اس کا علاج وہی ہے جو

حبِ مدح کے علاج میں پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ شہرت اور دنیا کی نیک نامی محض فرضی اور وہمی ناقابل اعتبار کمال ہے۔ آج مرے کل دوسرا دن تعریف کرنیوالے اور ان کی تعریفیں اور سپاس نامے نہیں رہ جائیں گے اور کسی سے کچھ نفع نہ ہوگا۔ حقیقی کمال وہ ہے جو مرنے کے بعد بھی ساتھ رہے یعنی معرفتِ الٰہی کہ اس کو کبھی فنا ہی نہیں۔

اس کے علاوہ ریا میں خصوصیت کے ساتھ یہ خیال کرنا بھی اس مرض کیلئے مفید ہے کہ یہی بہادری اور یہی عبادت جو آج مجھ کو لوگوں کی زبان سے شجاع اور عابد کہلا رہی ہے کل کو قیامت کے دن حشر کے میدان میں ساری مخلوق کے سامنے مجھ کو رسوا اور ذلیل کرائے گی کہ میرا نام فاجر و مکار اور ریاکار پکارا جائے گا۔ اس پر طرہ یہ کہ میرا کیا کرایا سب بیکار ہو جائے گا اور وہ اعمال جن کو بڑی محنت اور مشقت کے ساتھ جمع کیا تھا ضبط ہو جائینگے پس لوگوں کی خوشنودی اور دنیا کی اس ناپائیدار مدح کے معاوضہ میں حق تعالیٰ کا غصہ اور محشر کی رسوائی اور ذلت خریدنا کس قدر عقل کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں یہاں دنیا میں جن کی رضامندی چاہتے ہو اگر حق تعالیٰ چاہے ہم سے ان کو ناراض بھی کر دے اور مدح کے بدلے وہی لوگ ہماری الٹی مذمتیں کرنے لگیں۔ کیونکہ قلوب اور زبانیں تو سب اس کے قبضہ میں ہیں پس چند روزہ موہوم محتمل تعریف کو حق تعالیٰ کی رضامندی پر جو کہ اصل سعادت ہے کیونکر ترجیح ہو سکتی ہے۔

سببِ دوم یعنی خوفِ مذمت کا علاج	اسی طرح مذمت کا خوف ریا کا باعث ہو تو یہ بات ذہن نشین کرنا چاہیئے کہ اگر میں عند اللہ پسندیدہ ہوں تب تو لوگوں کی مذمت مجھ کو

نقصان نہیں پہنچا سکتی، پھر ڈروں تو کیوں ڈروں ؟ خصوصاً جب کہ یہ بات یقینی ہے کہ مخلوق کی اس مذمت کے موہوم اندیشہ کی وجہ سے حق تعالیٰ کو ناراض رکھنا دنیا میں بھی ذلیل اور رسوا کر دیتا ہے۔ بھلا اگر یہ باطنی ریا لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ مجھے لوگوں کی مذمت سے ڈر معلوم ہوتا ہے اور اسی لئے میں نیکوکاروں کی سی صورت بناتا اور پرہیزگار بنا پھرتا ہوں تو پھر اس خوف سے کچھ بھی نفع نہ ہوگا۔ اور جس بات کا اندیشہ ہے وہ سامنے آجائے گی کہ مکاری کھلنے کی وجہ سے مذمتیں ہونے لگیں۔ اور اگر اخلاص کے ساتھ حق تعالیٰ کو راضی رکھنے کیلئے طاعت کروں تو جن لوگوں کی مذمت کا مجھے خوف ہے وہ بھی میرے دوست بن جائیں اور خداوند تعالیٰ کی خوشنودی بھی حاصل ہو جائے گی۔

سببِ سوم حرص و طمع کا علاج

ریا کا تیسرا سبب حرص و طمع ہے۔ پس اگر یہ وجہ ہو تو خیال کرنا چاہئے کہ جس چیز کی طمع ہے اس کا حاصل ہو جانا ایک موہوم بات ہے اور اس ریا کی بدولت حق تعالیٰ کی رضامندی کا ہاتھ سے جاتا رہنا یقینی ہے، پھر بھلا کسی نفع کی موہوم امید پر خدا کے غصہ کو سر پر لینا کون پسند کرتا ہے ؟ چونکہ حق تعالیٰ مقلبُ القلوب[1] ہے اس لئے یاد رکھو کہ ریاکاری سے جس دنیوی مطلب کیلئے عبادت کر رہے ہو وہ بھی نہ حاصل ہو سکے گا، بلکہ مخلوق کے سامنے طمع کرنے میں ذلت اور رسوائی جدا اٹھاؤ گے، ان کے احسان مند الگ ہو گے کہ ہمیشہ گردن نیچی رہے گی۔ اور اگر بے طمع ہو جاؤ گے تو حق تعالیٰ تمہاری تمام ضرورتوں کا کفیل ہو جائے گا۔ اور پھر اخلاص کی بدولت جو کچھ دائمی لذیذ نعمتیں تم کو آخرت

---

[1] دلوں کے پلٹ دینے والے ۱۲

میں ملیں گی وہ اس کے علاوہ ہوں گی۔ غرض ان یقینی اور سچی باتوں کو ذہن نشین کر لوگے تو ریا کا نام و نشان بھی نہ رہے گا اور حق تعالیٰ اخلاص کی توفیق بخش دے گا۔

فصل

عبادت کو مخفی رکھنے کے منافع

اس کے بعد غالباً تمہیں یہ فکر ہوگی کہ ریا سے نفرت تو پیدا ہوگئی مگر بعض عبادتوں میں مخلوق کے مطلع ہونے پر یکایک جو ریا پیدا ہو جاتا ہے اس کا علاج معلوم نہیں ہوا۔ لہٰذا اس کی تدبیر بھی بتاتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے خلوت میں بیٹھکر تنہائی کی حالت میں عبادت کیا کرو، اور اپنی عبادت کو ایسا چھپایا کرو جیسا اپنے عیوب اور معصیتوں کو چھپایا کرتے ہو۔ دیکھو حضرت ابو حفص حدادؒ کی مجلس میں کسی شخص نے ایک مرتبہ دنیا اور دنیا داروں کی مذمت بیان کی تو شیخ نے جواب دیا کہ "ہمارے حلقہ میں آج سے مت بیٹھا کرو، کیونکہ تم اس کے اہل نہیں ہو، اس لئے کہ جو کام تمہیں چھپانا چاہیئے تھا اس کو تم نے مجمع میں ظاہر کر دیا۔"

یاد رکھو کہ عبادت کا اخفا شروع شروع میں ذرا دشوار معلوم ہوگا مگر چند روز ایسا کرو گے تو اس کی عادت پڑ جائے گی۔ بلکہ خلوت کی عبادت و مناجات میں لذت آنے لگے گی۔ بایں ہمہ اس کا لحاظ رکھو کہ جس وقت بھی اپنی عبادت پر لوگوں کی اطلاع سے دل میں مسرت پیدا ہو تو فوراً پہلی باتوں کو یاد کرو اور سوچو کہ کمزور مخلوق کا میری عبادت پر مطلع ہو جانا میرے لئے ذرہ برابر بھی نافع نہیں ہے لہٰذا اس بے نفع بات پر میرا خوش ہونا فضول اور حق تعالیٰ کے غصہ کا نشانہ بن جانا بڑی خطرناک حالت ہے۔ پس جس وقت یہ خیال کرو گے تو وہ مسرت کراہت سے بدل جائے گی اور جب کراہت کا پلہ بھاری

ہوگا تو عبادت اسی اخلاص کی طرف لوٹ جاوے گی جو مقصود ہے۔

ظہور طاعت پر غیر اختیاری مسرت مضر نہیں!

اور چونکہ اس سے زیادہ مضمون کے تم مکلف بھی نہیں ہو اس لئے اگر اس پر بھی قلب میں مسرت کا اثر باقی رہے تو یہ طبعی بات ہے جس کا فکر و خیال کرنا فضول ہے، کیونکہ یہ اختیاری نہیں ہے اور جو بات اختیاری نہیں ہوتی اس پر مواخذہ بھی نہیں ہوا کرتا۔ الغرض تمہارا کام صرف اس قدر ہے کہ اپنی عبادت کو بالقصد ظاہر اور لوگوں میں شائع اور مشہور نہ کرتے پھرو۔ اور اگر بطور خود لوگوں کو اس کی اطلاع ہو جائے اور اس پر تم کو مسرت لاحق ہو تو اس کو مٹانے کی کوشش کرو کہ جس طرح ممکن ہو کراہت سے بدل لو تاکہ اس مسرت کا کسی عمل پر کوئی اثر نہ پیدا ہو اس کے بعد جو کچھ حالت رہے اب اس کا دور کرنا چونکہ تمہاری قدرت سے باہر ہے لہٰذا اس کا مطلق فکر نہ کرو۔

فصل

اظہار عبادت بعض جگہ مفید ہے

اس نیت سے عبادت کے ظاہر کر دینے میں کچھ حرج نہیں ہے کہ لوگوں کو رغبت ہوگی اور وہ بھی میری طرح حق تعالیٰ کی عبادت کرنے لگیں۔ مگر ہاں نیت کا صاف اور خالص ہونا ضروری ہے۔ اگر نفس امارہ اس حیلہ سے تمہارا شکار کرنا چاہے یا اس سے کسی چھپی ہوئی خواہش کے بڑھنے کا اندیشہ ہو تو ہرگز اس کی جرأت نہ کرنا بلکہ عبادت کے مخفی ہی رکھنے کے پابند بنے رہنا۔ اور اس کی علامت یہ ہے کہ عبادت کا اظہار تمہارے دل کی خواہش پر قائم رہے کہ اگر دوسرے لوگ اس بوجھ کو اٹھالیں اور کسی دوسرے ہی کی عبادت دیکھ کر

لوگوں کو رغبت پیدا ہو جائے تو بہت اچھا ہے، لہٰذا دل کو ٹٹول لیا کرے کہ اس میں کیا خواہش ہے۔ کیونکہ اگر یہ خواہش ہوئی کہ میری عبادت دوسرے لوگوں کی رغبت کا ذریعہ بنے اور میں مقتدا[1] بنوں اور مخلوق میری مقتدی ہو تو بس یہی ریا اور طلبِ شہرت و حبِ جاہ ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ظاہر ہے کہ اخلاص جاتا رہا۔ اسی بناء پر اپنے گناہوں کا چھپانا اور ظاہر نہ کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اس نیت سے ہو کہ لوگ فاسق نہ کہیں۔

گناہ کے مخفی رہنے پر خوشی گناہ نہیں ہے!

گناہوں کے مخفی رہنے پر خوش اور آشکارا ہونے پر رنجیدہ ہونے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ عام ہے کہ حق تعالیٰ کے حکم کی موافقت کے باعث ہو کہ وہ معصیت کے چھپانے کو پسند اور اظہار کو ناپسند فرماتا ہے، یا آپنے اوپر سے ایذا رفع کرنے کے سبب سے ہو کہ معصیت کے فاش ہونے پر لوگوں کو میری مذمت اور برائیاں کرنے کا موقع ملے گا اور اس سے میرے دل پر صدمہ ہوگا اور یہ صدمہ اختیاری نہیں ہے بلکہ طبیعت کا اقتضاء ہے، اور یا حق تعالیٰ کی شانِ ستاری ظاہر ہونے پر خوش ہونے کی وجہ سے ہو۔ بہر حال کسی نیت سے بھی کیوں نہ ہو گناہوں کے مخفی رہنے پر خوش ہونا حرام نہیں ہے۔ البتہ عبادت پر اس نیت سے خوش ہونا کہ لوگ تعریف کریں گے اور متقی و عابد سمجھیں گے بیشک حرام ہے۔ کیونکہ یہ خوش ہونا گویا عبادت کی اجرت لینا اور مخلوق کی مدح کو اپنی طاعت کا معاوضہ بنانا ہے، اور یہ ناجائز ہے۔

---

[1] پیروی کرنیوالی اور جس کی پیروی کی جائے وہ مقتدا ۱۲

اس مضمون کو دوسرے طریقہ سے یوں سمجھو کہ معصیت کے ظاہر ہونے میں عموماً حیا اور شرم آتی ہے۔ اور حیا چونکہ ریا نہیں ہے اس لئے اس غرض سے معصیت کا چھپانا اور اس پر خوش ہونا بھی حرام نہیں ہے۔ برخلاف عبادت کے، اس کے ظاہر ہونے پر خوش ہونے کی وجہ بجز اس کے کہ عبادت کا معاوضہ موہوم اور دنیائے دنی کا فائدہ قرار دیا ہے اور کوئی معقول وجہ نہیں ہے، لہذا حرام ہے۔ ہاں ریا کے خوف سے طاعت اور عبادت کا چھوڑنا بھی مناسب نہیں ہے۔ بلکہ عبادت کو کرتے رہو اور اگر اس میں ریا پیدا ہو تو اس کے دور کرنے کی کوشش رکھو۔ البتہ اگر ایسے کام جن کو مخلوق سے تعلق ہو مثلاً نماز میں امام بنانا یا مقدمات میں قاضی و پنچ قرار پانا یا قصار یا وعظ گوئی اگر ان امور میں ریا کا غالب اندیشہ ہو کہ نفس ضرور شرارت کرے گا اور نیت میں اخلاص بالکل قائم نہ رہے گا، تو بیشک ان کاموں سے بھاگنا چاہیئے کیونکہ سلف کا یہی طرز تھا اور ضرور اسی میں بہتری ہے۔

ریا کے اندیشہ سے معمولات ترک نہ کرنے چاہئیں

اب رہے نماز، روزہ اور صدقات وغیرہ کے اعمال، سو ریا کے اندیشہ سے ان کو ترک کرنا جائز نہیں۔ البتہ اگر بالکل ہی اخلاص نہ ہو اور اول سے آخر تک رضائے حق تعالیٰ اور عبادت خداوندی کی قطعی نیت نہ ہو محض اپنی جیسی محتاج مخلوق کے دکھلانے کو یہ کام کئے جائیں تو اس وقت ان کا کرنا بھی حرام اور چھوڑ دینا اولیٰ ہے۔ اور اگر کسی نیک کام کے تم عادی و پابند ہو اور اتفاق سے لوگ جمع ہو جاویں تو اس وقت ریا کے احتمال سے اپنے معمول کو ترک مت کرو بلکہ عادت کے موافق اپنا کام کرو اور ریا کو جہاں تک ہو سکے دفع کرو کہ پاس نہ آنے پائے۔

خاتمہ

حُسنِ خُلق[1]

اور اس میں

نفس کے دھوکے کا بیان

سارے ہی اخلاق ذمیمہ سے صاف ہونا حسن خلق کہا جاسکتا ہے

اخلاق مذمومہ کہ جن سے نفس کا تزکیہ کرنا ضروری ہے یوں تو بہت ہیں مگر اصول یہی دس ہیں جن کو بالتفصیل ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اور ان میں باہم ایسا تعلق ہے کہ ایک کے ساتھ دوسرا اور دوسرے کے ساتھ تیسرا لگا ہوا ہے۔ اس لئے جب تک سب ہی سے نجات نہ ملے گی اس وقت تک نفس قابو میں نہ آئے گا۔ اور ایک کی اصلاح کرنا اور دوسرے سے بے پروا رہنا کچھ مفید نہ ہوگا۔ کیونکہ جو شخص دس بیماریوں میں گرفتار ہو وہ تندرست اسی وقت کہا جاسکتا ہے جبکہ اس کی دسوں بیماریاں جاتی رہیں۔ جس طرح کوئی خوبصورت

---

[1] عادت، اخلاق جمع ۱۲

آدمی حسین اسی وقت کہلا سکتا ہے جبکہ ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان غرض سارے اعضا مناسب اور خوبصورت ہوں۔ اسی طرح انسان کو حُسنِ خُلق اسی وقت حاصل ہوگا جبکہ اس کی تمام باطنی حالتیں قابل تعریف اور پسندیدہ ہوں۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں[1] کہ "مسلمان وہی ہے جس کا خلق کامل ہو اور مومنین میں افضل وہی ہے جس کا خلق سب سے بہتر ہو"[2]۔ بس اسی اصل کا نام دین ہے، اور اسی کی تکمیل کیلئے رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام دنیا میں تشریف لائے تھے۔

حسن خلق کی تحقیق اور تحدید اور ثمرات ونتائج میں محققین کے اقوال مختلف ہیں مگر ہم اختصار کے طور پر اس کی تحقیق کرتے ہیں۔

حُسنِ خُلق کی ماہیت وثمرات

جاننا چاہیے کہ خَلق اور خُلق یعنی خ کے فتحہ اور ضمہ یعنی زبر اور پیش کے ساتھ جدا جدا دو لفظ ہیں۔ خَلق سے مراد صورتِ ظاہری ہے اور خُلق سے مراد صورت باطنی ہے۔ کیونکہ انسان جس طرح جسم سے ترتیب دیا گیا ہے اور ہاتھ پاؤں اور آنکھ کان وغیرہ اعضا اس کو مرحمت ہوئے ہیں جن کو قوتِ بصارت یعنی چہرہ کی آنکھیں ادراک کر سکتی ہیں۔ اسی طرح انسان روح اور نفس سے ترکیب دیا گیا ہے اور اس کا ادراک بصیرت یعنی دل کی آنکھیں کرتی ہیں، یہ ترکیب ان ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔ اور ان دونوں ترکیبوں میں حق تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو جدا جدا صورت اور قسم قسم کی شکلوں پر پیدا فرمایا ہے کہ کوئی صورت اور سیرت حسین اور اچھی ہے اور کوئی صورت اور سیرت بُری

---

[1] اصل عربی کتاب میں یہ حدیث نہیں ہے ۱۲ [2] طبرانی۔ صحیح ۱۲

اور بھونڈی ہے۔ ظاہری شکل و ہیئت کو صورت کہتے ہیں، اور باطنی شکل و ہیئت کو سیرت کہتے ہیں۔ اس سیرت کا مرتبہ صورت سے بڑھا ہوا ہے، کیونکہ اس کو حق تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ چنانچہ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ[1] آیۂ کریمہ میں رُوح کو اپنا کہکر ذکر فرمایا ہے۔ اور قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ[2] میں اس کا اظہار فرمایا کہ روح امرِ ربانی ہے اور جسم کی طرح سفلی اور خاکی نہیں ہے، کیونکہ جسم کی نسبت مٹی کی جانب فرمائی اور اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ[3] ارشاد ہوا ہے۔

سیرت کے بھی چار اعضاء ہیں

اس مقام پر رُوح اور نفس سے ہماری مراد ایک ہی شئے ہے، یعنی وہ شئے جو حق تعالیٰ کے الہام و القار سے اپنی اپنی استعداد کے موافق اشیاء کی معرفت حاصل کرتی ہے۔ بہرحال ثابت ہوا کہ زیادہ قابل لحاظ امرِ ربانی یعنی سیرت انسانی ہی ہے۔ کہ جب تک اس باطنی ترکیب کی شکل و ہیئت میں حسن موجود نہ ہوگا اس وقت تک انسان کو خوب سیرت نہیں کہا جاسکتا۔ چونکہ اس صورت کی کے اعضاء یعنی ہاتھ پاؤں کی طرح سیرت کو بھی حق تعالیٰ نے باطنی اعضاء مرحمت فرمائے ہیں جن کا نام قوت علم، قوت غضب، قوتِ شہوت اور قوت عدل ہے۔ لہٰذا جب تک یہ چاروں اعضاء سڈول اور مناسب حد اعتدال تک نہ ہوں گے اس وقت تک سیرت کو حسین نہ کہا جائے گا۔

---

[1] اور آدم کے پتلے میں پھونک دیا میں نے اپنی روح کو ۱۲

[2] (اے محمدؐ) کہدو کہ روح میرے پروردگار کا امر ہے ۱۲

[3] بے شک میں نے پیدا کیا آدم کو مٹی سے ۱۲

ان باطنی اعضاء میں جو بھی کمی بیشی اور افراط[1] وتفریط ہوگی اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کسی کی ظاہری شکل اور صورت جسمیہ میں افراط وتفریط ہو کہ پاؤں مثلاً گز بھر ہوں اور ہاتھ تین گز کے یا ایک ہاتھ مثلاً آدھ گز کا ہو اور دوسرا ہاتھ گز بھر کا اور ظاہر ہے کہ ایسا آدمی خوبصورت نہیں کہا جائے گا ۔ پس اسی طرح اگر کسی کی قوت غضبیہ مثلاً حدِ اعتدال سے کم ہے اور قوت شہوانیہ مناسب اعتدال سے بڑھی ہوئی ہے تو اس کو خوب سیرت نہیں کہہ سکتے ۔

اب ہم چاروں اعضائے مذکورہ کا اعتدال وتناسب اور حُسن بیان کرتے ہیں ۔

قوّت علمیہ کا حُسن

اوّل قوت علم ۔ اس کا اعتدال اور حسن تو یہ ہے کہ انسان اس کے ذریعہ سے اقوال کے اندر سچ اور جھوٹ میں امتیاز اور اعتقادات کے متعلق حق اور باطل میں تفریق کر سکے ، اور اعمال میں حسن اور قبح یعنی اچھا اور بُرا پہچان سکے ۔ پس جس وقت یہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی تو اس وقت حکمت کا وہ ثمرہ پیدا ہوگا ، جس کو حق تعالیٰ بایں الفاظ ارشاد فرماتا ہے کہ "جس کو حکمت نصیب ہوئی اس کو خیر کثیر عطا ہوئی" اور درحقیقت تمام فضیلتوں کی جڑ اور اصل یہی ہے ۔

قوّتِ غضبیہ اور شہوانیہ کا حسن

دوم وسوم ۔ قوتِ غضب وقوتِ شہوت ۔ ان کا اعتدال اور حُسن یہ ہے کہ دونوں قوتیں حکمت اور شریعت کے اشارے پر چلنے لگیں اور مہذب و

---

[1] کمی زیادتی ۱۲

مطیع شکاری کتے کی طرح شریعت کی فرماں بردار بن جائیں کہ جس طرف بھی ان کو شریعت چلائے بلا عذر وبے تامل اسی جانب لپکیں اور شکار پر حملہ کریں اور جس وقت وہ ان کو روکنا چاہے تو فوراً ٹھیر جائیں اور چپ ہو کر اپنی جگہ بیٹھ جائیں۔

قوت عدل کا حُسن

چہارم: قوت عدل۔ اس کا اعتدال یہ ہے کہ قوت غضبیہ اور شہوت دونوں کی باگ اپنے ہاتھ میں لے اور ان کو دین اور عقل کے اشارے کے ماتحت بنائے رکھے گویا عقل تو حاکم ہے اور یہ قوت عدل اس کی پیش کار ہے کہ جدھر حاکم کا اشارہ پاتی ہے فوراً اسی جانب جھک جاتی ہے اور اسی کے موافق احکام جاری کر دیتی ہے۔ اور قوت غضبیہ اور شہوانیہ گویا شکاری مرد کے مہذب کتے اور فرمانبردار گھوڑے کی طرح ہیں کہ ان میں حاکم کا حکم اور ناصح کی نصیحت کا نفاذ اور اجرا ہوتا ہے۔ پس جس وقت یہ حالت قابل اطمینان اور لائق تعریف ہو جائیگی اس وقت انسان حَسَنُ الخُلق[1] اور خوب سیرت کہلائے گا اور ان کی بدولت انسان تمام اخلاق وعادات درست ہو جائیں گے۔

قوت غضبیہ کے اعتدال اور کمی بیشی کے نتائج

قوتِ غضبیہ کے اعتدال کا نام شجاعت ہے اور یہی عند اللہ پسندیدہ ہے۔ کیونکہ اگر اس میں زیادتی ہوگی تو اس کا نام تہوّر[2] ہے، اور اگر کمی ہوگی تو بزدلی کہلائے گی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں حالتیں ناپسندیدہ ہیں۔

---

[1] اچھی عادت والا ہونا ۱۲ [2] بے باکی سے تباہ کرنا ۱۲

حالتِ اعتدال یعنی شجاعت سے لطف وکرم، دلیری وجودت، بردباری واستقلال، نرمی وملاطفت[1] اور غصہ کے ضبط کا مادہ اور ہر کام میں دوراندیشی ووقار پیدا ہوتا ہے۔ اور اس میں زیادتی ہوتی ہے تو ناعاقبت اندیشی، ڈینگ مارنا، شیخی بگھارنا، غصہ سے بھڑک اٹھنا، تکبر اور خودپسندی پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر اس میں کمی ہوتی ہے تو بزدلی وذلت، بے غیرتی وکم ہمتی، خساست[2] اور وہ حرکات ظاہر ہوتی ہیں جو چھچھورا پن کہلاتی ہے۔

قوت شہوانیہ کے اعتدال اور افراط وتفریط کے ثمرات

شہوت کی حالتِ اعتدال کا نام پارسائی ہے۔ پس اگر شہوت اپنی حد اعتدال سے بڑھ جائے گی تو حرص وہوا کہلائے گی، حالت معتدلہ یعنی پارسائی اللہ پاک کو پسند ہے۔ اور اس سے جو خصائل پیدا ہوتے ہیں وہ سخاوت، حیا، صبر، قناعت، اتقا کہلاتے ہیں۔ طمع کم ہوجاتی ہے، خوف وخشیت اور دوسروں کی مدد کرنے کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور حدِ اعتدال سے بڑھنے اور گھٹنے سے حرص ولالچ، خوشامد، چاپلوسی، امراء کے سامنے تذلل[3] اور فقراء کو بہ نظرِ حقارت دیکھنا، بے حیائی، فضول خرچی، ریا، تنگ دلی، نامردانگی اور حسد وغیرہ خصائل بد پیدا ہوتے ہیں۔

قوت عقل کے اعتدال وافراط وتفریط کے آثار

قوت عقل میں اگر اعتدال ہوتا ہے تو انسان مدبر ومنتظم اور ذکی وسمجھدار ہوتا ہے کہ اس کی رائے صائب ہوتی ہے اور ہر مضمون میں اس کی طبیعت چلتی اور جودت دکھلاتی ہے۔ اور اگر حد اعتدال

---

[1] نرم برتاؤ ۱۲ [2] کمینہ پن ۱۲ [3] ذلیل ہونا ۱۲

سے بڑھ جائے تو دھوکہ بازی، فریب دہی اور مکاری کہلاتی ہے۔ اور اگر عقل کی قوت میں کسی قسم کا نقصان اور ضعف ہوگا تو کند ذہنی وحماقت اور بے وقوفی کہلائے گی جس کا اثر یہ ہوگا کہ ایسا آدمی جلد دوسرے کے دھوکہ میں آجائے گا۔

غرض جس وقت یہ ساری قوتیں حد اعتدال پر ہوں گی تو اس وقت انسان کو حُسنُ الخلق یعنی خوب سیرت کہا جائے گا۔ کیونکہ اعتدال سے گھٹنا اور بڑھنا دونوں حالتیں حُسن سے خارج ہیں۔ خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "نہ اپنے ہاتھ گردن سے باندھ لو کہ بخل کرو اور نہ بالکل کھول دو کہ اسراف کرنے لگو۔" نیز فرماتا ہے کہ "ہمارے بندوں کی یہ شان ہے کہ نہ وہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل، بلکہ اس کے بین بین بیچ بیچ حالت پر رہتے ہیں۔

فصل

بد خصلتی کا علاج نفس پر جبر کرنا ہے

ان بداخلاقیوں کی اصلاح چونکہ ریاضت اور مجاہدہ سے ہو سکتی ہے لہٰذا اگر کسی میں کوئی خلق بُرا موجود ہو تو اس کو چاہیئے کہ نفس پر جبر کرے۔ مثلاً اگر بخل کی عادت ہو تو جبراً و قہراً اس کو ترک کرے اور نفس کو ناراض کر کے خرچ کرنے کی عادت ڈالے اور اگر فضول خرچی کا خوگر ہو تو نفس کو فرضی سخاوت سے روکے اور خرچ کرنا بند کرے تاکہ کم خرچی کی عادت ہو جائے۔ پھر جب حالت اصلاح پر آجائے گی تو وہی بین بین حالت پیدا ہو جائے گی جو حق تعالیٰ کو پسند ہے۔

لہ سارے کاموں میں بہتر ان کے متوسط (میانہ روی کے) درجے ہوا کرتے ہیں ۱۲

حُسنِ خُلق میں تکلف سے اخلاق حسنہ کا وسیلہ ہے

مگر یہ نہ سمجھنا کہ جبراً وقہراً خرچ کرنے سے سخی یا بہ تکلف عاجزی کرنے سے متواضع کہلاؤ گے، نہیں ہرگز نہیں۔ سخاوت اور تواضع تو اس طبعی حالت کا نام ہے جو بلا تکلف ویے تصنع مال کو موقع پر خرچ کرائے اور دوسروں کے سامنے انکساری کا مضمون خود بخود ظاہر کرادے نہ کہ بہ تکلف۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انشاء اللہ اس جبر و قہر اور تکلف کے ساتھ خرچ کرنا یا لوگوں کے سامنے جھکنا اصل سخاوت اور تواضع کا وسیلہ بن جائے گا۔ کیونکہ بہ تکلف ایک کام کو کرتے کرتے اس کی عادت ہو جایا کرتی ہے، اور جب عادت ہو جائے گی تو خصلتِ محمودہ سے دل ایسا متصف ہو جائے گا کہ وہ عمدہ خصلت طبعی بن جائے گی۔

حُسنِ خلق کے مراتب اور ثمرات

جس طرح حسنِ ظاہری میں کمی بیشی ہوا کرتی ہے کہ کوئی زیادہ خوبصورت ہوتا ہے اور کوئی کم۔ اسی طرح حسن باطنی میں بھی لوگ متفاوت ہوتے ہیں۔ پس سب سے زیادہ خوب سیرت تو سرورِ عالم رسول مقبول سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ آپ کی شان میں آیۂ کریمہ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ[1] نازل ہوئی ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد جس مسلمان کو آپ کے اخلاق کے ساتھ جتنی مناسبت ہو گی اسی قدر اس کو حسین سیرت کہیں گے، اور یہ ظاہر ہے کہ سیرت باطنی میں جس قدر جس کو حسن حاصل ہو گا اسی قدر اس کو سعادت اخروی حاصل ہو گی کہ کامل درجہ کا حسین شخص معشوق

---

[1] (اے نبی) بے شک آپ بڑے خلق پر پیدا کیے گئے ۱۲

اور محبوب بن جاتا ہے۔ اور پہلے درجہ کا قبیح و بد باطن شخص کمال بغض و نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور درمیانی حالت میں محبت اور نفرت کے ہزار ہا درجے نکلیں گے جن پر ان کی مقدار و کیفیت کی مناسبت سے ثمرات و نتائج متفرع ہوں گے۔ پس خوب سیرتوں اور بد سیرتوں کے افراد کی جانچ اس پیمانہ سے بآسانی کی جا سکتی ہے۔

فصل

اخلاق کی تشخیص محب صادق سے کرو

انسان کو اپنے نفس کی حالت معلوم کرنے میں اکثر دھوکا ہو جاتا ہے کہ بد خلق شخص بھی کبھی اپنے آپ کو خلیق اور خوب سیرت سمجھنے لگتا ہے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو غصہ آجاتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے اللہ واسطے غصہ آیا ہے جو خوب سیرتی کیلئے ہونا ہی چاہیے۔ یا مثلاً اپنی عبادتوں کو لوگوں پر ظاہر کرتا ہے اور نفس یہ دھوکہ دیکر مطمئن بنا دیتا ہے کہ تم نے تو اس غرض سے عبادتوں کا اظہار کیا ہے تاکہ لوگ اس نیک کام کی رغبت اور اس میں تمہارا اقتدار کریں۔ یا مثلاً عابد، زاہد، متقی، پابند صوم و صلوٰۃ بنتا ہے اور باوجودیکہ یہ سب ریا اور دکھانے کی نیت سے ہوتا ہے، مگر نفس اس عیب کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ غرض اسی طرح یہ نفس امارہ بڑے بڑے دھوکے دیا کرتا اور بد حالی میں مبتلا رکھنے کیلئے عیب کو خوبی بنا کر ظاہر کیا کرتا ہے۔

لہٰذا مناسب ہے کہ اپنی حالت کسی اپنے مخلص اور صاف گو دوست سے پوچھو کہ وہ تمہیں کیسا سمجھتا ہے؟ چونکہ تمہاری خصلتوں اور عادتوں کا دوسرے

لہ مرتب ۱۲

لوگ اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں. کیونکہ جن سے سابقہ اور واسطہ پڑتا ہے اور ان کو تمہارے اخلاق کے امتحان کا موقع ملے وہی اچھی طرح جانچ سکتے ہیں پس اگر تمہارے دوست کو تمہاری خیر خواہی ملحوظ ہوگی تو بے تکلف وہ تم کو بتا دے گا کہ فلاں عادت تمہاری خراب ہے، پس اسی کی اصلاح میں تم کو مشغول ہو جانا چاہئے۔ اور اگر چند عادتیں خراب ظاہر ہوں تو اغلب کی فکر پہلے کرو اور جس کا نتیجہ زیادہ خراب نکل رہا ہو اس کا علاج سب سے مقدم سمجھو۔ مثلاً

دنیا کی محبت کا علاج

دنیا کی محبت۔ اور یہ ایسی بلا ہے کہ جس سے شاذ و نادر ہی کوئی شخص محفوظ ہوگا۔ حالانکہ یہی تمام گناہوں کی جڑ ہے، پس اس کا علاج مقدم اور سب سے زیادہ ضروری سمجھنا چاہئے۔ اور دنیا کی محبت کا علاج یہ ہے کہ تنہائی میں بیٹھ کر سوچا کرو کہ آخر دنیا کی جانب مجھ کو اس قدر توجہ اور آخرت سے روگردانی کیوں ہے۔ اگر خلوت میں فکر کرو گے تو سمجھ میں آجائے گا کہ سوائے جہالت اور غفلت کے کوئی وجہ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کیلئے مان لو کہ تمہاری عمر سو برس کی بھی ہوئی اور تمہیں تمام سطح زمین[1] کی سلطنت بھی مل گئی مگر پھر کیا؟ آخر فنا ہونا ہے۔ عنقریب وہ دن آنے والا ہے کہ نہ تم رہو گے اور نہ یہ سلطنت و ملک رہے گا، یہ سب تو فنا ہو جائیں گے مگر اس کی بدولت ابدی سلطنت جن کے ختم ہونے کا کوئی وقت ہی نہیں تمہارے ہاتھ سے ضرور جاتی رہے گی۔

ابد یعنی خلود و دوام کا تصوّر

اور ابد یعنی خلود و دوام[2] کی مقدار تمہارے خیال میں نہ آسکے تو یوں تصوّر کرو کہ

---

[1] زمین کا اوپر کا حصہ ۱۲ [2] ہمیشہ رہنا ۱۲

تمام دنیا اس کنارہ سے لیکر اُس کنارہ تک اناج سے بھری ہوئی ہے اور ایک پرندہ پورے ایک ہزار برس میں اس لبریز دنیا میں سے ایک دانہ اٹھا لیتا ہے پس اسی طرح ہر ہزار سال میں اناج کا ایک ایک دانہ اٹھانے پر بھی ایک نہ ایک دن یہ دنیا اناج سے ضرور خالی ہو جائے گی۔ پس یہ مدت بھی جس کی ہزار ہا ہزار گنا پر تمہاری گنتی ختم ہوتی ہے، ابد اور دوام کے نام سے موسوم نہیں ہو سکتی کیونکہ ابد اور دوام اس مدت سے بھی لکھوکھا اور کروڑہا گنا زیادہ ہے۔ کیونکہ وہ تو اتنی بیشمار مدت کا نام ہے جس کی کہیں انتہا ہی نہیں۔

پھر بھلا اس عارضی اور فنا ہو جانے والی سلطنت کی طرف توجہ کرنا اور ابدی و دائمی مملکت سے بے پروا اور مستغنی بننا نفس نے کیوں پسند کر لیا؟ پھر یہ بھی سوچو کہ ذرا سی دنیا کی معمولی تجارت میں تم کیسی کیسی مصیبتیں اٹھا لیتے ہو طلب ریاست میں کیسے کیسے دشوار سفر اختیار کر لیتے ہو۔ حالانکہ ان مصیبتوں اور دشواریوں کے بعد بھی مال اور ریاست کا ملنا بالکل موہوم ہے۔ ممکن ہے کہ اس سے پہلے ہی موت آجائے اور تجارت کا نفع یا سفر کا انجام دیکھنا نصیب نہ ہو گا اگر ریاست بھی مل جائے تو ممکن ہے کہ وہ عیش آرام و سکون و اطمینان حاصل نہ ہو جو ریاست سے مقصود ہوتا ہے۔ بہر حال ایسی موہوم دنیوی راحت کی توقع پر بھی یہ صعوبتیں اور مصیبتیں گراں نہیں گزرتیں، کیونکہ اپنے خیال میں جتنی عمر اپنی سمجھے ہوئے ہو اس کے مقابلہ پر تکلف و محنت کے ایک یا دو برس کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے۔ اور یوں خیال کرتے ہو کہ برس روز سفر میں رہنے کی تکلیف کے سبب عمر بھر کا عیش مل جائے گا حالانکہ جو نسبت تمہاری عمر بلکہ تمام دنیا کی

نسلہ برابر ۱۲

عمر کو ابد اور دوام کے ساتھ ہے اس کا ایک شمہ بھی ایک برس کو تمہاری خیالی عمر کے ساتھ ہرگز ہرگز حاصل نہیں ہے۔ پھر دنیا کی زندگی کو اگر آخرت کی ابدی نعمت کے حاصل کرنے میں صرف کرو اور اس چند روزہ محنت اور تکلیف کو وہاں کی دائمی لذت کیلئے گوارا کر لو تو کیا مشکل ہے؟ مگر یہ ہو کیسے؟

نفس کا دھوکہ کہ خدا کریم ہے اور اس کی وجہ سے غفلت

نفس نے ایک شوشہ چھوڑ دیا اور دھوکہ میں ڈال رکھا ہے غفلت کئے جاتے ہو۔ اور کہتے ہو کہ خدا کریم ہے، معاف کرنیوالا ہے سب کچھ بخش دے گا اور برے عمل کے باوجود ہم کو جنت میں بھیج دے گا۔

بھلا میں پوچھتا ہوں کہ کھیتی اور تجارت میں ایسا کیوں نہیں خیال کر لیتے؟ کیا آخرت کا خدا کوئی اور ہے اور دنیا کا کوئی اور؟ اور جب دونوں کا خدا ایک ہی ہے تو دنیا کے کمانے کے متعلق اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کر گھر میں کیوں نہیں بیٹھتے اور کیوں نہیں خدا پر بھروسہ کرتے کہ جب وہ رزاق اور قادر ہے تو بلا محنت کئے ہوئے بھی ہمارا پیٹ بھر دے گا۔ اور کیوں نہیں اس کی امید رکھتے کہ وہ کسی ویرانہ کا دبا ہوا خزانہ ہم کو سوتے میں دکھلا دے گا جس سے بلا محنت اور مزدوری کے ہم مالامال ہو جائیں گے مگر افسوس ہے کہ یہاں تو یوں جواب دیتے ہو کہ معاش کے اسباب کا اختیار کرنا ضروری بات ہے۔ کیونکہ مدفون خزانہ کا ہاتھ لگ جانا تو ایک اتفاقی امر ہے کہ شاذ و نادر[1] کبھی کسی کیلئے ایسا اتفاق بھی پیش آجاتا ہے۔ مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔

بے محل توقع شیطانی دھوکہ ہے

پس ایسا ہی آخرت کے متعلق بھی سمجھو

[1] جس کا وجود کم ہو یعنی کبھی کبھی ۱۲

کہ خراب اعمال اور بدکاریوں پر معافی و مغفرت کی توقع کرنا اس سے بھی شاذ و نادر ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ صاف فرما چکا ہے کہ "انسان کو وہی ملے گا جو وہ کرے گا۔ اور متقی بندے فاسق و فاجر لوگوں کی برابر نہیں ہو سکتے وغیرہ وغیرہ" دنیا کے معاملات میں تو اسباب کے اختیار کرنے کو ضروری بھی نہیں فرمایا بلکہ ان سے بے توجہ بنایا اور یوں فرمایا ہے کہ "کوئی جاندار زمین پر چلنے والا ایسا نہیں ہے کہ جس کا رزق ہمارے ذمہ نہ ہو۔"

تعجب ہے کہ دنیا کمانے میں تو خدا پر بھروسہ نہیں ہے اور آخرت میں بدعملیوں کی معافی پر وثوق اور بے جا توقع رکھکر اپنا دین برباد کر رہے ہو۔ خوب یاد رکھو کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے جس نے مخلوق کو تباہ اور اعمال سے کاہل بنا کر عبادت و طاعت سے روک رکھا ہے۔ حق تعالیٰ محفوظ رکھے۔

فصل

غیب پر ایمان و یقین حاصل کرنیکا طریق

اور اگر تم یہ کہو کہ چونکہ دنیوی معاملات کے نتائج تو آنکھوں سے دیکھتے اور رات دن تجربہ کرتے ہیں اور آخرت کے معاملات میں سے کوئی واقعہ بھی کسی نے مشاہدہ نہیں کیا اس وجہ سے دنیا کی تحصیل میں رغبت ہوتی اور دین کی طلب میں غفلت ہے کیونکہ جس شے کو آدمی نے دیکھا نہیں اس کی واقعی تصدیق دل کے اندر نہیں ہوتی۔ اور یہ بھی بات ہے کہ ہر شخص نقد کو ادھار پر ترجیح دیا کرتا ہے لہذا طلب دنیا میں ساری تکلیفیں برداشت کیجاتی ہیں اور دین کے متعلق نوافل تو در کنار اصل ارکان اور فرائض بھی ادا ہونے مشکل و دشوار پڑ جاتے ہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ تمہارے قلب کی آنکھیں روشن

فرما دے اور تم صاحب بصیرت بن جاؤ تو پھر دینی امور کے انجام بھی دنیا ہی کی طرح تمہارے مشاہدے میں آجائیں گے۔ اور اگر بصیرت حاصل نہ ہو تو بصیرت[1] والوں یعنی انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کے ارشادات میں غور کرو، اور دیکھو کہ اس بڑی جماعت میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو آخرت کی دائمی نعمت اور دائمی تکلیف کا قائل نہ ہو۔ اور یہ یقینی بات ہے کہ آخرت کی دائمی بہبودی حق تعالیٰ کی طرف توجہ کئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ اور جب تک دنیا کی طرف سے منہ نہ پھیروگے اس وقت تک حق تعالیٰ کی جانب توجہ کیونکر ہوگی؟

پس جب ان باتوں کو سوچو گے تو تم کو آخرت پر سچا ایمان اور قلب کو امور غیبیہ پر سکون و اطمینان حاصل ہو جائے گا۔ کیونکہ جو شخص خود اندھا ہو اُس پر لازم ہے کہ وہ کسی سُوانکھے شخص کا تابع ہو کر چلے۔ کیونکہ راستہ کی اونچ نیچ اور منزل مقصود تک پہنچنے والی سڑک اسی کو نظر آرہی ہے۔ بھلا اگر طب کے اندر تم کو دخل نہ ہو اور بیمار ہو جاؤ تو تمہیں بتاؤ کہ اس وقت طبیب کے کہنے پر تم کو چلنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ خصوصاً اگر کوئی ایسی صورت ہو کہ جس پر تمام اطبا کا اتفاق ہو تو اس میں تو تم کو کسی قسم کا شک بھی نہ ہوگا۔ پس یہی حال عقائد کا سمجھو کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام اور تمام اہل بصیرت حضرات روحانی طبیب ہیں اور وہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ آخرت ضرور آنے والی ہے اور اس چند روزہ زندگی کے نیک وبد اعمال کا بدلہ ضرور ملنے والا ہے، لہٰذا اس میں شک کرنے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

روح انسانی کی حقیقت

ہاں چند آدمی ایسے بھی ہیں جو

---

[1] آنکھ والے ۱۲ ن

روح کی حقیقت کو سمجھے ہی نہیں کہ وہ کیا چیز ہے؟ ان کی نظر اسی روح جسمانی تک قاصر رہ گئی جس کے ذریعہ سے انسان حس وحرکت کرتا ہے۔ یعنی وہ بخارات جو قلب سے اٹھتے ہیں اور بدن کی تمام رگوں میں پھیل جاتے ہیں۔ پس انہوں نے اسی کو انسانی روح سمجھ لیا۔ حالانکہ یہ روح حیوانات میں بھی موجود ہے۔ پھر انسان اور حیوان میں فرق ہی کیا ہوا؟

خوب سمجھ لو کہ روح انسانی کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف ہے، چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہدو کہ روح امرِ ربی[1] ہے" پس یہی وہ روح ہے جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اور روح الٰہی کی حقیقت کو چونکہ یہ کوتاہ نظر طبیب اور منجم[2] نہیں سمجھ سکتے۔ لہذا ان کو دھوکہ ہوا اور آخرت کے منکر ہو کر دہریہ بن گئے کہ جب بدن سے نکل گئی اور بدن کا حس وحرکت جاتا رہا تو وہ مٹی ہو کر مٹی میں مل گیا اور رَل رُلا گیا کہ نہ اس کو اب راحت کا شعور ہو سکتا ہے نہ تکلیف کا۔ ان کم سمجھ لوگوں کی سمجھ پر افسوس ہے کہ اول تو ایک جم غفیر کے مقابلہ پر ان معدودے چند لوگوں کا قول ہی قابل التفات نہیں ہے اور اگر کچھ ہو بھی تو میں پوچھتا ہوں کہ ان کے قول کو تم بالکل یقینی سمجھتے ہو یا کچھ تھوڑا بہت اس میں جھوٹ کا احتمال بھی ہے؟ پس اگر جھوٹ کا احتمال ہے تو اب تم ہی بتاؤ کہ احتیاط کس بات کو چاہتی ہے؟

احتیاط اور عقل بھی فکر آخرت کو مقتضی ہے

ظاہر ہے کہ احتیاط کا مقتضی یہی ہے کہ آخرت کے لئے سامان جمع کرو اور اس کی فکر کرو، کیونکہ اگر مثلاً تم کو بھوک ہو اور کھانا بھی

---

[1] میرے رب کا حکم ۱۲

[2] نجومی ۔ علم نجوم جاننے والا ۱۲

سامنے رکھا ہوا ہے مگر کوئی شخص وثوق کے ساتھ بیان کرے کہ اس کھانے میں زہر ملا ہوا ہے، اور دوسرا شخص کہے کہ نہیں اس میں زہر نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ احتیاط کی بنا پر تم اس کھانے سے ضرور پرہیز کرو گے اور یہ سمجھو گے کہ اگرچہ اس میں زہر ہونے کا یقین نہیں ہے مگر پھر بھی اس کا شبہ اور احتمال چونکہ ضرور ہے لہذا ایک وقت بھوکا رہنا اس مشکوک کھانا کھانے سے بہتر ہے، کیونکہ اس کی ایک شق میں مرجانے کا احتمال ہے، اور دوسری صورت میں موت سے تو حفاظت ہے، ہاں اگر ہے تو تھوڑی سی بھوک ہی کی تکلیف ہے جس کو آسانی سے برداشت کر سکتے ہیں۔ کہ ذرا سی لذت اگر حاصل نہ ہوئی نہ سہی زندگی تو باقی رہے گی۔ اگر زندگی ہے تو سب کچھ ہے۔

دیکھو ایک شاعر باوجود کثافت عقل کے کیا کہتا ہے اس کے عربی اشعار کا ترجمہ یہ ہے کہ:

"منجم اور طبیب نے مجھ سے کہا کہ مرجانے والے انسان دوبارہ کبھی زندہ نہ ہوں گے۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ جاؤ دور ہو، اور اگر تم سچے ہو تو میرا تو اس وقت بھی کچھ نقصان نہ ہوگا بس اتنا ہی کہ اعمال کچھ کام نہ آئیں گے سو نہ سہی تکلیف تو نہ ہوگی اور اگر تم جھوٹے نکلے تب تو ظاہر ہے کہ میں نفع میں رہا اور خسارہ تم کو اٹھانا پڑا کہ تم آخرت کے منکر ہونے کی وجہ سے اس کا کچھ بھی سامان ساتھ نہ لائے، اور میں دنیا ہی میں اس کا فکر کر کے تیار ہو آیا تھا"

الغرض دنیا میں رہ کر دینی امور کی سعی کرنے اور نیک اعمال کا ذخیرہ فراہم کر لینے کی صورت میں تو بہر حال نفع ہی نفع ہے۔

✕✕✕

حُبّ دنیا کا لاعلاج درجہ

اور اگر تم یہ کہو کہ ہیں تو جاہل نجومی اور زندیق طبیب کا قول بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جھوٹ کا احتمال ہی نہیں، تمام انبیاء علیہم السلام اور اور اولیائے کرام کو نعوذ باللہ دھوکہ ہوگیا، پس نہ آخرت کوئی چیز ہے اور نہ ثواب اور نہ عذاب کوئی بات ہے۔ اگر خدانخواستہ تمہارا خیال ایسا ہو جائے تو اب تمہارا مرض لاعلاج ہے۔ کیونکہ تمہارے مزاج کا فساد اور عقل کی رکاکت[1] صراحۃً ظاہر ہوگئی اور پھر بھی تم اس کو عقلمندی سمجھتے ہو کہ بلا دلیل ایک وہمی اور لغو بات کو یقینی اور بدیہی بتلاتے ہو۔ اس صورت میں علاج اور صحت کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ پس ہم بھی ایسے شخص کو نصیحت کرنے سے مُنہ پھیر لیں گے۔

دنیا کی محبت کا آخری علاج

البتہ چلتے چلتے اتنا پھر بھی سمجھائیں گے کہ اچھا میاں اگر دنیا ہی تمہاری محبوب ہے اور یہیں کی راحت اور آرام کے شیدا ہو تو تب بھی ہمارے کہنے کے موافق ناپائدار دنیا کے تعلقات کا کم کرنا تم کو ضروری ہے کیونکہ جو مزہ اور راحت و آرام آزادی میں ہے وہ پابندی میں نہیں ہے۔ پس اگر تم نفس کے پابند ہوگئے اور خواہشات و تعلقات میں جکڑ گئے ہو تو یاد رکھو کہ ہر قسم کی ذلت و رسوائی اٹھانی پڑے گی کہ جوتیاں کھاؤ گے اور اپنی جیسی محتاج مخلوق کے آگے ہاتھ پھیلاتے اور خوشامدیں کرتے پھرو گے۔

دیکھو دنیا کے تعلقات اور بکھیڑے ایسے بُرے ہوتے ہیں کہ بہتیرے

---

[1] کمزوری دُرستی ۱۲

کافر جن کو آخرت پر ایمان نہ تھا وہ بھی تو ان سے گھبرا اٹھے اور تارکِ[1] دنیا ہو کر جوگی اور راہب[2] بن گئے۔ انہوں نے بھی اتنا سمجھ لیا کہ دنیا دل لگانے کے قابل چیز نہیں ہے۔ کیونکہ اس ناپائدار جہان کو ایک دن چھوڑنا ضرور پڑے گا۔ اور یہاں رہ کر جس کسی سے بھی محبت یا علاقہ رکھا جائے گا وہ بہت جلد منقطع ہو جائے گا۔ کہ یا ہم اس کو چھوڑ کر رخصت ہو جائیں گے۔ اور یا وہ ہم کو چھوڑ کر روانہ ہو جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اس مفارقت کا انجام سوائے مصیبت و رنج اور صدمہ و تکلیف کے کچھ بھی نہیں ہے۔ پس جب کافروں کو آخرت کا بالکل انکار ہونے کی صورت میں دنیا کے تعلقات ترک کرنے کے اندر راحت معلوم ہوتی ہے تو تم پھر بھی مسلمان کہلائے جاتے ہو پھر معلوم نہیں کہ ان تعلقات میں پھنسنے کو راحت کا سامان کس طرح سمجھتے ہو؟

اور اگر کسی شخص کو دنیا کی آفتیں اور ناپائداری بھی نظر نہ آئے اور ترکِ خواہشات و تعلقات کو عقلاً بھی مفید نہ سمجھے تو بس ایسے احمق کو خدا سمجھے کہ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے، ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا الخ کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کو چھوڑ و کہ کھائیں اور مزہ کریں اور ان کی امیدیں ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں سو عنقریب ان کو معلوم ہو جائیگا۔ بحمداللہ دوسری قسم کا مفصل بیان ختم ہو گیا۔ حق تعالیٰ شانہ اس پر عمل کرنے کی توفیق لوگوں کو مرحمت فرمائے اور اس تحریر کو وسیلۂ ہدایت بنا دے

آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ و السلام علی رسولہ وصفیہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین ط

---

[1] دنیا چھوڑنے والا زاہد ۱۲ [2] آبادی سے باہر رہ کر عبادت کرنے والا ۱۲

قلب کو اخلاق محمودہ کے ساتھ مزین کرنے کا بیان اور اس کے دس اصول

پہلی اصل

توبہ کا بیان

توبہ سے حق تعالیٰ کی خوشی کا اندازہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "مسلمانو! تم سب اللہ کی طرف رجوع کرو بیشک وہ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے" اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "جس نے گناہ کے بعد توبہ کرلی وہ گویا بے گناہ ہوگیا"

حق تعالیٰ کو بندہ کی توبہ سے جتنی خوشی ہوتی ہے اس کا اندازہ اس سے کرو کہ اگر مثلاً کوئی شخص کسی بے آب وگیاہ اور دہشت ناک جنگل میں پہنچ جائے اور اس کی سواری مع توشہ کے جو اس پر رکھا ہوا تھا گم ہوجائے کہ وہ اس کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا تھک جائے اور آخر اس وجہ سے کہ سواری کے بغیر نہ جنگل سے باہر نکل سکتا ہے اور نہ توشہ کے بغیر فاقہ کی موت سے جان بچا سکتا ہے، زندگی سے مایوس ہوجائے کہ نہ پیدل چلنے کی طاقت ہو اور نہ

۱؎ پسندیدہ عادتیں ۱۲ ۲؎ ابن ماجہ وطبرانی کبیر وبیہقی ۱۲

۳؎ خالص اور شرائط سمیت ۱۲

وہاں آب و دانہ میسر آنے کی امید۔ اس لئے مایوس ہو کر کسی درخت کے نیچے آلیٹے اور اپنے ہاتھ پر سر رکھ کر اس فکر میں ڈوبا ہوا سو جائے کہ اب موت آیا چاہتی ہے اور پھر دفعۃً اس کی آنکھ کھل جائے اور وہ دیکھے کہ اس کی کھوئی ہوئی سواری اس کے پاس کھڑی ہے اور کھانے پینے کا سامان جو اس پر لدا ہوا تھا وہ بجنسہٖ موجود ہے، تو اس کی ایسی حالت میں اپنی زندگی سے نا امید ہونے کے بعد سرمایۂ حیات ہاتھ لگنے کی وجہ سے جتنی خوشی دفعۃً حاصل ہوگی اس سے زیادہ حق تعالیٰ کو اس وقت خوشی ہوتی ہے جبکہ بندہ اس کی جانب رجوع کرتا اور اپنے گناہ سے توبہ کرتا ہے۔

توبہ کے معنی اور ابتدائی درجہ

توبہ کے معنی رجوع کرنے اور بُعد سے قُرب کی جانب لوٹ آنے کے ہیں۔ مگر اس کے لئے بھی ایک ابتداء ہے اور ایک انتہا۔ ابتدا تو یہ ہے کہ قلب پر نورِ معرفت کی شعاعیں پھیل جاویں اور دل کو اس مضمون کی پوری آگاہی حاصل ہو جائے کہ گناہ سم قاتل اور تباہ کر دینے والی شئی ہے، اور پھر خوف اور ندامت پیدا ہو کر گناہ کی تلافی کرنے کی سچی اور خالص رغبت اتنی پیدا ہو جائے کہ جس گناہ میں مبتلا تھا اس کو فوراً چھوڑ دے اور آئندہ کیلئے اس گناہ سے بچنے اور پرہیز کرنے کا مصمم قصد کر لے، اور اس کے ساتھ ہی جہاں تک ہو سکے گذشتہ تقصیر و کوتاہی کا تدارک کرے۔ جب ماضی اور مستقبل اور حال تینوں زمانوں کے متعلق توبہ کا یہ ثمرہ پیدا ہو جائے تو گویا توبہ کا وہ کمال حاصل ہو گیا جس کا نام توبہ کی انتہا ہے۔

❖ ❖ ❖

فصل

توبہ ہر شخص پر واجب ہے توبہ کے معنی اور حقیقت سمجھنے کے بعد واضح ہوگیا ہوگا۔ کہ توبہ ہر شخص پر واجب ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ تمام مسلمانوں کو مخاطب بنا کر فرماتا ہے کہ " اے ایمان والو! تم سب توبہ کرو تاکہ فلاح پاؤ " چونکہ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ گناہوں کو اخروی زندگی کے لئے سمِ قاتل اور مہلک سمجھے اور ان کے چھوڑنے کا عزم کرلے، اور اتنا مضمون ایمان کا جزو ہے، ہر مومن پر اس کا واجب اور ضروری ہونا تو ظاہر ہے، اب رہا تمام بنی آدم اور ہر فرد بشر کو توبہ کا وجوب، سو اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی چار قسم کی صفات سے مرکب ہے کیونکہ اس کے خمیر میں :-

اول :- حرص و شہوت اور فسق و فجور داخل ہے جو بہائم کی خصلت ہے۔

دوم :- غصہ اور حسد اور بغض و عداوت کا مادہ اس کے اندر موجود ہے جو درندوں کی صفت ہے۔

سوم :- مکر و فریب اور دھوکہ دہی و مکاری اس میں رکھی ہوئی ہے جو شیطانی اخلاق ہے۔

چہارم :- کبر و نخوت، تعلّی و تفاخر، حبّ مدح و حبّ جاہ، حکمرانی و سلطنت حکومت و شان اور غلبہ و عزت کی طلب کا مادہ اس میں موجود ہے۔

اور یہ سب ربوبیت[1] کی صفات ہیں۔

---

[1] رب ہونا ۱۲

بدخصائل کا مادہ اپنے اپنے وقت پر غلبہ دکھلاتا ہے

ان چاروں خصائل کا اپنے اپنے وقت پر اور موقع پر غلبہ اور اثر ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے زمانۂ طفولیت میں تو بہائم اور حیوانات کی خصلتیں غلبہ کیا کرتی ہیں اور انسان شہوت و حرص میں گویا چوپایہ اور جانور بن جاتا ہے۔

اس کے بعد جب نوجوانی کا زمانہ آتا ہے تو درندوں کی عادتوں کا غلبہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے پر حسد کرتا ہے، باہم عداوتیں پیدا ہوتی ہیں، کسی سے بغض ہے، کسی سے عناد۔ کسی پر غصہ آرہا ہے، کسی کو ذرا سی خلاف طبع بات پر پچھاڑ کھاتا اور آپے سے باہر ہوا جاتا ہے۔ چیختا چلاتا اور ڈردکتا ہے۔ کسی کو نعمت یا خوشحالی میں دیکھتا ہے تو جلتا کلستا اور چھیننے جھپٹنے کی فکر میں طیش کھایا کرتا ہے۔ غرض اس حالت میں وہ اور درندہ گویا ہم جنس بن جاتے ہیں۔

پھر جب اس کے بعد عالمِ شباب کا شباب ہوتا ہے اور بدن میں قوت آجاتی ہے تو یہ بہائم و درندوں کی خصلتیں چاہتی ہیں کہ اپنی خواہشیں پوری کر دیں یعنی مرغوب اور پسندیدہ شئے کو حاصل کریں اور دشمن و ناپسندیدہ امر کو زیرِ خاک ملائیں۔ پس اس وقت شیطانی اخلاق ظاہر ہوتے اور اپنا غلبہ کرتے ہیں کہ ابھی کسی شئے کی خواہش پوری ہوئی اور فریب و دھوکہ بازی نے مدد کرنے کا اقرار کیا۔ ابھی کسی دشمن پر غصہ آیا اور فوراً مکاری و جعل سازی نے اپنی دانائی و ہوشیاری کو پیش کیا۔ غرض اخلاق شیطانیہ اس زمانہ میں خصائل بہیمیہ[1] اور عادات سبعیہ[2] کے نفاذ میں معین و مددگار بنتے اور انسان کو شیطان مجسم

---

[1] چوپایوں والی ۱۲ [2] درندوں والی ۱۲

بنا دیتے ہیں، اور جب اس میں کامیابی و ظفر اور اپنی حسب منشا کارروائیوں میں فتح نظر آنے لگتی ہے تو پھر تکبر و تعلی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہر شخص اس کی مدد کرے، ہر شخص اس کا مطیع و فرمانبردار ہو جاوے، ہر شخص اس کی بڑائی اور کمال کا معترف ہو، ہر شخص اس کو عقلمند اور واجب التعظیم سمجھے۔ غرض ایسی فرعونیت ذہن میں سماتی ہے کہ "ہم چو ما دیگرے نیست" کا پتلا مجسم بن جاتا ہے۔

قلب انسانی ظلماتی اور خدائی لشکر کا میدان جنگ ہے

اور جب ان چاروں خصلتوں کا ظہور ہو لیتا ہے تو اب عقل کی قندیل اپنا منہ دکھاتی ہے جس میں ایمان کا چراغ روشن ہوتا ہے اور اس کو بھلے اور بُرے میں امتیاز کا موقع دیتا ہے، اگر یہ روشنی ظاہر نہ ہو تو خصائل مذکورہ کی ظلمت و تاریکی سے نجات ملنی دشوار ہو جائے مگر ساتھ ہی اس کے یہ بھی ہے کہ قندیل عقل اور شعل ایمانی کا نور چالیس سال کی عمر میں کمال پر پہنچتا ہے اور جو بد خصلتیں بلوغ کے وقت پیدا ہونے لگی تھیں ان کی اصلیت اور حقیقت اچھی طرح کھل جاتی ہے۔ بس جس وقت یہ نور نظر آتا ہے تو انسان کا قلب گویا جنگ کا ایک وسیع میدان ہوتا ہے جس میں اس ظلماتی لشکر یعنی چاروں خصائل مذکورہ کی اس خدائی لشکر یعنی عقل اور نورِ ایمان کے ساتھ جنگ ہوتی ہے اور دونوں لشکروں میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ دوسرے کو مغلوب اور اپنا تابع فرمان غلام بنا لے، پس اگر نور عقل کمزور ہو تو شیطانی لشکر فتحیاب ہو کر قلب پر مسلط ہو جاتا ہے اور دشمن سے بے خوف ہو کر قلب انسانی پر قبضہ اور حکومت کرنے لگتا ہے۔ اور اگر شیطانی گروہ پسپا ہوا اور میدان جنگ عقل اور ایمان کے ہاتھ رہا تو انسان کی حالت

سنور جاتی اور طبیعت مہذب بن جاتی ہے ۔

اور چونکہ بنی آدم کی فطرت ہی اس جنگ وکارزار کو مقتضی ہے اس لئے ہر شخص کے لئے اس کا پیش آنا لازمی ہے پس ثابت ہوگیا کہ توبہ سے کوئی شخص بھی مستغنی نہیں ہے کیونکہ اس نور عقل ہی کا نام توبہ ہے جو معرکہ کے وقت ظلمانی[1] لشکر یعنی خصائل شیطانیہ و بہیمیہ کا مدمقابل بنتا اور انسان کو اس پاک شریعت کا تابعدار بنانے کی کوشش کرتا ہے جس سے آخرت کی فلاح اور ابدی نجات[2] ہوتی ہے ۔

کوئی انسان کسی وقت بھی گناہ سے خالی نہیں!

چونکہ کوئی انسان کسی وقت بھی گناہ سے خالی نہیں ہے اس لئے کوئی وقت بھی ایسا نہ ہوگا جس میں کوئی شخص توبہ سے مستغنی ہو کیونکہ انسان کسی حال اور کسی رتبہ کا بھی ہو یہ ضروری ہے کہ یا تو اس کے اعضاء میں سے کوئی عضو کسی گناہ کا مرتکب ہو رہا ہوگا ۔ اور یا قلب سے کوئی گناہ ثابت ہو رہا ہوگا ، یعنی یا تو جوارح[3] کسی خلاف شرع حالت میں ملوث[4] ہوں اور یا قلب کسی مذموم خصلت یا ایسی بدعادت میں ضرور مبتلا ہوگا کہ جس کی اصلاح کے لئے توبہ کی حاجت ہوگی ۔

معصوم و بے گناہ کو بھی توبہ کی حاجت ہے

اور اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ کوئی انسان فرشتہ سیرت اور ایسا مہذب بن گیا کہ اس کی کوئی عادت اور کوئی خصلت بھی ایسی

---

[1] تاریکی والا ۱۲

[2] کامیابی اور ہمیشہ کی نجات ۱۲

[3] ظاہری اعضاء ۱۲

[4] آلودہ ۱۲

نہیں ہے جس کو اصلاح کی ضرورت ہو تب بھی کوئی وقت تو ایسا ضرور ہوگا جس میں حق تعالیٰ کی یاد سے اس کو غفلت ہوگی اور چونکہ حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ "جب اپنے پروردگار کو بھولو تو فوراً یاد کرلو" اس لئے پھر بھی اس حالت سے رجوع کرنے اور غفلت سے یاد کی طرف پلٹنے کی ضرورت ہوئی اور اسی رجوع کا نام توبہ ہے۔

اور اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ کوئی شخص خدا کی یاد میں ہر آن مستغرق اور محو ہے کہ کوئی لحظہ بھی قلب کو غفلت نہیں ہوتی، اگرچہ اس درجہ استغراق دشوار بلکہ قریب قریب ناممکن ہے۔ تاہم اگر ایسا مان بھی لیا جائے تو ہم کہیں گے کہ انسان جس مقام اور جس مرتبہ میں ہے اس سے عالی مرتبہ میں پہنچنے سے پہلے پہلے پھر بھی توبہ کا محتاج ہے۔ کیونکہ ہر مقام اور ہر مرتبہ اپنے عالی اور مافوق مقام و مرتبہ کے اعتبار سے ناقص کہلاتا ہے، اور ناقص سے باہر نکلنا اور عالی و کامل پر پہنچنا ہر شخص پر لازمی ہے۔ پس جب تک بھی اس میں رہے گا تو ضرور توبہ کا محتاج رہے گا۔ اور جب دوسرے درجہ پہنچے گا تو چونکہ وہ درجہ بھی اپنے مافوق درجہ کے اعتبار سے ناقص ہے اس لئے جب تک اس سے باہر نہ نکلے اور اوپر نہ پہنچے اس وقت تک وہاں بھی توبہ کا حاجتمند ہوگا، اسی طرح سلسلہ چڑھتا رہے گا کہ جوں جوں ترقی کرے گا ووں ووں توبہ کا ضرورت مند ہوتا رہے گا۔ اور چونکہ مراتب قرب خداوندی غیر متناہی[1] ہیں یعنی کوئی مرتبہ بھی ایسا نہیں جس کے مافوق[2] اور بالا کوئی دوسرا مرتبہ نہ ہو۔ لہٰذا کوئی حالت بھی ایسی نہ نکلے گی جس میں انسان کو نسبتاً ناقص مرتبہ میں رہنے کی

---

[1] نہ ختم ہونے والا ۱۲ [2] اوپر ۱۲

وجہ سے خطا وار عاجز اور عالی مرتبہ تک نہ پہنچنے کے سبب توبہ کا ضرورتمند نہ کہا جائے۔ یہی بات ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی معصوم و بے گناہ ذات کے متعلق فرماتے ہیں کہ " میں رات دن میں ستر مرتبہ توبہ اور استغفار کرتا ہوں "[1]

ہاں یہ ضرور ہے کہ عام لوگوں کی توبہ ظاہری گناہوں سے ہوا کرتی ہے اور صالحین کی توبہ باطنی گناہوں اور مذموم اخلاق سے ہوا کرتی ہے اور متقین کی توبہ شک وشبہات کے ابتلا[2] سے ہوتی ہے اور محبین کی توبہ اس غفلت سے ہوتی ہے جس نے ذکر الٰہی کو کسی لحظہ میں بھلا دیا تھا ، اور عارفین کی توبہ اس مقام سے ہوتی ہے جس پر پہنچے ہوئے ہیں مگر اس کے مافوق دوسرا مرتبہ ہے جس پر پہنچنا چاہیئے۔ اور چونکہ حق تعالیٰ کے قرب کے مراتب ومقامات غیر متناہی اور بیشمار ہیں اس لئے عارفین کی توبہ کا کوئی منتہی[3] نہیں۔ اور نہ اس کے خاتمہ کا کوئی وقت معین ہے۔

فصل

شرائط توبہ کے پورا ہوجانے پر قبولیت میں شک نہیں

توبہ کی جب تمام شرائط پوری ہوجائیں گی تو اس کی قبولیت میں شک نہ ہوگا کیونکہ توبہ قبول ہونے کے یہ معنیٰ ہیں کہ انسان کے قلب میں انوارِ معرفت کی تجلیات کے قبول کرنے کی استعداد پیدا ہوجائے۔ اور ظاہر ہے کہ انسان کا قلب آئینہ کی مانند ہے جس پر خواہشات نفسانیہ اور حرص وہوا کے باعث غبار جم جاتا ہے ، یا گناہ کی

---

[1] مسلم ونسائی وابوداؤد واحمد ۱۲ [2] مبتلا ہونا [3] انتہا ۱۲

وجہ سے سیاہی چھا جاتی ہے۔ مگر نیک کام جو بمنزلہ نور کے ہیں اپنی روشنی اور چمک دمک سے اس تاریکی کو دور کر کے آئینۂ قلب کی صیقل کرتے رہتے ہیں اس لئے جب انسان کوئی بُرا کام کر لے گا اور نادم و پشیمان ہو کر حق تعالےٰ کی طرف متوجہ ہوگا تو ضرور ایسی حالت ہوگی جیسے کپڑے پر صابن لگانے سے ہوتی ہے کہ اگر صابن باقاعدہ لگا یا گیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ میل نہ اترے، اسی طرح اگر دل اخلاص و توجہ کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ ہوا ہے تو ممکن نہیں کہ قلب میں صفائی و انشراح[1] اور تجلیات معرفت کی استعداد و قابلیت نہ پیدا ہو۔ ہاں بعض بزرگوں کو توبہ کے بعد قبولیتِ توبہ میں جو شک ہوا ہے وہ حقیقت میں قبولیت توبہ کے شرائط جمع ہونے میں شک ہوا ہے کہ خدا معلوم ساری شرطیں پوری ہوئیں یا نہیں ؟ جیسے کوئی شخص مسہل دوا پئے اور پھر بھی اس کو دستوں کے آنے میں شک ہو تو یہ شک دوا کے دست آور ہونے میں نہیں ہے بلکہ اس امر میں شک ہے کہ مسہل کی شرائط پوری طرح ادا ہوگئیں یا نہیں ؟ یعنی دوا کے اجزا پوری مقدار پر تھے بھی یا کم و بیش ہو گئے؟ موسم و وقت اسہال کے مناسب بھی تھا یا نہ تھا۔ اور اگر ان جملہ امور میں اطمینان ہو تو پھر دستوں کے آنے اور غلیظ و متعفن مادہ کے خارج ہو جانے میں کبھی شک نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر توبہ کے تمام شرائط جمع ہونے کا پورا یقین ہو جاوے تو پھر اس کی قبولیت میں شک ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں۔

غرض جب ثابت ہو گیا کہ ہر شخص کو توبہ کی ضرورت ہے اور ہر فرد بشر اس معالجہ کا محتاج ہے تو اس میں غفلت کرنا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ

---

[1] کھل جانا یا فرحت ۱۲

غفلت اور ہوائے نفس ایسا مہلک مرض ہے جس کی وجہ سے انسان خدا کی معصیت اور گناہ کے کام پر اصرار اور مداومت کرنے لگتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اصرار یعنی بار بار کرنے سے صغیرہ گناہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے۔ پس جب اس اصرار کو چھوڑ دو گے تو اس باطنی مرض سے نجات مل جائے گی۔

مرض غفلت باطنی جملہ امراضِ بدنی سے بڑھا ہوا ہے!!

خوب یاد رکھو کہ غفلت کا باطنی مرض بخار، جاڑا، پھنسی، پھوڑا وغیرہ یعنی جسم کے ظاہری امراض سے بہت بڑھا ہوا ہے۔ اور اس کی کئی وجہ ہیں:

اوّل تو اس وجہ سے کہ بدن کے امراض نظر آتے ہیں اور یہ مرض نظر نہیں آتا۔ اس کی مثال ایسی سمجھو جیسے کسی شخص کے چہرہ پر برص[1] کے داغ سفید ہوں اور اتفاق سے آئینہ بھی موجود نہ ہو جس میں مُنہ دیکھ کر اپنا مرض معلوم کرلے تو یہ مرض زیادہ خطرناک ہوگا، کیونکہ ممکن ہے کہ دوسرے کے کہنے کا اس کو یقین نہ آئے اور اسی بے اعتباری میں اس کا مرض دن بدن بڑھتا جائے

دوم۔ اس وجہ سے کہ غفلت کے باطنی مرض کا انجام انسان نے دیکھا نہیں اور اس انجام کے نہ دیکھنے ہی کی وجہ سے حق تعالیٰ کی معافی پر بھروسہ کر کے ایسا مطمئن اور بے فکر ہو بیٹھا کہ علاج کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتا۔ برخلاف بدنی امراض کے کہ ان کا نتیجہ و انجام اس کے تجربہ میں آچکا ہے اور اس لئے یہاں خدا پر بھروسہ نہیں ہوتا بلکہ علاج میں غایت درجہ کی کوشش کی جاتی ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ ہر قسم کے جملہ امراض کا پیدا کرنے والا اور

---

[1] فسادِ مزاج سے بدن کا بگڑ جانا ۱۲

شفا دینے والا وہی خدا ہے خواہ امراض جسمانی ہوں یا روحانی اور ظاہری ہوں یا باطنی۔

طبیب خود مریض بن گئے اور علماء محبّانِ دنیا ہو گئے

سوم۔ اس وجہ سے کہ اس باطنی مرض کے طبیب مفقود ہو گئے۔ اور یہ بات نہایت درجہ افسوس و حسرت کے قابل ہے کیونکہ اس قلبی مرض کے طبیب علماء شریعت اور عقلاء زمانہ تھے، اور وہ خود باطنی بیماریوں میں مبتلا ہو رہے ہیں پھر جب ان کو اپنے ہی علاج کی خبر نہیں تو دوسروں کا علاج وہ کیا کریں گے۔ ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ مہلک مرض دنیا اور مال دنیا کی محبت ہے۔ اور اس زمانۂ پُر آشوب¹ میں سب سے زیادہ اس مرض میں علماء ہی گرفتار نظر آتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ دوسروں کو دنیا کی محبت سے روکنے اور منع کرنے کی ان کو جرأت نہیں ہوتی، بلکہ اپنی رسوائی کے اندیشہ سے وہ یہ بھی نہیں ظاہر کر سکتے کہ دنیا کی محبت بُری چیز اور باطنی امراض میں ایسا مہلک مرض ہے جس سے جانبری دشوار ہے۔ پس یہی وجہ ہے کہ یہ مرض لاعلاج ہو گیا۔ کیونکہ جب طاعون یا وبائی مرض عام طور پر پھیل جائے اور دوا کا پتہ نہ مل سکے اور طبیب خود مریض اور اسی مرض کے بیمار بنے ہوئے ہوں تو بھلا اس سے نجات کیونکر حاصل ہو۔ سب سے زیادہ مصیبت یہ ہے کہ ان روحانی طبیبوں یعنی علماء کی دیکھا دیکھی عوام الناس کو محبت دنیا کی رغبت بڑھ گئی اور پرہیز یا دوا و علاج کی طرف توجہ کرنے کی کوئی سبیل بھی باقی نہ رہی کیونکہ یہی وہ اصحاب ہیں جن کی تقلید کی جاتی ہے اور عام آدمی انہی کو اپنا

---

¹ فتنہ سے لبریز ۱۲

پیشوا اور مقتدا سمجھتے ہیں، پس جب انہی کو محبت دنیا میں گرفتار دیکھیں گے تو پھر اس کو اچھی بات سمجھ کر کیوں نہ اقتدا کریں گے؟ اور جب اقتدا کریں گے تو پھر اصلاح کی کیا صورت؟ افسوس کہ جن کو طبیب بنا کر دنیا میں بھیجا گیا تھا، انہوں نے بجائے علاج کے مرض کو اور بڑھا دیا۔ جو لوگ مصلح بنکر آئے تھے، وہ مفسد بن گئے۔ اور جن کو رہبر تجویز کیا گیا تھا، وہ خود گمراہ ہو کر دوسروں کا راستہ کھوٹا کرنے کے درپے ہو گئے۔ گویا شیریں چشمہ کے دہانہ پر پتھر رکھکر اڑ گئے کہ نہ خود پانی پئیں نہ دوسروں کو پینے دیں۔ اے کاش! ان سے دنیا خالی ہو جائے، اور یہ پتھر دہانہ سے سرک جائے۔ اگر وہ خود ناقابل ہیں تو ناقابل ہی سہی، مگر چشمہ کا دہانہ کیوں روکے ہوئے ہیں؟ پرے ہوں، الگ ہٹیں کہ دوسرے تشنہ[1] کام تو سیراب ہو جائیں۔

غرض اس باطنی مرض کا خلاصۂ علاج یہ ہے کہ سبب ڈھونڈو اور گناہ کے اصرار پر توجہ کرو کہ کیوں ہے؟

یاد رکھو کہ کسی گناہ پر جو اصرار ہوا کرتا ہے تو مفصلۂ ذیل پانچ اسباب میں سے کسی ایک سبب سے ہوا کرتا ہے:

گناہ پر اصرار ہونے اور توبہ نہ کرنے کی پہلی وجہ اور اس کا علاج

اوّل یہ کہ گناہ پر جو سزا حق تعالیٰ نے تجویز فرمائی ہے، وہ گناہ کرتے ہی دست بدست نہیں ملا کرتی، اور ظاہر ہے کہ جس فعل کا نتیجہ دست بدست نہیں ملتا، ذہن میں اس کی وقعت نہیں ہوا کرتی۔ لہذا گناہ پر اصرار ہونے لگتا ہے۔

---

[1] پیاسے ۱۲

اس کا علاج یہ ہے کہ سوچنا اور جاننا چاہئے کہ جو چیز ایک نہ ایک دن ضرور آنے والی ہے وہ قریب ہی ہے کیونکہ بعید تو اس کو کہنا چاہئے جو آئے نہیں، اور جو ایک دن آنے والی ہے وہ بعید کہاں؟ خصوصًا موت کہ جس کا آنا یقینی بھی ہے، اور پھر اس کا وقت بھی مقرر نہیں تو اس کے بعید ہونے کا تو معنیٰ ہی نہیں۔ کیا خبر ہے کہ آج ہی کا دن آخری دن اور یہی مہینہ آخری مہینہ اور یہی سال تمہاری عمر کا آخری سال ہو۔ اس کی طرف سے غفلت کرنا حماقت ہے۔ پھر یہ بھی سوچو کہ آئندہ کے افلاس کے اندیشہ سے معاش کے حاصل کرنے کی فکر میں تم کیسے دور دراز کے سفر اور مصائب برداشت کرتے ہو، تو کیا آخرت کی پائدار زندگی کا اتنا بھی فکر نہ ہو جتنا دنیا کی بہت ہی جلد ختم ہو جانے والی ناپائدار زندگی کا ہوتا ہے۔

توبہ میں آج کل کرنے کا دوسرا سبب اور اس کا علاج

دوسرا سبب یہ ہے کہ نفس کو اپنی مرغوب خواہشوں اور لذتوں میں مزہ آرہا ہے لہٰذا ان کا چھوڑنا اس کو ناگوار گزرتا ہے۔

اس کا علاج یہ ہے کہ سوچو اور غور کرو کہ اگر کوئی انگریز ڈاکٹر یوں کہہ دے کہ "میاں ٹھنڈا پانی تمہیں مضر ہے تم اس کے پاس بھی جانا ورنہ مر جاؤ گے" تو میں تم سے پوچھتا ہوں کہ ڈاکٹر کی اس نصیحت کا تم پر کیا اثر ہوگا؟ ظاہر ہے کہ زندگی برباد ہو جانے کے خوف سے ٹھنڈے پانی جیسی لذیذ نعمت بھی تم سے چھوٹ جائے گی۔ حالانکہ یہ ایک انسان کا قول ہے اور انسان بھی کافر۔ پس اس میں جھوٹ کے بیسیوں احتمال نکل سکتے ہیں۔ پھر بھلا خداوند کریم کی مضر بتلائی ہوئی

خواہشات کو توڑنے میں کیا تامل ہے ؟ کیا اللہ اور اللہ کے سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کسی کافر طبیب کے قول کے برابر بھی نہیں ہے ؟ یا جسمانی مرض سے مرجانا کیا ہمیشہ آگ میں جلنے سے بھی زیادہ تکلیف دالا ہے ؟ پھر یہ بھی تو سوچو کہ جب تمہارا نفس اس قدر لذت پسند اور خواہشات کا پابند ہے کہ دنیا میں چند روز کے لئے معمولی لذتوں کا چھوڑنا بھی اس کو شاق گزرتا ہے تو یہاں ان ناپائدار لذتوں کے حاصل کرنے کی بدولت جب آخرت کی دائمی نعمتیں چھن گئیں تو ان کے چھوڑنے اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آگ میں جلنے کی وہ برداشت کس طرح کرے گا۔

تیسرا سبب اور اس کا علاج

تیسرا سبب یہ ہے کہ نفس نے تم کو کاہلی کا سبق پڑھایا اور یہ شوشہ چھوڑ دیا ہے کہ میاں توبہ کی ایسی جلدی ہی کیا ہے آج نہیں تو کل کرلیں گے غرض اسی طرح دن گزرتے رہتے ہیں اور توبہ کی توفیق نہیں ہوتی۔ اس تعویق، اور تاخیر اور آج کل میں وقت برابر ہو جاتا ہے اور موت آجاتی ہے۔ پس اگر گناہ پر اصرار کرنے کا باعث یہ کاہلی ہوئی تو اس مضمون کو سوچنا چاہیئے کہ انجام کا حال کسی کو معلوم نہیں کہ کب ہوگا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ تم کل زندہ بھی رہوگے اور توبہ نصیب بھی ہو جائے گی ؟

خوب یاد رکھو کہ ایسے ہی لوگ جہنم کا ایندھن بنیں گے جنہوں نے توبہ کرنے کو امروز فردا میں رکھا یہاں تک کہ موت نے آپکڑا۔

دوسرے یہ بھی سوچنے کے قابل بات ہے کہ جب نفس کو لذت کا چھوڑنا آج دشوار ہو رہا ہے تو بھلا کل کو جب کہ شہوت کی لذت اور مضبوط ہو جائے گی تو نفس سے کیونکر چھوٹ سکے گی۔ اس کی مثال

تو ایسی ہوگی جیسے تم کو کسی درخت کے اکھاڑنے کا حکم ہو جائے اور تم یوں کہو کہ جناب اس سال تو نہیں ہاں اگلے سال اکھاڑ دوں گا۔ حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ درخت کی جڑ دن بدن مضبوط ہوگی اور تمہاری قوت روز بروز گھٹے گی اور ضعف بڑھے گا۔ پس جب درخت کو آج نہیں اکھاڑ سکے تو اس کو آئندہ سال کس طرح اکھاڑ دوگے۔

چوتھا اور پانچواں سبب اور اس کا علاج

چوتھا سبب یہ ہے کہ نفس نے حق تعالیٰ کے عفو و کرم کا آرزومند بنا رکھا ہے اور یہ شوشہ چھوڑ دیا ہے کہ میاں خدا کو ہمارے گناہوں کی پرواہ ہی کیا ہے وہ بڑا غفور رحیم ہے۔ سارے گناہ بخش دے گا۔

خوب یاد رکھو کہ یہ نفس کی مکاری اور حیلہ جوئی ہے کہ شیطان نے اس ڈمرہ[1] پر چڑھا کر اپنا کام بنالیا اور اس غرہ کو اپنی کاربراری کا آلہ گردان لیا ہے حدیث[2] میں آیا ہے کہ "عقلمند وہی ہے جس نے اپنے نفس کو مطیع بنالیا اور مرنے کے بعد کام آنے والا ذخیرہ جمع کیا۔ اور احمق ہے وہ شخص جس نے خواہشات کا اتباع کیا اور پھر خدا سے عفو و کرم کا آرزومند رہا"۔

پانچواں سبب یہ ہے کہ معاذ اللہ قیامت کے ہونے اور معاملہ آخرت کے پیش آنے میں شک یا شبہ ہے۔ اس کا علاج اخلاق ذمیمہ کے خاتمہ میں بیان ہو چکا ہے وہاں دیکھو اور اس کے موافق عمل کرو۔

---

[1] گھمنڈ ۱۲ [2] احمد و ترمذی و حاکم ۱۲

فصل

صغیرہ گناہ پر اصرار کرنا کبیرہ گناہ سے زیادہ مضر ہے

یوں تو تمام گناہوں سے توبہ کرنا ضروری ہے مگر کبیرہ گناہوں سے توبہ کرنا تو نہایت ہی ضروری ہے۔ اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ صغیرہ گناہ بھی اصرار کرنے سے کبیرہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ صغیرہ گناہ جب بار بار کیا جاتا ہے تو ایک مرتبہ کسی کبیرہ گناہ کر لینے کی بہ نسبت قلب کو زیادہ سیاہ کر دیتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے "کسی سخت پتھر پر ایک ایک قطرہ کا بار بار متواتر ٹپکنا اور یکبارگی موسلا دھار بارش کا برس جانا" یہ ظاہر ہے کہ ایک قطرہ باوجودیکہ حقیر اور بہت ہی بے وقعت چیز ہے مگر بار بار پڑنے کی وجہ سے ایک نہ ایک دن پتھر میں بھی سوراخ کر دے گا برخلاف موسلا دھار مینھ کے کہ اگرچہ وہ کئی لاکھ قطروں کا مجموعہ ہے مگر یکبارگی برسنے سے اس کا وہ اثر نہ ہوگا جو ایک قطرہ نے آہستہ آہستہ کر دکھایا تھا۔ اسی طرح چھوٹا گناہ آہستہ آہستہ قلب پر جو اثر کرتا رہتا ہے وہ کبیرہ گناہ کے یکبارگی اثر کی بہ نسبت بہت ہی اندیشہ ناک ہوتا ہے، اور اس کی کئی وجہ ہیں:۔

اوّل وجہ تو یہ کہ صغیرہ گناہ کی ذہن میں وقعت نہیں ہوتی اور اس کو معمولی گناہ سمجھ کر بے پروائی کی جاتی ہے۔ برخلاف کبیرہ گناہ کے کہ اس کی بڑائی کے سبب امید ہے کہ اس سے بچنے اور باز آجانے کی طرف توجہ ہو جائے۔ اسی بنا پر ایک شیخ کا مقولہ ہے کہ جس گناہ کی بخشش نہ ہوگی وہ گناہ ہے جس کو بندہ معمولی سمجھتا اور کہتا ہے کہ کاش سارے گناہ ایسے ہی ہوتے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ صغیرہ گناہ کو بسا اوقات انسان نعمت سمجھتا اور خوش ہوتا ہے۔ چنانچہ لوگوں کو اکثر کہتے سنا ہے کہ "دیکھا میں نے اس کو کیونکر جواب دیا، کیسا بدلہ لیا، کیسی آبرو خاک میں ملادی، کیسا دھوکہ دیا" اور ظاہر ہے کہ گناہ پر خوش ہونا زیادہ مضرت رساں اور قلب کا سیاہ کرنے والا ہے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ اکثر حق تعالیٰ کی پردہ پوشی کو بہ نظرِ حقارت دیکھتا اور اپنی کرامت و بزرگی سمجھنے لگتا ہے، یعنی یہ خیال کرتا ہے کہ میں خدا کے نزدیک ذی مرتبہ شخص ہوں کہ میرے گناہ ظاہر نہیں ہوئے۔ اور یہ خبر نہیں ہے کہ خدا کی طرف سے ڈھیل دی جارہی ہے تاکہ گناہ زیادہ ہوجائیں اور یک لخت دھر پکڑا جائے۔ اور اسفل السافلین[1] میں جھونک دیا جائے۔

چوتھا سبب یہ ہے کہ صغیرہ گناہ کو صغیرہ ہونے کی بنا پر لوگوں میں ظاہر اور شائع کرتا پھرتا ہے۔ حالانکہ حدیث[2] میں آیا ہے کہ تمام گناہگار بخش دیئے جائیں گے مگر گناہوں کا اعلان و افشار کرنے والے لوگ نہ بخشے جائیں گے۔

پانچویں، اگر کسی عالم یا صوفی یعنی مقتدا سے کوئی صغیرہ گناہ ہوتا ہے تو اس کا اثر اور بھی زیادہ بُرا پڑتا ہے کیونکہ عام لوگ اس کو دیکھ کر اس گناہ میں بیباکانہ مبتلا ہو جاتے ہیں، اور اس طرح پر گناہ کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے، گویا یہ صغیرہ گناہ اتنا دراز ہو جاتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے، اس کی دیکھا دیکھی جن لوگوں نے بھی اس گناہ کو

---

[1] سب سے نچلا طبقہ ۱۲ [2] مضمون بخاری و مسلم ۱۲

اختیار کیا ہے سب کا وبال اس کے نامۂ اعمال میں درج ہوتا ہے
اور ظاہر ہے کہ باقی رہنے والا گناہ ختم ہو جانے والے گناہ سے بدتر ہے
اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس گناہ کا بقا ر صغیرہ ہونے کی وجہ سے ہی ہوا ہے
پس خوشا قسمت اس کی جو اپنے مرنے کے ساتھ اپنے گناہ بھی دنیا سے
لے جائے۔

بنی اسرائیل میں ایک عالم نے جب اپنے گناہوں سے توبہ کی تو اس زمانہ کے پیغمبر پر وحی نازل ہوئی کہ اگر اس کے گناہ میرے اور اس کے درمیان ہی رہتے تو میں بخش دیتا ، مگر اس نے تو مقتدا بنکر میرے دوسرے بندوں کو بھی گناہوں میں مبتلا کیا اور جہنم میں داخل کرایا۔

خلاصہ یہ ہے کہ توبہ کرنا ہر گناہ سے ہر فرد بشر پر ضروری ہے۔ اور توبہ اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ دل میں خدا کا خوف ہو ، لہذا مناسب ہے کہ خوف کی فضیلت بیان کر دی جائے۔

دوسری اصل

خوف کا بیان

حق تعالیٰ کا خوف جملہ نیک کاموں میں رغبت کرنے اور تمام گناہوں سے بچنے کا ذریعہ ہے۔ خوف کرنے والوں کی شان میں حق تعالیٰ نے ہدایت، رحمت، علم اور رضا کی محمود خصلتیں جمع فرمائی ہیں۔ جو شخص خدا سے ڈرتا ہے، اس سے ہر شے ڈرنے لگتی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ کسی بندہ کو دو خوف نصیب نہ ہوں گے[1] یعنی جو بندہ دنیا میں خدا کا خوف رکھے گا وہ آخرت میں بے خوف ہوگا، اور جو دنیا میں خدا سے نڈر رہا اس کو آخرت میں امن و اطمینان نصیب نہ ہوگا

خوف کی حقیقت اور حاصل کرنے کا طریقہ

خوف کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ کسی آنیوالی تکلیف کے اندیشہ سے دل دکھے اور سوزش پیدا ہو اور ظاہر ہے کہ جب تک حق تعالیٰ کی صفات جلالیہ کی معرفت حاصل نہ ہوگی، اس وقت تک خوف پیدا نہ ہوگا۔ اور جب یہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے گا کہ خداوند تعالیٰ ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز پر ایسا قادر ہے کہ دم میں جو چاہے کرے کہ مخلوق میں کوئی شخص چوں بھی نہیں کرسکتا، تو اس وقت خوف

---

[1] ابن حبان صحیح ۱۲

اور خشیت پیدا ہو جائے گا۔

پس اگر خوف پیدا کرنا چاہتے ہو تو حق تعالیٰ کے جلال اور اس کی بے نیازی پر نظر کرو اور سوچو کہ جنت پیدا اور اس میں جانے والی مخلوق بھی اس کے لئے تجویز ہو چکی ہے، اسی طرح دوزخ بھی موجود اور اس کے سزاوار مخلوق بھی معیّن ہو چکی ہے اور سعادت و شقاوت یعنی خوش قسمتی و بدنصیبی کا قطعی حکم[1] ہر شخص کی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے جس میں کچھ تغیّر و تبدل نہیں ہو سکتا، اور اس ازلی حکم کا کوئی رد کرنے والا نہیں۔ پس اے نفس معلوم نہیں کہ تیرے حق میں کیا حکم صادر ہوا ہے؟ اور تیرا خاتمہ کس حال پر ہونا لکھا ہے؟ ممکن ہے کہ تو جنت میں جائے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ تیرے لئے جہنم کی دائمی سزا تجویز ہوئی ہو۔

خوب یاد رکھو کہ انجام کے مخفی و پوشیدہ حال سے نڈر وہی شخص ہو سکتا ہے جس کو حقیقی معرفت حاصل نہ ہو، لہٰذا مناسب ہے کہ ان کاملین اور خاصانِ خدا کے حالات پڑھا اور سنا کرو جن کو معرفت میں کمال حاصل ہے، یعنی انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیاء و علماء و اہلِ بصیرت رحمہم اللہ تعالیٰ۔

دیکھو ان حضرات کو باوجود کمال درجہ تقرب کے کس قدر خوف تھا۔ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب کبھی جبریل امین میرے پاس وحی لیکر آئے تو خداوند جبار و قہار کے خوف سے لرزتے اور کانپتے ہوئے آئے۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قلب نماز کی حالت

---

[1] عراقی کہتے ہیں کہ ثابت نہیں البتہ قیامت میں ایسا ہونے کی روایت کتاب العظمۃ میں ابو شیخ کی ہے ۱۲

میں خوف کے سبب ایسا جوش مارتا تھا جیسے چولہے پر ہانڈی کھولتی ہے اور اس جوش و خروش کی آواز ایک میل کی مسافت سے سنائی دیا کرتی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام چالیس دن کامل سربسجود گریہ کرتے رہے یہاں تک کہ آنسوؤں سے آس پاس کی زمین پر گھاس پیدا ہو گئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے ایک پرند کو مخاطب بنا کر یوں فرمایا کہ "اے کاش میں بھی تجھ جیسا پرند ہی ہوتا کہ شریعت و احکام خداوندی کا مکلف نہ ہوتا یا کاش پیدا ہی نہ ہوا ہوتا"۔ حضرت ابوذر رضؓ فرماتے ہیں کہ "کاش میں درخت ہوتا کہ کاٹ لیا جاتا"۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ "کاش میں تو بھولی بسری ہو جاتی"۔

غرض خوب یاد رکھو کہ جن حضرات کو حق تعالیٰ کی بے نیازی اور جلال کی معرفت حاصل ہو وہ ہرگز بھی بے خوف اور نڈر نہیں رہ سکتے۔ نڈر ہونا انھیں غفلت شعار امراء کا شیوہ ہے جن کی نہ اپنے خاتمہ پر نظر ہے اور نہ اصلاح آخرت کی جانب توجہ۔ یہ غفلت کے پتلے اس بے وقوف بچے کی مثل ہیں جس کو زہریلے سانپ سے بھی ڈر نہیں لگتا، مگر بچہ دوسرے کے سمجھانے سے سمجھ تو جاتا ہے۔ پس اے کاش جس طرح ناسمجھ بچہ اپنے سمجھدار باپ کو سانپ سے ڈرتا اور بھاگتا ہوا دیکھ کر خود بھی بھاگتا اور عقل سیکھتا ہے، اسی طرح غافل و بیخبر مسلمان بھی اپنے محسن و مربی روحانی طبیبوں اور خاصان خدا کی حالت خوف کے مشاہدہ سے عبرت پکڑیں۔

فصل

خوف کی زیادتی مذموم و مضر ہے

خوف درحقیقت ایک چابک ہے جو انسان کو سعادت

ابدی کی جانب دوڑاتا ہے۔ لہٰذا اسی حد تک پسندیدہ ہے جب تک نیکوکاری کا آلہ بنے۔ یعنی اتنا زیادہ نہ ہو کہ بیکار بنا دے اور مایوسی کی حد تک پہنچا کر اعمال چھڑا دے۔ ایسا حد سے بڑھا ہوا خوف جس سے ناامیدی پیدا ہو جائے شرعاً مذموم ہے۔ کیونکہ حدیث[1] میں آتا ہے کہ "ایمان خوف اور امید کے بین بین[2] ہے"۔ پس خوف کے ساتھ رجا یعنی امید بھی ضروری ہے۔ البتہ گنہگار مسلمان کو خوف غالب رکھنا چاہیئے اور جب دیندار بن جائے تو دونوں کو مساوی درجہ پر رکھے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ "اگر اللہ پاک کا حکم صادر ہو کہ ساری مخلوق میں سے صرف ایک شخص جنت میں جائے گا تو میں امید کرتا ہوں کہ وہ شخص میں ہی ہوں گا۔ اور اگر یہ فرمان صادر ہو کہ دوزخ میں صرف ایک ہی شخص داخل ہوگا تو مجھے خوف ہے کہ وہ شخص کہیں میں ہی نہ ہوں"۔ یہ حالتِ مساوات ہے جس میں خوف و رجا دونوں کے پلّے برابر ہیں۔

جوانی میں خوف اور بڑھاپے میں رجا کا غلبہ مفید ہے

یاد رکھنا چاہیئے کہ جوانی و تندرستی کے زمانہ میں مسلمان کو خوف غالب رکھنا چاہیئے کیونکہ اس غلبۂ شہوت کے زمانہ میں شہواتِ نفسانیہ کے توڑنے اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے مہذب بنانے کو خوف کے کوڑے کی ضرورت ہے۔ اور بڑھاپے یا مرض میں جب کہ موت قریب ہو تو رجا یعنی امید غالب رکھنی چاہیئے۔ کیونکہ

---

[1] یہ اصل عربی کتاب میں نہیں ہے ۱۲

[2] درمیان ۱۲

[3] بڑا ہو گیا ہوا ۱۲

اوّل تو ضعف و نقاہت اور مرض کی وجہ سے کچھ ہوتا ہوتا نہیں اور اگر اس حالت میں خوف غالب ہوا تو جو کچھ ہو رہا ہے اتنا بھی نہ ہو سکے گا بالکل ہی ہاتھ پاؤں بھول جائیں گے۔ حدیثؒ میں آیا ہے کہ مسلمان کو مرتے وقت اپنے خدا کیساتھ نیک گمان رکھنا چاہیئے ؛

رجا اور ہوس کا فرق

ظاہر ہے کہ نیک گمان اسی وقت ہوگا جبکہ کچھ نیک اعمال بھی پاس ہوں۔ کیونکہ انسان جب کاشت کے لئے زمین میں بیج ڈالتا ہے اور نیولانے یا پانی دینے کے متعلق اپنی جیسی سعی سب کچھ کرلیتا ہے تو اسی وقت خدا کے فضل پر بھروسہ کر کے پیداواری اور بوئے ہوئے کے کاٹنے کی امید رکھ سکتا ہے۔ اور جب بیج ہی نہیں ڈالا اور ایسی حالت میں اناج کی طلب و خواہش رکھی تو اس کو رجاء و امید نہیں کہتے، بلکہ تمنا اور ہوس کہتے ہیں، اور تمنا و ہوس شیطانی دھوکہ ہے۔ اسی لئے حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "جو بندے ایمان لائے اور ہجرت کر گئے اور فی سبیل اللہ جہاد کیا وہی اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں ؛ اس سے معلوم ہو گیا کہ رجاء و امید سعی و کوشش کے بعد ہوا کرتی ہے۔ جس طرح کاشتکار بونے جوتنے کی پوری محنت کر لینے کے بعد منتظر ہوتا ہے کہ اگر آسمانی آفت سے حفاظت ہو گئی اور بجلی اور آگ وغیرہ سے کھیت کو حق تعالیٰ نے بچائے رکھا تو امید ہے کہ جتنا بیج ڈالا ہے ایک ایک کے بدلے ستر ستر بلکہ اس سے بھی زیادہ حاصل ہوں گے۔ اسی طرح مسلمان کو خدا کی طاعت میں پوری مشقت اٹھاتے

لہ مسلم ۱۲

اور مجاہدہ و ریاضت کرنے کے بعد امید رکھنی چاہیئے کہ اگر حق تعالٰے نے اپنے فضل سے میرے اعمال و افعال کو قبول فرمالیا تو ایک ایک نیکی کا سات سات سوگنا بلکہ اس سے بھی زیادہ اجر ملے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ خوفِ عذاب کے باعث معاصی اور خدا کی نافرمانیوں سے رُکنا چاہیئے اور امید رحمت کے سبب نیکیوں میں رغبت پیدا ہونی چاہیئے۔ پس خوف کو اسی وقت معتبر سمجھو جبکہ وہ تم کو معصیت سے روکے اور گناہ کی جرأت نہ ہونے دے۔ اور اگر یہ حاصل نہ ہو تو وہ خوف نہیں ہے۔ بلکہ عورتوں جیسی رقّت قلبی اور وہم و خیال ہے جس کا کچھ اعتبار نہیں۔

اور چونکہ خوف جب کمال پر پہنچتا ہے تو دنیا سے بے رغبتی پیدا ہو جاتی ہے جس کا نام زہد ہے اس لئے مناسب ہے کہ کچھ زُہد کا بیان کر دیا جائے۔

تیسری اصل

زہد کا بیان

زہد علم کا ثمرہ اور شرح صدر کی علامت ہے

حق تعالیٰ فرماتا ہے " اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس مال و جاہ کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھو جو ہم نے کافروں کو دنیا کی تازگی کی جنس سے دے رکھا ہے کیونکہ اس سے مقصود اُن کو فتنہ میں ڈالے رکھنا ہے۔ اور تمہارے پروردگار ہی کی عطا بہتر اور زیادہ پائدار ہے "

اور قارون ملعون کے قصہ میں ارشاد ہے کہ " قارون بن سلور کرّ ٹھاٹھ کے ساتھ جلوس میں نکلا اور بعض لوگوں کو یہ تزک و احتشام دیکھ کر حرص ہوئی تو جن لوگوں کو علم مرحمت ہوا تھا وہ کہنے لگے کہ افسوس تم اس ناپائدار چیز کی حرص کرتے ہو، دیکھو حق تعالیٰ کا ثواب سب سے بہتر چیز ہے "

اس قصہ سے معلوم ہوا زہد علم کا ثمرہ ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ " جو شخص صبح اٹھتے ہی دنیا کے غم میں گرفتار ہو جاتا ہے حق تعالیٰ اس کا دل پریشان کر دیتا ہے، اور ملتا اسی قدر ہے جتنا کہ اس کی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔ اور جو شخص صبح اٹھتے ہی آخرت کی فکر میں لگ

ے ترمذی ضعیف ، وابن ماجہ بسند جید ۱۲

جاتا ہے تو حق تعالیٰ اس کا قلب مطمئن رکھتا اور اس کی دنیا کی خود حفاظت وکفالت فرماتا ہے اس نیک بندے کا دل غنی کر دیتا ہے اور اتنی دنیا مرحمت فرماتا ہے کہ یہ منہ پھیرتا ہے اور دنیا اس کے پیچھے پیچھے بھاگی چلی آتی ہے۔[1]

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اللہ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا شرح صدر[2] کر دیتا ہے" اس کی تفسیر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمائی ہے کہ "اس کے قلب میں ایک نور داخل فرما دیتا ہے، جس سے اس کا سینہ منشرح ہو جاتا ہے" صحابہؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! اس کی شناخت کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ "دنیا سے بے رغبتی اور دین کی جانب توجہ اور موت سے پہلے موت کا انتظام کرنا شرح صدر کی خاص پہچان ہے"[3]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "جس کو حق تعالیٰ زاہد بناتا ہے اس کے قلب میں حکمت القا فرماتا ہے اور دنیا کی بیماری وعلاج سے آگاہ کر دیتا ہے اور اس جہان فانی سے بے لوث[4] باہر نکال کر دار السلام میں پہنچا دیتا ہے" اس کے بعد صحابہ سے فرمایا کہ "صاحبو! حق تعالیٰ سے حیا کرو" صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! حیا تو کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ "جہاں رہنا نہیں ہے وہاں مکانات بناتے ہو اور جو کھا نہیں سکتے وہ جمع کرتے ہو۔ یاد رکھو کہ بندہ کا ایمان اس وقت کامل ہوتا ہے جبکہ گوشۂ گمنامی میں پڑے رہنے کو شہرت سے زیادہ پسند کرے اور دنیا

---

[1] ابن مبارک و ابن ابی شیبہ و فریابی وغیرہم ۱۲ [2] کشادہ ۱۲

[3] ابن ابی الدنیا مضمون بہت حدیثوں میں ہے ۱۲ [4] بے لاگ و بے آلودگی ۱۲

کے متعلق ہر شے کی قلت کو اس کی کثرت سے زیادہ محبوب سمجھے، خوب سمجھ لو کہ جب انسان دنیا میں زاہد بنتا ہے تو حق تعالیٰ اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہے اور جب وہ خدا کا محبوب بن جاتا ہے تو مخلوق کی نظروں میں بھی محبوب ہو جاتا ہے۔

زہد کی حقیقت اور ثمرہ واثر

حقیقی زہد یہ ہے کہ انسان دنیا کے مال ومتاع کی جانب التفات نہ کرے اور باوجود اس کے حاصل کرنے کی قدرت کے پھر اس کی جانب متوجہ نہ ہو۔

اور زہد کی اصل وہ نور اور علم ہے جو اللہ کی طرف سے بندہ کے قلب میں ڈال دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے سینہ کھل جاتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کے جملہ ساز وسامان مکھی کے پر سے بھی زیادہ حقیر اور آخرت ہی بہتر و پائدار ہے۔ جس وقت یہ نور حاصل ہوتا ہے تو اس حقیر دنیا کی آخرت کے مقابلہ میں اتنی بھی وقعت نہیں رہتی جتنی کسی بیش قیمت جواہر کے مقابلہ میں ایک پھٹے پرانے چیتھڑے کی وقعت ہوا کرتی ہے۔

اور زہد کا ثمرہ یہ ہے کہ بقدر ضرورت وکفایت دنیا پر قناعت حاصل ہو جائے۔ پس زاہد اسی مقدار پر کفایت کیا کرتا ہے جتنا کسی مسافر کو سفر کا توشہ اپنے پاس رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

اور وہ ضروری سامان جس کی ہر شخص کو احتیاج ہے یا طعام ہے یا لباس یا اثاث البیت۔ اور ہر ایک میں زہد کے مراتب اور مدارج ہیں جن کی تفصیل ہم بیان کرتے ہیں۔

طعام میں مدت کے اعتبار سے زہد کے مراتب

طعام کی ضرورت رفع کرنے میں زہد تین اعتبار سے ہوتا ہے

یعنی مدت اور مقدار اور جنس ۔

پس مدت کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کا زہد تو یہ ہے کہ صرف ایک وقت کے کھانے پر قناعت کرے یعنی اگر صبح کو بھوک رفع ہو جائے تو شام کیلئے کچھ پاس نہ ہو اور شام کو پیٹ بھر جائے تو صبح کے لئے کچھ ذخیرہ نہ ہو۔

اوسط درجہ یہ ہے کہ مہینہ بھر یا چالیس دن کی خوراک مہیا ہو اس سے زیادہ کی پرواہ نہ ہو۔

ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ صرف سال بھر کا ذخیرہ جمع کر لیا جائے اور سال سے زیادہ کا سامان جمع کرنا تو زہد سے بالکل خارج ہے۔

البتہ اگر کسی قسم کا ذریعۂ کسب اور تحصیل معاش کے لئے دنیا کا کوئی مشغلہ نہ ہو تو سال سے زیادہ کا ذخیرہ جمع کر لینا بھی زہد کے منافی نہیں ہے چنانچہ شیخ داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بیس درہم تھے جن پر شیخ نے کامل بیس سال قناعت کی تھی، چونکہ ان کا کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا اس لئے بیس سال کا ذخیرہ رکھنا زہد کے خلاف نہ ہوا۔

مقدار کے اعتبار سے مراتبِ زہد

طعام میں مقدار کے اعتبار سے ادنیٰ درجہ کی مقدار جس کو زہد کا اعلیٰ درجہ کہنا چاہیئے نصف رطل یعنی پاؤ سیر اناج ہے۔ اور اوسط درجہ کی مقدار آدھ سیر۔ اور اعلیٰ مقدار جو زہد کا ادنیٰ درجہ ہے سیر بھر غلہ ہے۔ پس جس نے اس سے زیادہ مقدار کھائی تو سمجھو کہ زہد کے خلاف کیا۔

جنس کے اعتبار سے مراتبِ زہد

جنس کی حیثیت سے اعلیٰ درجہ کا زہد اس جنس کے کھانے پر قناعت کرنا ہے جس میں غذائیت پائی جائے اگرچہ اناج کی بھوسی ہی کیوں نہ ہو۔

اور اوسط درجہ جَو کی روٹی ہے۔ اور ادنیٰ درجہ گیہوں کے بے چھنے آٹے کی روٹی کھانا ہے۔ اور اگر آٹا چھان لیا تو اس کا نام زہد نہیں بلکہ تنعم اور تلذذ ہے۔

اور ترکاری میں اوّل درجہ کی ترکاری جو زہد کا اعلیٰ درجہ ہے سرکہ اور سبزی اور نمک کا استعمال ہے۔ اور اوسط درجہ چکنائی کا استعمال کرنا ہے۔ اور اعلیٰ درجہ کی ترکاری جو زہد کا سب سے نیچے کا درجہ ہے گوشت کھانا ہے، بشرطیکہ ہفتہ میں صرف ایک یا دو بار ہو۔ اگر ہمیشہ گوشت کھانے کی عادت ہوگئی تو زہد سے بالکل باہر ہوگیا۔

دیکھو حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "چالیس چالیس دن گذر جاتے تھے اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت کدہ میں آگ بھی نہیں سلگتی تھی"[1] معتبر ذریعے سے ثابت ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سے مدینہ منورہ میں قدم رنجہ فرمایا کبھی تین دن بھی گیہوں کی روٹی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔[2] اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی حَبِیْبِكَ وَصَفِیِّكَ بِقَدْرِ زُهْدِهٖ وَكَمَالِهٖ۔[3]

لباس کے متعلق زہد کے درجے

لباس میں اعلیٰ درجہ کا زہد یہ ہے کہ صرف اتنے کپڑے پر قناعت کرے جس سے ستر چھپ جائے۔ اور سردی گرمی رفع ہوسکے۔

اور ادنیٰ درجہ کا زہد یعنی اعلیٰ درجہ کا لباس یہ ہے کہ کسی کھردرے کپڑے کا کرتہ پاجامہ اور ایک رومال رکھے۔ پس اگر دو کرتے بھی پاس ہوں گے

---

[1] ابن ماجہ ۱۲ [2] مضمون تقریباً بخاری ومسلم ۱۲

[3] الٰہی اپنے حبیب اور مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے زہد اور کمال کی بقدر رحمت نازل فرما۔

تو زہد ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ زہد میں کم سے کم یہ تو ضرور ہونا چاہیئے کہ اگر پہنے ہوئے کپڑوں کو دھونے کی ضرورت پیش آئے تو دوسرا جوڑا پاس نہ نکلے بلکہ رومال باندھ کر دھولے اور پھر ان کو پہن لے۔

حضرت ابو ہریرہؓ[1] فرماتے ہیں کہ " بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے صوف کی ایک چادر اور ایک موٹا کرتہ نکال کر مجھ کو دکھایا اور فرمایا کہ ان دو کپڑوں میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا ہے۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نعلین کا ایک نیا جوڑا پہنا اور پسند آیا تو فوراً سجدے میں گر پڑے اور فرمایا کہ مجھے یہ نعلین اچھی معلوم ہوئیں اور اندیشہ ہوا کہ حق تعالیٰ غصہ نہ ہو جائے اس لئے میں تواضعاً سربسجود ہو گیا یہ فرما کر آپ باہر تشریف لائے اور جو مسکین سب سے پہلے نظر پڑا اس کو مرحمت فرما دیا۔"

حضرت عمر فاروقؓ کے قمیص میں بارہ پیوند گنے گئے تھے جن میں بعض چمڑے کے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ " مقتدا پر ضروری ہے کہ ادنیٰ حیثیت کے لوگوں کا سا لباس پہنے تاکہ امراء اور اہل مال اس کا اقتدا کریں اور فقراء و نادار اپنے کو بنظر حقارت نہ دیکھیں۔

مکان کے متعلق زہد کے درجے

مسکن میں ادنی درجہ کا مسکن جو زہد کا اعلیٰ درجہ ہے یہ ہے کہ مسافر خانہ یا مسجد کے کسی حجرے میں زندگی گذار دے۔ اور اعلیٰ درجہ کا

---

[1] بخاری و مسلم میں صحابی کا نام ابو بردہؓ اصل میں بھی ہے احیاء العلوم میں بھی ہے۔ (اور حدیثوں میں بھی ہے) مترجم نے سہواً ابو ہریرہ لکھ دیا ہے ۱۲

مسکن یہ ہے کہ سکونت کے لئے کوئی خاص جگہ تجویز کرلے یعنی بقدر ضرورت ایک حجرہ خواہ خرید لے یا کرایہ پر لے بشرطیکہ حاجت سے زیادہ اس میں وسعت نہ ہو اور نہ اس کی اونچی اونچی دیواریں ہوں نہ قلعی چونا کہگل۔ کیونکہ کہگل یا استرکاری کے مکانات میں رہائش تو زہد سے خارج ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم مکان میں چونا کی استرکاری کر رہے تھے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا کہ "میاں وقت تو اس سے پہلے برابر ہو جانے والا ہے" مطلب یہ تھا کہ انسان کو ناپائدار زندگی گذارنے کے لئے اس استحکام و پائداری کی کیا ضرورت ہے؟ موت آجائے گی اور یہ یہیں دھرارہ جائے گا۔

حضرت نوح علیہ السلام نے رہائش کے لئے پھونس کا ایک جھونپڑا بنا رکھا تھا اسی میں ایام گذاری فرماتے تھے۔ لوگوں نے عرض کیا یا نبی اللہ ایک گھر بنا لیجئے تاکہ آرام ملے۔ آپ نے فرمایا کہ "میاں مرنیوالے کیلئے تو یہ پھونس کا گھر بھی بہت ہے"

حدیث میں آیا ہے کہ ضرورت سے زیادہ جو شخص مکان بنائے گا قیامت کے دن اس کو تکلیف دی جائے گی کہ اس مکان کو سر پر اٹھائے۔

پس اب تم خوب سمجھ لو کہ ضرورت کس چیز کا نام ہے اور کس مقدار و حیثیت کے مکان سے رفع ہو سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ جس حد تک گرمی و سردی رفع ہو وہ تو ضرورت میں داخل ہے اور اس سے زیادہ سجاوٹ یا وسعت تو عبث و بیکار اور آخرت کے لئے مخدوش و خطرناک ہی ہے۔

لہ ابوداؤد و ترمذی و ابن ماجہ۔ صحیح ۲

اثاث البیت کے متعلق زہد کے درجے

اثاث البیت میں کئی درجے ہیں۔ ادنیٰ درجہ کا سامان، جس کو زہد کا اعلیٰ درجہ کہنا چاہیئے، وہ ہے جو حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ وعلیٰ نبینا السلام کا حال تھا کہ ایک کنگھا اور ایک آبخورہ پاس تھا یہی اثاث البیت تھا اور یہی سفر و حضر کا سامان۔ ایک بار چلے جا رہے تھے کہ ایک شخص نظر پڑا جو انگلیوں سے کنگھے کا کام لے رہا تھا اور بال درست کر رہا تھا حضرت روح اللہ نے کنگھا پھینک دیا اور فرمایا کہ یہ تو ضرورت سے زائد چیز نکلی۔ اب آبخورہ رہ گیا اس کو لیکر آگے چلے تو ایک شخص کو دیکھا کہ ہاتھ کے چلّو سے پانی پی رہا ہے۔ پس آبخورہ بھی پھینک دیا اور فرمایا کہ خدا کے عطا کئے ہوئے بدن ہی کے عضو سے جو کام نکل آئے اس کے لئے دوسرا انتظام کرنا امر فضول ہے۔

اوسط درجہ یہ ہے کہ معمولی اور خسیس برتن رکھے اور وہ بھی ہر قسم کی ضرورت کے لئے ایک عدد سے زیادہ نہ ہو اور اس میں بھی یہ لحاظ رہے کہ جہاں تک ہو سکے کئی کئی ضرورتیں ایک ہی برتن میں رفع ہو جاویں چنانچہ حضرت عمر فاروق نے شہر حمص کے حاکم حضرت عمیر بن سعد سے دریافت کیا کہ کیوں صاحب تمہارے گھر میں دنیا کی ضرورتوں کے لئے کیا کیا اسباب ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت ایک تو لاٹھی ہے کہ اس سے تکیہ کا کام لیکر سہارا لگا لیتا ہوں اور اسی سے موذی جانور سانپ بچھو وغیرہ کو مار دیتا ہوں، اور ایک تھیلا ہے جس میں کھانا رکھ لیتا ہوں اور اسی میں بشرط ضرورت سر اور کپڑا وغیرہ دھو لیتا ہوں اور ایک برتن ہے جس میں اتنا پانی آجاتا ہے جو پینے اور وضو کرنے کے لئے کافی ہو جاتا ہے بس یہ چار

لہ گھر کا سامان ۱۲   لہ کم حیثیت ۱۲   لہ سہارا ۱۲

عدد میرے پاس موجود ہیں اور ساری ضرورتیں الٹ پھیر کر اسی میں پوری ہوجاتی ہیں۔ حضرت فاروقؓ یہ فرما کر کہ "سچ کہتے ہو" خاموش ہو رہے۔

تم نے سنا ہوگا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر مبارک جس پر استراحت فرماتے تھے ایک تو چرمی تکیہ تھا جس میں لیف گھاس بھری ہوئی تھی اور ایک کمبل تھا[1]

غرض زاہدوں کے یہ حالات ہیں جو نمونہ کے طور پر بیان کر دیے گئے۔

تنعم پر افسوس کرو اور زاہدوں کی صحبت رکھو

اگر اس مرتبۂ کمال کے حاصل کرنے سے خدانخواستہ محروم رہو تو کیا اس سے بھی گئے گذرے ہو کہ اس محرومیت پر افسوس ہی کرو تاکہ زہد کی قلب میں محبت اور اس کے حصول کی خواہش تو باقی رہے۔ نیز اس کا ہمیشہ خیال رکھو کہ لذت پسند اور متنعم[2] امراء کے قرب کی بہ نسبت اللہ کے زاہد بندوں کے پاس اٹھنا بیٹھنا پسند کرو اور جہاں تک بھی ہو سکے زاہدوں کے مثل بننے اور بلند درجہ کے حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہو۔

فصل

زہد کے درجے

زہد کے کئی درجے ہیں:

ایک تو یہ کہ نفس اگرچہ دنیا کی طرف مائل ہو مگر اس کو جبراً بے التفات بنایا جائے اور دنیا حاصل کرنے سے زبردستی روکا جائے۔ اس حالت کو زہد کہنا تو ٹھیک نہیں معلوم ہوتا البتہ اگر تزہد[3] کہا جائے اور زہد کی ابتداء سمجھا جائے تو مناسب ہے۔

---

[1] ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ و احمد ۱۲ [2] ذی ثروت، مالدار ۱۲ [3] اظہار زہد ۱۲

دوسرا درجہ یہ ہے کہ نفس دنیا سے اتنا متنفر ہو کہ اس کی طرف مائل ہی نہ ہو اور سمجھ جائے کہ دنیا اور آخرت کی نعمتوں کا یکجا ہونا چونکہ ناممکن ہے اس لئے آخرت کی لذتوں کے حاصل کرنے میں دنیا کے مال و متاع پر اس طرح خاک ڈال دینی چاہئے جس طرح کسی بیش بہا جوہر کے خریدنے میں چند روپے کو خرچ کرنے میں دریغ نہیں ہوتا بلکہ روپیہ دے کر نہایت خوشی سے جوہر لیا جاتا ہے۔ ایسے ہی دنیا کا ساز و سامان چھوڑ کر بڑی مسرت کے ساتھ آخرت کی نعمتیں حاصل کر لی جائیں۔

دنیا کی رغبت و نفرت دونوں کا نہ رہنا کمال زہد ہے!

تیسرا درجہ یہ ہے کہ دنیا کے مال و متاع کا عدم اور وجود برابر ہو جائے اور یہ خیال ہے کہ جو کچھ بھی دنیا میں ہے وہ حق تعالیٰ کے بیشمار خزانوں کے بحر زخار[1] اور دریائے ناپید اکنار[2] کا ایک قطرہ ہے پس اگر مل جائے تو کچھ مسرت نہیں اور اگر نہ ملے یا آیا ہوا ہاتھ سے چلا جائے تو کچھ حسرت نہیں۔ اس درجہ میں نفس نہ تو دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور نہ اس سے متنفر ہوتا ہے اور یہی زہد کے کمال کا درجہ ہے۔ کیونکہ تنفر بھی ایک قسم کی توجہ ہے اور اس شے کے باوقعت ہونے کی علامت ہے۔ اس لئے کہ جس شے کی وقعت ذہن سے نکل جایا کرتی ہے اس کی دونوں جانبیں یعنی تنفر اور توجہ برابر ہو جایا کرتی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت رابعہ عدویہ کی مجلس میں لوگوں نے دنیا کی مذمت بیان شروع کی تو آپ نے فرمایا کہ "دنیا کی قدر و منزلت تمہارے دلوں میں ہے جب ہی

---

[1] پانی کے بڑے ذخیرہ والا دریا ۱۲ [2] جس کا کنارہ ظاہر نہ ہو ۱۲

تو تم اس کی مذمت کر رہے ہو بھلا ایک ذلیل اور بے قدر شے کی بھی کوئی مذمت کیا کرتا ہے۔

خوب یاد رکھو کہ جب دنیا کی وقعت قلب سے جاتی رہتی ہے تو رغبت اور نفرت دونوں سے انسان خالی الذہن ہو جاتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس ایک لاکھ درہم آئے اور آپ نے ان سے نفرت نہیں کی بلکہ ان کو لے لیا اور اسی دن مساکین پر تقسیم فرما کر خرچ کر دیا۔ آپ کی خادمہ نے عرض بھی کیا کہ اے ام المؤمنین ایک درہم کا گوشت تو خرید لیتے جس سے آپ آج روزہ افطار فرمالیتیں تو آپ نے جواب دیا کہ اگر پہلے یاد دلاتیں تو یہی کر لیتے اب تو کچھ باقی نہیں رہا۔ یہ درجہ غنا کہلاتا ہے۔ پس ناعاقبت اندیش جاہل صوفی دھوکہ کھاتے اور اپنے مال کی بڑھوتری و حرص کو غنا کا درجہ سمجھ جاتے ہیں یعنی یوں خیال کرتے ہیں کہ چونکہ ہمارے قلب کو دنیا سے علاقہ نہیں رہا اس لئے ہمیں یہ مال و متاع کی کثرت مضر نہیں ہے، حالانکہ ان کا یہ خیال شیطانی دھوکہ ہے کہ امتحان کرنے سے اس کی کھوٹ معلوم ہو جائے گی۔ مثلاً اگر سارا مال یک لخت چوری ہو جائے تو دیکھو ان کا کیا حال ہوتا ہے؟ اگر اپنا مال چوری جانے کا اسی قدر اثر ہو جتنا کسی اجنبی کا مال چوری چلے جانے سے ہوتا ہے تب تو سمجھو کہ بیشک ان کے قلب کو مال سے محبت نہیں ہے، اور ان کے نزدیک مال کا رہنا اور چلا جانا دونوں برابر ہیں۔

زہد سے بھی زہد ہونا اعلیٰ درجہ ہے

غرض زہد کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ زہد سے بھی زہد حاصل ہو جائے[1]

---

[1] اتنی بے رغبتی کہ اس کا بھی خیال نہ آئے کہ دنیا سے بے رغبتی اور زہد کیا ہے ۱۲

یعنی دنیا کی جانب سے بے التفاتی کو بھی وقعت کی نظر سے نہ دیکھے بلکہ یوں سمجھے کہ دنیا کوئی چیز بھی ہو جس کا چھوڑنا ہمت و بہادری سمجھا جائے ۔ یا مسرت کی نظر سے دیکھا جائے ۔ اس کی تو اہل بصیرت کے نزدیک اتنی بھی قدر نہیں ہے جتنی کسی بڑے بادشاہ کے نزدیک ایک پیسہ کی قدر ہوا کرتی ہے ، اس بے حیثیت دنیا کو چھوڑ کر یہ سمجھنا کہ "ہم نے کچھ چھوڑ دیا" حقیقت میں اس کے درجہ کا اس کی حیثیت سے بڑھانا ہے ۔

اس کی مثال تو ایسی سمجھو جیسے کوئی شخص شاہی دربار میں داخل ہونا چاہے اور اس کو دروازہ پر بیٹھا ہوا کتا داخلہ سے روک رہا ہو پس یہ اس کے سامنے ایک روٹی کا ٹکڑا ڈال دے تاکہ کتا اس کے کھانے میں لگ جائے اور یہ اپنے مطلوب کے دربار میں جا داخل ہو ، اسی طرح شیطان حق تعالیٰ کے دروازہ کا کتا ہے جو سالک کو مطلوب تک پہنچنے سے روک رہا ہے اور ساری دنیا روٹی کے ایک ٹکڑے سے بھی زیادہ بے وقعت ہے جس کو اس کے سامنے ڈال کر سالک نے اپنے مطلوب تک پہنچنے کا راستہ صاف کر لیا ہے ۔ پس تم ہی سوچو کہ شاہی دربار کی حاضری کا اعزاز حاصل کرنے کے لئے جو کتے کو روٹی کا ٹکڑا ڈالا گیا ہے نہ اس کی ذہن میں وقعت ہوگی اور اس کو قابلِ ذکر و خیال امر سمجھا جائے گا بلکہ روٹی کے ٹکڑے اور دنیوی بادشاہ میں تو کچھ مناسبت بھی معلوم ہوتی ہے کہ دونوں ایک دن فنا ہونے والے ہیں ، پس فانی شے کے حصول کے لئے ایک فانی شے کا ہاتھ سے کھو دینا جب وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تو دنیا اور آخرت میں تو کوئی مناسبت ہی نہیں ہے ، اس لئے کہ اگر دنیا لاکھوں بھی ہوں گی تو وہ بھی ایک دن فنا ہو جائیں گی ۔ پس آخرت کی جاوید نعمتوں اور اس

پائدار ملک کی دائمی سلطنت حاصل کرنے کے لئے اگر دنیا کو ہاتھ سے چھوڑا جائے اور شیطان کے حوالہ کر دیا جائے تو اس کا خیال اور ذکر ہی کرنا فضول ہے۔

زہد کے اسباب

زہد کے اسباب متعدد ہیں۔ کیونکہ کبھی تو دوزخ کا خوف اور عذاب کا اندیشہ زہد کا سبب بن جاتا ہے اور اس زہد کو خائفین کا زہد کہتے ہیں اور یہ سالکینِ طریقت کے نزدیک ادنیٰ درجہ ہے۔ اور کبھی اُخروی نعمتوں اور لذتوں کی رغبت زہد کا باعث ہو جاتی ہے اور اس کو راجین کا زہد کہتے ہیں۔ اور یہ درجہ پہلے درجہ سے بڑھا ہوا ہے، کیونکہ رجا یعنی امید محبّت کو مقتضی ہے اور محبّت کی فضیلت تم کو معلوم ہو چکی ہے۔

جملہ ماسوی اللہ سے زہد ہونا اعلیٰ زہد ہے !!!

تیسرا درجہ جو سب میں اعلیٰ ہے وہ یہ ہے کہ ماسوی اللہ کی جانب سے بے توجہی اور نفس کا غیر اللہ کو حقیر سمجھ کر چھوڑ کر دینا زہد کا باعث ہو، اس کو حقیقی زہد کہتے ہیں۔ کیونکہ پہلے دونوں درجوں کے زہد تو ایسے ہیں کہ جیسے کسی نافع سودے کی خرید و فروخت ہوتی ہے کہ ایک حقیر چیز کو اس لئے چھوڑ دیا تاکہ تکلیف دینے والی روح فرسا[1] مصیبت اس کی وجہ سے دفع ہو جائے یا کئی گنی بہتر اور نافع چیز ہاتھ آجائے اور اس درجہ میں ماسوی اللہ کی جانب التفات کرنے ہی کو فضول سمجھا گیا ہے، کیونکہ وہ کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ بس اس درجہ میں حق تعالیٰ کے سوائے جو چیز بھی

---

[1] روح کو گھِس دینے اور فنا کر دینے والی ۱۲

خواہ مال ہو یا جاہ یا اور کوئی ایسی شئے جس سے عموماً لذت حاصل ہوا کرتی ہو سب ہی سے زہد حاصل ہو جاتا ہے۔ برخلاف پہلے درجوں کے کہ ان میں صرف مال سے زہد حاصل ہوتا ہے جاہ سے نہیں ہوتا ہے۔ اور مال میں بھی بعض انواع سے زہد ہوتا ہے اور بعض سے نہیں ہوتا۔ اور یہی وجہ اُن درجوں کے ضعیف ہونے کی ہے۔ کیونکہ انسان کو جاہ کی محبت مال کی بہ نسبت زیادہ ہوا کرتی ہے اور جس کی محبت زیادہ ہو اسی سے زہد حاصل ہونا قابل اہتمام و توجہ بھی ہے۔

فصل

زہد اور فقر میں فرق

زہد کے معنی یہ ہیں کہ باوجود دنیا حاصل کر سکنے کے دنیا سے ایسا بے التفات ہو جائے کہ دنیا اس کے پیچھے بھاگے اور یہ اس سے دامن چھڑائے۔ اور اگر معاملہ برعکس ہو کہ یہ دنیا کو حاصل کرنا چاہے مگر دنیا اس کے ہاتھ نہ آئے تو اس کو زہد نہیں کہتے بلکہ اس کا نام فقر ہے اور فقر کا درجہ زہد کے برابر نہیں ہے۔ ہاں فقر کو تونگری پر فضیلت ضرور ہے کیونکہ تونگری میں دنیا کی لذتوں سے دل بستگی ہو جاتی ہے اور اس لئے مرتے وقت ان مرغوبات کے چھوڑنے کی حسرت ہوا کرتی ہے اور دنیا گویا جنت معلوم ہوتی ہے اور آخرت قید خانہ۔ برخلاف فقر کے کہ اس حالت میں لذتوں سے اگرچہ جبراً قہراً باز رکھا گیا ہو تاہم چونکہ کبھی کسی چیز کا ذائقہ اور مزہ منہ کو نہیں لگتا اس لئے مرتے وقت کسی چیز کی محبت میں دل نہ اٹکے گا بلکہ دنیا کو دار الالم[1] اور تنگدستی کا گھر سمجھے گا اور آخرت کی

---

[1] تکلیف کا گھر۔

آزادی و خوش عیشی کا گھر اور جنت معلوم ہوگی۔

فقر کی فضیلت

اس میں شک نہیں کہ فقر بھی اللہ کی بڑی نعمت اور سعادت اخروی کا ایک مضبوط ذریعہ ہے۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "حق تعالیٰ اپنے نیک بندے کو دنیا سے ایسا بچاتا ہے جیسے تم اپنے عزیز بیمار کو کھانے پینے کا پرہیز کراتے ہو میری امت کے فقرا جنت میں امراء سے پانچسو برس پہلے داخل ہو جائیں گے۔ جس وقت کسی فقیر کو دیکھا کرو خوش ہو جایا کرو اور کہا کرو کہ مرحبا صالحین کے طریقہ والے مرحبا"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک بار عرض کیا تھا کہ بارالہا آپ کو کون بندے محبوب ہیں۔ بتلائیے تاکہ میں اُن سے محبت کروں۔ ارشاد ہوا کہ "فقیر جن کو لوگ پاس بھی نہ کھڑا ہونے دیں"

یاد رکھو کہ اگر فقیر اپنے حال پر قانع ہو اور طلب مال کا زیادہ حریص نہ ہو تو اس کا درجہ زاہد کے قریب قریب ہی ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "مبارک ہو اس کو جس کو اسلام کی ہدایت ہوئی اور بقدر کفایت معاش ملی اور وہ اس پر قانع ہوا" قانع فقیر خدا کو بہت پسند ہے۔ حضرت اسمٰعیلؑ پر وحی نازل ہوئی تھی کہ "اے اسمعیل مجھے شکستہ دل لوگوں کے پاس ڈھونڈا کرو" حضرت اسمٰعیلؑ نے دریافت کیا بارالہا وہ کون لوگ ہیں، ارشاد ہوا کہ "صابر فقیر" خلاصہ یہ ہے کہ اگر فقر کے ساتھ قناعت اور صبر و رضا بھی ہو تو نور علیٰ نور اور اس کا ثواب بہت ہی زیادہ ہے اور چونکہ زہد کی ابتدا فقر پر صبر کرنا ہی ہے اس لئے صبر کا بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

لے حاکم صحیح ۱۲   لے ابن المبارک و ترمذی صحیح ۱۲

چوتھی اصل

صبر کا بیان

حق تعالیٰ نے صبر کرنے والوں کے لئے اتنی صفات جمع فرمائی ہیں جو دوسروں کے لئے جمع نہیں فرمائیں، چنانچہ ارشاد فرماتا ہے کہ "صبر کیا کرو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، صبر کرنے والوں پر ان کے پروردگار کی رحمتیں ہیں اور مہربانی اور وہی راہ یاب ہیں، صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بیشمار دیا جائیگا" وغیرہ وغیرہ۔ کلام مجید میں کچھ اوپر ستّر جگہ صبر کا ذکر آیا ہے۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "صبر نصف ایمان ہے۔ اور جنت کے خزانوں میں کا ایک خزانہ ہے، جس شخص کو یہ خصلت مرحمت ہوئی وہ بڑا سعادت نصیب ہے، شب بیدار اور صائم الدہر سے اس کا درجہ افضل ہے۔

صبر کے معنی اور انسان کے ساتھ اُس کا اختصاص

صبر کے حقیقی معنی ہوا ئے نفس کے مقابلہ میں خدا کے حکم پر مستقل اور ثابت قدم رہنے کے ہیں۔ اور یہ صرف انسان ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس پر دو مخالف لشکر مسلّط اور حملہ آور ہیں جن میں ایک خدائی لشکر یعنی فرشتوں اور عقل و شریعت کا لشکر ہے، جن کا مقصود یہ

---

۱ ابونعیم صحیح ۲ غزالی اور کنوز الحقائق ۳ عراقی کہتے ہیں کہ ملی نہیں ۴ خواہش

کہ انسان کو اپنے قابو میں لائیں اور ہدایت پر قائم رکھیں ۔ اور دوسرا شیطانی لشکر یعنی غیظ و غضب اور نفس کی خواہشوں اور اس کے اسباب کا لشکر ہے جو چاہتا ہے کہ انسان کو اپنے قبضہ میں رکھے اور پابند ہوا و ہوس بنائے ۔ انسان کو بالغ ہو کر دونوں میں امتیاز کرنا اور شیطانی گروہ سے جنگ و جدل کرنا پڑتا ہے ۔ پس اگر عقل کا غلبہ ہوا کہ دین اسلام اور شریعت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) پر استقلال نصیب ہوا تو صبر کا مرتبہ اس کو حاصل ہو گیا ۔ اور بہائم میں صرف شہوات و خواہشات کا مادہ ہے عقل اور دین کا شعور نہیں ہے ، اور فرشتوں میں صرف قرب خداوندی کی تعلّی[1] پیدا کی گئی ہے وہ شہوات نفسانی اور غیظ و غضب سے بالکل منزّہ ہیں کہ ہر وقت تسبیح[2] و تہلیل میں مشغول رہتے ہیں اور جانتے ہی نہیں کہ شہوت کیا چیز ہے ؟ لہٰذا صبر کا مرتبہ ان دونوں میں سے کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا اور انسانوں میں چونکہ دونوں متضاد[3] صفتیں موجود ہیں یعنی خواہشات نفسانیہ بھی ہیں اور بھلا بُرا سمجھنے کا شعور اور عقل و فطرت سلیمہ بھی موجود ہے ۔ پس ایک کو مغلوب اور دوسرے کو غالب کرنا جس کا نام صبر ہے انسان ہی کے لئے مخصوص ہے ۔

یاد رکھو کہ جب یہ دونوں حالتیں اپنا اپنا رنگ جمانا چاہتی ہیں تو اس وقت انسان کو عقل سے کام لینے اور اپنا انجام سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ دین کو غالب رکھ کر مقام صبر پر پہنچے ۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے مریض کو تلخ دوا دی جاتی ہے تو طالب لذت ذائقہ اور مزہ تو یہ چاہتا ہے کہ

---

[1] پاک ۱۲ [2] سبحان اللہ کہنا اور لا الٰہ الا اللہ کہنا ۱۲ [3] ایک دوسرے کی ضد اور خلاف ۱۲

اس کو پاس بھی نہ آنے دے ، اور عقل چاہتی ہے کہ اگرچہ اس کی تلخی ناگوار گزرے گی مگر آنکھیں بند کر کے جبرًا دوا پی لی جائے تاکہ شفا جلد حاصل ہو، پس اگر عقل کو غلبہ ہوگا تو بیشک دوا کی تلخی پر صبر کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر دینی معاملہ میں عقل اور فطرت سلیمہ کو غلبہ ہوگا تو ضرور ہے کہ ریاضت اور مجاہدہ کی دشواریوں کو ضرور برداشت کیا جائے گا۔ اور چونکہ ایمان نام ہے علم اور عمل کا اور عمل کی دو جانبیں ہیں جن میں بعض کا ذکر کرنا مقصود ہے اور بعض سے باز رہنا ، اسی طرح اخلاق و عادات میں عادتِ محمودہ سے آراستہ ہونا ضروری ہے اور خصائل رذیلہ سے خالی اور پاک رہنا لازمی ہے۔ اور یہ درجہ بغیر صبر کے حاصل نہیں ہو سکتا ، لہذا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کو آدھا ایمان فرمایا ہے[1] ، اور چونکہ صبر کبھی شہوت کے مقابلہ میں ہوتا ہے اور کبھی غصہ کے مقابلہ میں اور روزہ شہوت کے توڑنے کا نام ہے لہذا روزہ کو نصف صبر ارشاد فرمایا[2] ہے۔

صبر کا اعلیٰ درجہ

یاد رکھو کہ صبر کے تین درجے ہیں۔

اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ شہوت اور ہوائے نفس کے مادہ ہی کا قلع قمع ہو جائے کہ اس کو مقابلہ کی قدرت ہی نہ رہے اور اس پر ثبات و بقا نصیب ہو۔ اور انھیں نفوس کو نفس مطمئنہ کے خطاب سے مخاطب بنا کر مرتے وقت بشارت دی جائے گی۔ کہ "اے نفس مطمئنہ چل اپنے پروردگار کی طرف کہ تو اللہ سے راضی اور اللہ تجھ سے راضی"

---

[1] ابو نعیم صحیح ۱۲

[2] ابن ماجہ صحیح ۱۲

صبر کا ادنیٰ درجہ اور اسکے آثار

سب میں ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ہوائے نفسانی غالب اور قلب شیطانی لشکر کے حوالہ ہوجائے اسی خطرناک حالت والوں کو حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ " میرا فرمان صادر ہوچکا کہ میں تم سے جہنم بھردوں گا " (واللہ پناہ میں رکھے)۔ اس کی دو علامتیں ہیں۔

ایک یہ کہ ایسا شخص کہا کرتا ہے کہ " مجھے توبہ کا شوق تو ہے مگر مجھ سے ہو نہیں سکتی۔ اور اسی لیئے اب اس کی خواہش بھی نہیں رہی " یہ یاس اور ناامیدی کا درجہ ہے جو مہلک ہے اور اور جانبری کی امید نہیں۔

دوسری علامت یہ ہے کہ توبہ کا شوق بھی نہ رہے اور کہنے لگے اللہ رحیم وکریم ہے اسے میری توبہ کی کچھ پروا نہیں ہے اگر توبہ کئے بغیر وہ مجھ کو جنت میں بھیجدے گا تو اس سے جنت جیسی وسیع جگہ چھوٹی نہیں پڑجائیگی۔ اور خدا کی رحمت شاملہ میں کچھ کمی نہ آجائے گی " یہ بیچارہ کم عقل متحیر ہے۔ اس پابند ہوا وہوس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی مسلمان شخص کافروں کے ہاتھ میں قید ہوجائے اور کافر اس کو کبھی خنزیروں کے چرانے اور انکے کھلانے پلانے کی خدمت سپرد کردیں اور کبھی اس کی گردن اور کمر پر شراب کے پیپے لدواکر اپنے گھروں تک لے جائیں اور یہ اس ذلیل حالت کو ذلیل نہ سمجھے پھر بھلا اس کی نجات کی کیا صورت ہوسکتی ہے ، تمہیں بتلاؤ کہ اگر بادشاہ کی کسی پیاری اولاد کو پکڑ کر کسی ذلیل وبے عزت غلام کے حوالہ کردیا جائے کہ وہ اس کو اپنا غلام بنائے، پاؤں دبوائے اور جو چاہے خدمت لیا کرے تو اس بیچارے شہزادے کا کیا حال ہوگا ؟ اسی طرح اس غفلت شعار مسلمان کا حال ہے جس نے حق تعالیٰ کے تقرب پر دنیائے دنی کو ترجیح

دی اور ہوائے نفسانی کا قیدی ہوگیا کہ توبہ اور توجہ الی اللہ[1] کا شوق بھی اس کے دل سے جاتا رہا (نعوذ باللہ من ہذا الحال الردی[2])

صبر کا متوسط درجہ اور اس کی علامت

متوسط درجہ یہ ہے کہ خدائی لشکر اور شیطانی گروہ میں جنگ و جدال قائم رہے کہ کبھی اس کا پلہ بھاری ہو جائے اور کبھی اس کا پلہ۔ نہ اس کو کامل شکست ہو اور نہ اس کی کھلی ہوئی فتح۔ پس اس قسم کے لوگوں کے بارہ میں ارشاد ہے کہ "یہ لوگ ہیں جنھوں نے اعمال صالحہ کو بدکاریوں میں خلط کر رکھا ہے امید ہے کہ حق تعالیٰ ان پر توجہ فرمائے۔"

اس کی علامت یہ ہے کہ ضعیف خواہشوں کو ترک کرے اور زور آور شہوات کو نہ چھوڑ سکے اور نیز کبھی خواہشات کو چھوڑ دے اور کبھی ان کے ہاتھوں عاجز آجائے مگر اپنے مغلوب ہونے پر حسرت و افسوس ضرور کرتا اور برابر اس کوشش میں لگا ہے کہ کسی طرح نفس پر قابو حاصل ہو جائے تو بہتر ہے، اسی کو جہاد اکبر[3] کہا گیا ہے اور اس میں اس کو دیکھنا چاہیئے کہ کہاں تک فتح حاصل کرتا ہے؟ اگر مغلوب رہا اور قوت عقل کو غلبہ نہ دے سکا تو بالکل جانور کی برابر ہو بلکہ اس سے بھی گیا گذرا ہوا کیونکہ اُس میں تو عقل نہیں اور اس میں باوجودیکہ عقل ہے مگر چوپایہ کی طرح اپنی خواہش نفس کے پورا کرنے میں مصروف ہے اور اگر غالب آگیا تو کام بن گیا۔

فصل

انسان تمام عمر ہر حالت میں صبر کا محتاج ہے۔ کیونکہ دنیا میں دو ہی حالتیں

---

[1] خدا کی طرف التفات ۱۲ [2] ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں اس ردی حال سے ۱۲ [3] بڑی جنگ ۱۲

ہیں یا اپنی مرضی کے موافق اور یا مخالف و ناگوار۔

خوش حالی میں صبر کی ضرورت اور اس کی وجہ

پس اگر مرضی اور منشاء کے موافق حالت ہے مثلاً تندرستی، تونگری، اولاد، عزت، جاہ سب کچھ حاصل ہے تب تو صبر کی نہایت ضرورت ہے۔ کیونکہ اگر نفس کی باگ نہ تھامے گا تو یہ سرکش شرارت کرے گا، اور تنعم[1] و تلذذ میں بے باکانہ قدم رکھے گا یعنی خواہشات کے پیچھے ہو لے گا اور ابتداء و انتہاء سب بھول جائے گا۔ اسی لئے صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ ہم تنگی اور فقر کے فتنہ میں مبتلا ہوئے تو صابر نکلے مگر فراخی و وسعت کے فتنہ میں مبتلا ہوئے تو صبر نہ کر سکے[2]۔

اور فراخی میں صبر کرنے کے یہی معنی ہیں کہ قلب کا میلان اس دنیا کی متاع کی جانب نہ ہو بلکہ یہ سمجھے کہ جو کچھ بھی مجھے خدا کی سرکار سے عطا ہوا ہے وہ میرے پاس خدا کی امانت ہے جو عنقریب مجھ سے واپس لے لیا جائے گا۔ پس جب تک وہ میرے پاس ہے اس وقت تک مجھے شکر ادا کرنا چاہئے اور جب وہ ڈھل جائے تو رنجیدہ نہ ہونا چاہئے۔ اور اگر خدانخواستہ غفلت اور اتباع ہوا میں مشغول ہو گیا تو غافل[3] کہا جائے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اپنی خواہش کے مخالف حالت ہو اور اس کی چار قسمیں ہیں۔

طاعات پر صبر

پہلی قسم ان طاعات پر صبر کرنا ہے جن سے نفس گھبراتا اور بھاگتا ہے۔ مثلاً محض کسل کی وجہ سے نماز پڑھنی

---

[1] نعمتوں اور مزے و لذت میں پڑنا ۱۲ [2] ترمذی ۱۲ [3] یعنی نعمت کا پورا حق ادا نہ ہو سکا ۱۲

ناگوار ہے، اور بخل کی وجہ سے زکوٰۃ دینی گراں گزرتی ہے، اور کسل و بخل ہونوں کی وجہ سے حج اور جہاد کرنا دشوار ہے۔ پس نفس پر جبر کرنا اور طاعت پر صبر کرنا اگرچہ کیسا ہی گراں گزرے مگر ضروری ہے کہ اس گرانی کا تحمل ہو اور نفس کو زیر کرے۔ اور جب نفس مطیع ہوگیا تو پھر تین قسم کے صبر کا حکم ہوگا ؛

عبادت کے شروع اور درمیان اور ختم پر صبر کرنا ؛؛

اوّل عبادت کے شروع کرنے سے پہلے اخلاص پیدا کرنا، ریا وغیرہ کا دور کرنا اور نفس کے مکر و فریب سے بچنا۔

دوم۔ حالت عبادت میں صبر کرنا ضروری ہے تاکہ آداب و سنن و مستحبات کے ادا کرنے میں کسل و کاہلی نہ ہو اور عبادت میں اول سے آخر تک حضور قلب قائم رہے کہ شیطانی[1] وساوس اور نفس کے خطرات ایک لمحہ کیلئے بھی پاس نہ آویں۔

سوم۔ فراغت پانے کے بعد صبر کرنے کی بڑا ضرورت ہے کہ ریا و سمعہ[2] کے طور پر اس کا اظہار اور لوگوں سے اپنی عبادت کا ذکر نہ کرتا پھرے۔

غرض صبر کی ہر جگہ ضرورت ہے اور وہ ہر حالت میں نفس کو شاق گزرتا ہے۔

معصیت پر صبر کرنے کی ضرورت

دوسری قسم معاصی سے صبر کرنا ہے، خاصکر ایسی معصیت سے جس کا نفس عادی ہو رہا ہو اور اس کا مزہ پڑا ہو۔ کیونکہ یہاں خدائی لشکر یعنی عقل و دین سے دو لشکروں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ایک شیطانی گروہ اور دوسرا اس کے ساتھ اس کا مددگار یعنی عادت کا لشکر اور پھر خصوصاً عادت بھی ایسی چیزوں کی جن کے حاصل کرنے میں سہولت ہو کہ کچھ خرچ کرنے کی حاجت نہیں۔ مثلاً غیبت کرنا، جھوٹ بولنا، جھگڑنا،

---

[1] وسوسے ۱۲ [2] دکھاوا اور شہرت ۱۲

اور خود ستائی وغیرہ کہ ان معصیتوں میں صرف زبان ہلانی پڑتی ہے۔ پس ان سے بچنا اور صبر کرنا بڑے بہادر کا کام ہے۔

ایذاؤں پر صبر کرنے کی ضرورت

تیسری قسم ان چیزوں پر صبر کرنا ہے جو اگرچہ تمہارے اختیاری نہیں ہیں مگر ان کا تدارک اور تلافی تمہارے قبضہ میں ضرور ہے۔ مثلاً کسی ایسے شخص سے ایذا پہنچی جس سے تم انتقام لے سکتے ہو مگر اس پر صبر کرو اور انتقام نہ لو۔ یہ صبر کرنا کسی وقت واجب ہے اور کسی وقت مستحب۔ چنانچہ ایک صحابی فرماتے ہیں کہ جب تک مسلمان ایذا پر صبر نہیں کرتا تھا ہم اس کا ایمان کامل نہیں سمجھتے تھے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ مسلمانوں کی یہ شان ہے کہ کافروں کی ایذائیں برداشت کرتے اور یوں کہتے کہ ہم ان تکلیفوں پر صبر کریں گے جو تم ہم کو پہنچاؤ گے۔

مصائب اور آفات پر صبر کرنا

چوتھی قسم وہ ہے جو بالکل غیر اختیاری ہو، یعنی اس کی تلافی بھی اپنے اختیار میں نہ ہو جیسے کسی عزیز کے مرجانے یا مال کے برباد ہو جانے کی مصیبت یا کسی مرض و بیماری کا پیدا ہو جانا یا کسی عضو کا جاتے رہنا غرض تمام بلاؤں اور حوادث پر صبر کرنا چوتھی قسم میں داخل ہے اس کا بڑا درجہ ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میں کسی بندہ کو مصیبت میں مبتلا کرتا ہوں اور وہ صبر کرتا ہے یعنی شکایت کا کلمہ زبان پر نہیں لاتا تو میں اس کا معاوضہ اس کو دیتا ہوں گوشت سے بہتر گوشت اور خون سے بہتر خون، اگر تندرست کر دیتا ہوں تو گناہ معاف کر کے تندرست کرتا ہوں اور وفات دیتا ہوں تو پاک صاف کر کے اپنی رحمت کے جوار[1] میں لیتا ہوں۔ غرض انسان کسی حالت میں صبر سے مستغنی نہیں ہے۔ اور چونکہ صبر نصف ایمان ہے اور ایمان کا دوسرا نصف حصہ شکر ہے کیونکہ اس کو بھی تمام اعمال سے تعلق ہے اس لئے شکر کا بیان کرنا بھی مناسب ہے۔

---

[1] پڑوس۔ ہمسائیگی ۱۲

پانچویں اصل

شکر کا بیان

شکر ہی مقصود بالذات ہے خوف، توبہ، زہد اور صبر وسیلہ مقصود ہیں!

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اگر تم لوگ شکر کروگے تو ہم تم کو زیادہ دیں گے"۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں[1] کہ "کھانیوالا شکرگذار بندہ روزہ دار صابر کے برابر ہے"۔

تم نے سنا ہوگا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک عبادت کرتے کرتے ورم کر آتے تھے، اور آپ تہجد میں گریہ و بکا[2] بہت فرماتے تھے، ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ آپ کے تو اگلے پچھلے سب گناہ معاف ہو گئے ہیں پس آپ اس قدر گریہ و بکا کیوں فرماتے ہیں"؟ آپ نے جواب دیا کہ "اے عائشہ، کیا میں خدا کا شکر گذار بندہ نہ بنوں"؟

واقعی شکر کا مرتبہ نہایت عالی اور صبر و خوف و زہد اور تمام مذکورہ صفات سے بلند ہے کیونکہ جن اوصاف کا ذکر ہو چکا ہے ان میں سے کوئی صفت بھی مقصود بالذات نہیں ہے۔ بلکہ سب مقصود بالغیر ہیں۔ چنانچہ صبر تو اس لئے مقصود ہے کہ ہوائے نفس کا قلع قمع ہو جائے اور خوف اس لئے مطلوب ہے

---

[1] و [2] ابن حبان، صحیح۔ بکا، رونا ۱۲

کہ کوڑے کا کام دے کر مقام مقصود تک پہنچا دے اور زہد سے مقصود ان تعلقات سے بھاگنا ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بے توجہ کر رکھا ہو البتہ صرف شکر ایسی صفت ہے جو مقصود بالذات ہے اور فی نفسہٖ مطلوب ہے اور یہی وجہ ہے کہ شکر کا وجود جنت میں بھی ہوگا کہ تو بہ و خوف اور زہد و صبر کی وہاں حاجت نہیں ہے اور شکر وہاں کی نعمتوں پر بندے ضرور ادا کریں گے ۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ" اہل جنت کا آخری قول " اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ " ہوگا۔[1]

شکر ادا کرنے کے لئے شکر کی ماہیت معلوم ہونی ضروری ہے یعنی اوّل علم ہونا چاہیئے کہ شکر کیا چیز ہے ؟ اور جب یہ معلوم ہوگا تو ایک حالت خاص پیدا ہوگی اور پھر اس حالت خاص کے بعد عمل متفرع ہوگا ۔

شکر کے تین رکن ہیں جن کو ہم علیحدہ علیحدہ بیان کرتے ہیں :۔

شکر کا رکن اوّل یعنی حال اور عمل

اوّل علم یعنی نعمت اور منعم سے واقف ہونا نیز یہ سمجھنا کہ تمام نعمتیں حق تعالیٰ ہی مرحمت فرماتا ہے اور جس قدر اسباب اور واسطے اس نعمت کے ہم تک پہنچنے میں پیش آئے ہیں وہ سب اللہ پاک ہی کے قبضہ میں ہیں کہ اس کے حکم کے بغیر نہ کوئی ذرہ حرکت کر سکتا ہے اور نہ کوئی چیز کسی کو مل سکتی ہے ۔ اور اس سمجھنے سے دو باتیں پیدا ہوں گی ایک منعم سے خوش ہونا دوم اس کی خدمت گزاری اور امتثالِ امر میں سرگرمی کرنا ۔ انہیں دو حالتوں کا نام حال اور عمل ہے ۔

---

[1] شکر ہے اللہ تعالیٰ کا جو رب ہے تمام جہانوں کا ۱۲

شکر کا دوسرا رکن یعنی حال کہ نعمت کے آلہ طاعت ہونے پر خوشی ہو

دوسرا رکن حال یعنی منعم کی اس نعمت پر اس وجہ سے خوش ہونا کہ منعم کا عطیہ ہے۔ اور خضوع و تذلّل[1] کی ہیئت ظاہر کرنا کیونکہ بادشاہ اگر کسی غلام کو گھوڑا بھیجے تو اس کی خوشی تین وجہ سے ہوتی ہے:

اوّل اس وجہ سے کہ کام کی چیز ہاتھ آئی کہ گھوڑے پر سوار ہو کر بیسیوں ضرورتیں رفع ہوں گی۔

دوم اس وجہ سے کہ یہ عطیہ بتلا رہا ہے کہ بادشاہ کی اس غلام پر توجہ اور عنایت ہے جس سے آئندہ کسی بڑی اور اس سے بھی زیادہ مفید نعمت کے ہاتھ آنے کی امید ہے۔

سوم اس وجہ سے کہ گھوڑا اس کی سواری بنے گا اور اس پر سوار ہو کر اپنے منعم آقا کے حضور میں حاضر ہو کر شاہی خدمت بجالا سکے گا۔

ان میں سے پہلی وجہ تو کوئی چیز ہی نہیں کیونکہ وہ تو محض نعمت پر خوشی ہے۔ منعم کی حیثیت اس میں ملحوظ نہیں ہے اور دوسری وجہ شکر میں داخل ضرور ہے مگر ضعیف ہے، البتہ تیسری وجہ شکر کا درجۂ کمال ہے، کیونکہ جو کچھ بھی حق تعالیٰ مرحمت فرمائے اس پر اس وجہ سے خوش ہونا کہ یہ چیز کوئی کارآمد چیز ہے ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ شکر کے یہ معنی ہیں کہ اس پر اس وجہ سے خوش ہو کہ یہ حق تعالیٰ تک پہنچنے کا وسیلہ اور ذریعہ ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ ایسی نعمت پر خوشی نہ پیدا ہو جس کے سبب

---

[1] انکساری اور ذلیل ہونا ۱۲

خدا سے غفلت پیدا ہو جائے اور ذکر الٰہی بھول جائے۔ بلکہ ایسی حالت پر رنجیدہ ہو۔ ہاں جس نعمت کے ذریعہ سے دنیاوی تفکرات رفع ہوں اور اطمینان قلب نصیب ہو، یعنی خدا کی یاد میں اعانت حاصل ہو اس پر خوشی و مسرت ہونی چاہئے۔ پس جو شخص شکر کا یہ درجۂ کمال نہ حاصل کر سکے تو خیر وہ دوسرا ہی درجہ حاصل کرلے۔ باقی پہلے درجہ کو تو شکر سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔

تیسرا رکن یعنی عمل اور ہر نعمت کا طاعت خدا میں استعمال

تیسرا رکن عمل ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کو اس کی رضامندی میں استعمال کرنا، اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ مخلوق کی پیدائش کے اغراض و مقاصد اور یہ بات معلوم ہو جائے کہ کیا کیا چیز کس کس کام کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً آنکھ اللہ کی ایک نعمت ہے اور اس کا شکر یہ ہے کہ اس کو اللہ کی کتاب یعنی قرآن مجید اور علم دین کی کتابوں کے دیکھنے اور آسمان و زمین جیسی بڑی مخلوق کے اس غرض سے مشاہدہ کرنے میں صرف کرے کہ عبرت حاصل ہو اور خالق برتر کی عظمت و کبریائی سے آگاہی حاصل ہو، نیز ستر کے دیکھنے اور عورت پر نظر ڈالنے سے اس کو روک رکھے۔ اسی طرح کان ایک نعمت ہے، اور اس کا شکر یہ ہے کہ اس کو ذکر الٰہی اور ان باتوں کے سننے میں استعمال کرے جو آخرت میں نفع دیں اور بیہودہ اور لغو اور فضول کلام سننے سے روکے۔ زبان کو یاد خدا اور حمد و ثنا اور اظہار شکر میں مشغول رکھے اور تنگدستی یا تکلیف میں شکوہ و شکایت سے باز رکھے کہ اگر کوئی حال پوچھے تو شکایت کا کلمہ نہ نکلنے پائے، کیونکہ شاہنشاہ کی شکایت ایسے ذلیل و بے بس غلام کے سامنے زبان سے نکلنی جو کچھ بھی نہیں کر سکتا بالکل فضول اور معصیت میں داخل ہے اور شکر کا کلمہ زبان سے نکل گیا تو طاعت میں شامل ہوگا۔

قلب کا شکر یہ ہے کہ اس کو فکر و ذکر اور معرفت و اخلاص میں استعمال کرے، اوصاف حمیدہ سے اس کو آراستہ کرے اور خصائل رذیلہ سے صاف و پاک رکھے۔ غرض ہاتھ پاؤں تمام اعضاء کار و مال و متاع و عزت و جاہ سب کا شکر یہی ہے کہ ان کو حق تعالیٰ کی طاعت میں مشغول رکھا جائے۔

فصل

کفرانِ[1] نعمت کا ادراک باتباع سنّت!

درحقیقت کمال درجہ کا شکر تو وہی بندے ادا کر سکتے ہیں جن کا شرح صدر ہو چکا ہو اور جن کے قلوب کے اندر حق تعالیٰ نے حکمت و معرفت کا نور بھر دیا ہے کہ وہ ہر چیز کے رموز و اسرار سے واقف ہیں اور ہر شے میں اپنے محبوب کا جلوہ دیکھتے ہیں، اور جس کو یہ درجہ حاصل نہ ہو اس کو سنت کا اتباع اور حدود شریعت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے یعنی اس کو اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر مثلاً کسی نامحرم پر نظر ڈالی تو آنکھ کی نعمت کا کفران ہوا، اور نیز آفتاب اور تمام ان نعمتوں کی ناشکری ہوئی جن کو بصارت میں دخل ہے اور جن کے بغیر کچھ نظر نہیں آسکتا۔ کیونکہ آنکھ کے بغیر بینائی کام نہیں دے سکتی اور آفتاب کے بغیر آنکھ بیکار ہے، چنانچہ سب جانتے ہیں کہ اندھیرے میں آنکھ کچھ بھی کام نہیں دے سکتی اور آفتاب اپنے وجود میں آسمان کا محتاج ہے، پس آنکھ کی بدنظری کی ایک معصیت سے گویا آسمان و زمین سب ہی کفرانِ نعمت ہوگیا۔

شریعت نے جن کو معصیت و حرام کہا ہے وہ درحقیقت کفرانِ نعمت ہی ہے

یہی حال تمام معصیتوں کا ہے کیونکہ تمام نعمتوں کا باہم تعلق

---

[1] ناشکری ۱۲

وابستہ ہے اور ایک کو دوسرے سے اور دوسرے کو تیسرے سے ایسا علاقہ ہے جو ذرا غور کرنے سے سمجھ میں آسکتا ہے۔

یہاں سمجھانے کے لئے ایک مثال بیان کئے دیتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے روپیہ اشرفی یعنی ثمنؒ نقد کو بمنزلہ حاکم کے بنایا ہے کہ اس کے ذریعہ سے تمام اموال کی قیمت قرار پائے اور اشیاء مختلفہ کے ارزاں گراں ہونے کا باہمی فرق و امتیاز ظاہر ہو۔ پس اگر ثمن نقد یعنی چاندی و سونا نہ ہو تو کچھ بھی سمجھ میں نہ آئے کہ کپڑا زعفران کے بدلے کیونکر خریدا جائے اور اناج گھوڑے کے عوض کس طرح فروخت کیا جائے۔ اس لئے کہ ان میں باہم کوئی مناسبت نہیں ہے، اگر ہے تو صرف یہی ہے کہ نفسِ مالیت دونوں میں مشترک ہے یعنی ثمنیت اور نقدی جس کو چاندی و سونا کہتے ہیں کم و بیش دونوں میں پائی جاتی ہے اور یہی تمام چیزوں کی مقدار کا معیارؒ ہے۔ پس اگر کپڑا ایک روپیہ گز کا ہو اور زعفران پچاس روپے سیر کی تو اس سے اندازہ ہو گیا کہ پچاس گز کپڑے کے بدلے سیر بھر زعفران خریدنی چاہئے۔ اور پچاس گز کپڑا سیر بھر زعفران کے مساوی ہے۔ غرض یہ ثمن و نقدی نہ ہو تو تمام معاملات میں ردّ و بدل ہو جائے اور جملہ اشیاء میں گڑبڑ مچ جائے اس لئے اگر کسی شخص نے اس کو اکٹھا کر کے زمین میں گاڑ دیا یا خزانہ بنا کر مقفل کر دیا تو گویا حاکم کو مسندِ حکومت سے اتار کر بیکار محض بنا دیا اور مقید کر لیا۔ اور جس شخص نے اس کے برتن بنا لئے، مثلاً پانی پینے کا گلاس اور سالن اتارنے کی رکابی تو گویا حاکم کو جولاہا اور کاشتکار کے کام میں لگا دیا۔ حالانکہ یہ اوسط درجہ کا کام دوسرے ادنیٰ درجہ کے خدمتگار بھی کر سکتے تھے۔ پس یہ سزا قید سے بھی زیادہ سخت ہوئی۔ اور جس شخص نے

ؒ قیمت مراد سکہ ۱۲   ؒ کسوٹی ۱۲

سود لینا شروع کر دیا اور روپیہ اشرفی کے لین دین کو مالی ترقی اور تکثیر مال کا ذریعہ بنا لیا کہ صرافہ کے ذریعہ سے چاندی سونے کی ذات کو مقصد تجارت ٹھہرا لیا تو اس نے گویا حاکم کو اپنا غلام بنا لیا تاکہ وہ گھاس کاٹ کر لایا کرے اور جھاڑو دے دیا کرے حالانکہ یہ سب صورتیں صریح ظلم ہیں اور حکمت خداوندی میں تغیر و تبدل کا پیدا کرنا ہے گویا حق تعالیٰ سے عداوت ہے جس کی بنا پر محاربہ و جنگ کا پیام دیا گیا ہے۔

غرض جس شخص کو نور معرفت حاصل نہیں اور یہ رموز اس کو نظر نہیں آتے تو وہ شریعت کی زبان سے صورت تو سمجھ ہی لے گا اگرچہ معنی نہ سمجھے پس اس کو احکامِ شرعی سنائے جائیں گے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے:

"جو لوگ چاندی اور سونے کا خزانہ کا بناتے اور جوڑ جوڑ کر رکھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو قیامت کے دن جمع کئے ہوئے مال ان کے منہ اور پیٹھوں پر داغ دیئے جائیں گے۔"

اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ

"جس شخص نے چاندی یا سونے کے برتن میں پیا گویا وہ اپنے پیٹ میں آگ کے گھونٹ اتار رہا ہے۔"[1]

اور حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن قبروں سے اس طرح اٹھیں گے جیسے آسیب زدہ۔"

ان آیات و احادیث سے معلوم ہو گیا کہ اموال اور اشیاء عالم کے حاکم

---

[1] بخاری و مسلم ۱۲

یعنی زر نقد کا جمع کرنا اور برتن بنانے اور سود پر چلانا یعنی صرافہ کرنا تینوں حرام اور خلاف مقتضائے حکمت خداوندی ہیں۔ ہاں اتنا فرق ہے کہ اہلِ بصیرت ان رموز و اسرار سے چونکہ واقف ہوتے ہیں لہذا اُن کا علم دلائل احکام شرعیہ دوبالا ہوکر نورٌ علیٰ نور کا مصداق بن جاتا ہے اور نیکو کار مسلمان جو ان اسرار تک نہیں پہنچ سکتے وہ حدودِ شرعیہ پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور جو لوگ اندھے اور جاہل ہیں وہ دونوں سے محروم رہتے ہیں سو ایسے ہی لوگوں سے جہنم بھری جائے گی۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اے محمد! تم پر نازل ہوئے احکام سو جو شخص حق سمجھتا ہے وہ اور راہ مستقیم سے اندھا کیا برابر ہو سکتے ہیں۔" دوسری جگہ فرماتا ہے کہ "جس نے میری نصیحت سے اعراض کیا اس کو تنگ معیشت ملے گی اور قیامت کے دن اندھا اٹھایا جائے گا تب وہ پوچھے گا کہ مجھے اندھا کیوں اٹھایا، ہم جواب دیں گے کہ ہماری نشانیاں تجھ تک پہنچی تھیں پس تو نے ان کو بھلا دیا تھا۔ سو آج ہم بھی تجھ کو اسی طرح بھلا دیں گے۔" اور نشانیوں سے مراد یہی حکمت و مصلحت اور رموز ہیں جو ہر چیز کے پیدا کرنے میں ملحوظ ہیں اور جن پر انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے لوگوں کو مطلع کر دیا گیا کہ ہر زمانے میں حاملانِ شریعت علماء و فقہاء ان کو مفصل بیان کرتے رہے۔

پس یاد رکھو کہ شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جس میں حکمت اور رمز و خاصیت نہ ہو۔ پس جو شخص ان کو سمجھ جاتا ہے وہ تو سمجھ جاتا ہے اور جو نہیں سمجھتا وہ ان کا انکار کرنے لگتا ہے اور یہ انکار کرنا شکر کے خلاف ہے۔ اور چونکہ شکر کا کامل درجہ وہی حاصل کر سکتا ہے جس میں سچا اخلاص ہو اور کسی عمل میں ماسوی اللہ کی نیت کا شائبہ بھی نہ ہو، لہذا مناسب ہے کہ اخلاص اور صدق کا ذکر کر دیں۔

چھٹی اصل

اخلاص اور صدق کا بیان

اخلاص کی اصل مسلمان کی نیت ہے۔ کیونکہ نیت ہی میں اخلاص ہوا کرتا ہے۔ اور اخلاص کا کمال صدق ہے۔ اور اخلاص کے معنی یہ ہیں کہ نیت میں کسی شے کی آمیزش نہ ہو اس لئے ان تینوں رکنوں کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا جاتا ہے

اخلاص کا پہلا رکن یعنی نیت اور اللہ کے واسطے عمل!

رکن اول "نیت"۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اے محمد! اپنے پاس سے ان کو علیحدہ نہ کرو جو صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں درآنحالیکہ اسی کی ذات کو چاہتے ہیں"۔[1]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عمل سے حق تعالیٰ کی ذات مقصود ہو۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "عمل کا مدار نیت پر ہے"۔[2] کچھ لوگوں کے اعمال حق تعالیٰ کے حضور میں پیش ہوں گے اور حق تعالیٰ فرمائے گا کہ ان کو پھینک دو کیونکہ ان اعمال سے اس شخص کو میری ذات مقصود نہ تھی۔ اور کچھ بندوں کا نامۂ اعمال پیش ہوگا تو حکم ہوگا کہ فلاں فلاں عمل اور درج کر دو، فرشتے عرض کریں گے کہ بارالٰہا وہ اعمال تو اس نے کئے نہیں تھے، حکم ہوگا کہ ان اعمال کی اس نے نیت تو کی تھی اور اس کا ہم کو علم ہے"۔

---

[1] بخاری و مسلم وغیرہ

[2] مضمون قریب قریب دارقطنی۔ صحیح

حدیث[1] میں آیا ہے کہ آدمی چار قسم کے ہوتے ہیں۔ **ایک** وہ جسے حق تعالیٰ نے مال بھی دیا اور علم بھی دیا اور بہ مقتضائے علم اس مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے **دوسرا** وہ جو اس شخص کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اگر حق تعالیٰ مجھے بھی مال اور علم مرحمت فرمائے تو میں بھی اسی طرح خیرات کروں۔ یہ دونوں شخص اجر میں مساوی ہیں۔ **تیسرا** وہ شخص ہے جس کو صرف مال عطا ہوا اور علم عطا نہیں ہوا، اور یہ شخص جہالت کے سبب گڑبڑ مچاتا اور فضول و بیجا مال اڑا رہا ہے اور **چوتھا** شخص وہ ہے جو اس کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اگر مجھ کو مال مل جائے تو میں بھی اسی طرح مزے اڑاؤں اور عیش کروں۔ بس یہ دونوں شخص گناہ میں مساوی اور برابر ہیں۔

نیت کو عمل میں بڑا دخل ہے

بنی اسرائیل میں سے ایک شخص کا قصہ[2] ہے کہ قحط سالی میں ریت کے ٹیلے پر اس کا گذر ہوا اور وہ اپنے دل میں کہنے لگا کہ اگر یہ ریت کا ٹیلہ اناج بن جائے تو میں اس کو لوگوں میں تقسیم کروں۔ اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے نبی پر وحی بھیجی کہ "اس شخص سے کہدو کہ خدا نے تمہاری خیرات قبول کی اور نیک نیتی کی قدر فرمائی اور اسی قدر ثواب عطا کیا جتنا کہ ٹیلہ کی مقدار اناج کے مساکین پر خیرات کر دینے میں ملتا۔"

خوب سمجھ لو کہ نیت کو عمل میں بڑا دخل ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "جو شخص عورت سے کسی مقدار مہر پر نکاح کرے اور اس کے ادا کرنے کی نیت نہ رکھتا ہو تو یہ نکاح نہیں بلکہ زنا ہے۔ اور جو شخص کسی سے قرض لیکر اس کے دینے کا قصد نہ رکھتا ہو تو یہ قرض نہیں بلکہ سرقہ اور چوری ہے۔"

---

[1] ابن ماجہ بسند عمدہ ۱۲   [2] طبرانی، راوی سب ثقہ ہیں ۱۲

نیت کی ماہیت اور حقیقت

نیت کے معنیٰ ارادہ اور قصد کے ہیں کہ جس سے کسی کام پر قدرت پیدا ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ہر کام کے لئے اول علم کی ضرورت ہوتی ہے اور علم کے بعد اس کے عمل میں لانے کا قصد و ارادہ ہوتا ہے اور اس کے بعد ہاتھ پاؤں ہلانے اور اس کام کے کرنے کی قدرت پیدا ہوتی ہے، گویا قدرت قصد و ارادہ کی خادم ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھو کہ تمہارے اندر کھانے کی خواہش رکھی ہوئی ہے مگر وہ ایسی دبی ہوئی ہے کہ جیسے کوئی سویا ہوتا ہے اور جس وقت تمہاری نظر کھانے پر پڑی اور طعام کا علم ہوا اسی وقت وہ جاگ اٹھی اور اس کے کھانے کا قصد ہوا اس کے بعد اس کی طرف ہاتھ بڑھے گا اور وہ قوت اپنا کام کرے گی جو خواہش طعام کے اشارے کی مطیع بنائی گئی ہے۔ غرض آنکھ کے مشاہدے سے معرفت کا علم حاصل ہوگا اور معرفت کی وجہ سے خواہش بیدار ہوگی اور قصد پیدا ہوگا اور یہ قصد خداداد قوت کے ذریعہ سے ہاتھ کو حرکت دے گا، اور کھانا کھلائے گا۔

اسی طرح تمہارے اندر ان لذتوں کی بھی خواہش رکھی ہوئی ہے جو تم کو آخرت میں ملنے والی ہیں اور جن کا علم عقل و شرع کے ذریعہ سے ہوا ہے اور قدرت چونکہ اس خواہش و میلان کی بھی خادم ہے لہذا وہ اعضاء کو حرکت دے گی اور خواہش کو پورا کرائے گی۔ پس وہی عزم و پختہ میلان جس نے قوت کو ہاتھ پاؤں ہلانے پر آمادہ کیا **نیت** کہلاتا ہے۔ مثلاً جہاد میں جانے والا شخص اپنے گھر سے نکلا تو دیکھو اس کو گھر سے باہر نکالنے والا باعث و محرک کیا چیز ہے؟ یعنی اگر ثواب آخرت ہے تو بس یہی اس کی نیت ہے اور اگر اس کا باعث مال غنیمت یا شہرت و نیکنامی کا حاصل کرنا ہے تو اسی کو اس کی نیت کہا جائے گا۔

فصل

نیت کے متعدد ہونے سے ایک عمل پر متعدد اعمال کا ثواب ملتا ہے

جب نیت کی فضیلت اور ضرورت اور تاثیر تم کو معلوم ہوگئی تو اب ایک ایک عمل میں کئی کئی ثواب حق تعالیٰ سے لینے کی کوشش کرنی چاہئے کیونکہ ممکن ہے کہ ایک عمل میں کئی کئی نیتیں ہوں۔ مثال کے لئے ایک صورت بیان کئے دیتے ہیں۔ مثلاً

مسجد میں جانا اور بیٹھنا ایک عبادت ہے مگر اس میں سات کاموں کی نیت ہو سکتی ہے

اول یہ سمجھنا کہ مسجد اللہ کا گھر ہے اور یہاں آنے والا شخص گویا خدا کی زیارت کو آتا ہے پس مسجد میں آتے وقت تم یہی نیت کرو، کیونکہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "جو شخص مسجد میں آیا وہ اللہ کی زیارت کو آیا ہے"[1] اور چونکہ زیارت کو آنے والے شخص کی عزت ہوا کرتی ہے لہٰذا حق تعالےٰ اپنے زائر کا جتنا اکرام فرمائے گا اس کو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ کیا کچھ ہوگا۔

دوم مرابطہ یعنی نماز کے انتظار[3] کی نیت کرو کہ حق خداوندی کی محافظت کے لئے اپنے آپ کو محبوس[2] بنائے ہوئے اور گویا وقف کئے ہوئے ہو پس خدا تعالیٰ کے حکم وَرَابِطُوْا کی تعمیل ہوگی اور اس کا اجر جدا گانہ ملے گا۔

سوم اعتکاف کی نیت کرو اور اعتکاف کے معنی یہ ہیں کہ آنکھ، کان، زبان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ تمام اعضا کو ان کی معمولی اور معتاد حرکتوں سے روک لیا جائے اور یہ بھی ایک قسم کا روزہ ہے چنانچہ رسول مقبول صلی اللہ

---

[1] طبرانی مدعی ۱۲ [2] قیدی ۱۲ [3] یعنی ایک نماز کے بعد دوسری کا انتظار کرنا ازمنشود ۱۲

علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "میری امت کی رہبانیت یہی ہے کہ وہ مساجد میں آبیٹھیں"[1]

چہارم خلوت کی نیت کرو کہ مشاغل مرتفع ہونے سے فکر آخرت کی استعداد پیدا اور ذکر الٰہی کے سننے اور سنانے کے لئے تجرد و عزلت حاصل ہو۔ دیکھو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں[2] کہ "جو شخص مسجد کی جانب اس لئے روانہ ہو کہ اللہ کا ذکر کرے یا سنے تو وہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرنیوالے کی مثل ہے۔

پنجم۔ اس کی نیت کرو کہ جو لوگ بے نمازی ہیں ان کو تنبہ ہوگا اور نماز کو بھولے ہوئے لوگ بھی تمہاری دیکھا دیکھی نماز کو اٹھ کھڑے ہوں گے، پس تمہارا نماز کو جانا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بن جائے گا کہ کار خیر کی ترغیب دی اور معصیت سے روکا اور اس وجہ سے ان کے ثواب میں تم بھی شریک ہوئے۔

ششم۔ مسجد میں جانے سے دوسرے مسلمانوں سے کچھ نہ کچھ اخروی فائدہ حاصل ہوگا جو تمہارے لئے دار آخرت کا ذخیرہ بنے گا۔

ہفتم۔ خدا کے گھر میں بیٹھو گے تو کچھ حیا و شرم آئے گی اور گناہ کی جرأت کم ہو جائے گی کہ حاکم کی یاد داشت[3] اس کی مخالفت سے روکا کرتی ہے لہذا اس کی بھی نیت کرو۔

غرض اسی طرح ہر عمل میں کئی کئی نیتیں ہو سکتیں ہیں جن کی بدولت گنتی کے چند عمل تمہارے حق میں ہزاروں نیکیاں بنیں گے۔ اور حضرات مقربین کے اعمال کے ساتھ شامل ہو جاؤ گے۔

---

[1] عراقی کہتے ہیں کہ ملی نہیں ۱۲ [2] یہ قول احبار تابعی کا ہے۔ طبرانی کی حدیث میں بجائے ذکر کرنیکے یہ ہو کہ نیکی سیکھے یا سکھائے تو کامل حج کا ثواب ملے ۱۲ [3] ہر وقت خیال رکھنا ۱۲

ایک معصیت بھی متعدد نیتوں سے کئی معصیتیں بن جاتی ہیں

اسی طرح یہ بھی یاد رکھو کہ عمل میں معصیت کی نیت کرنے سے ایک گناہ کئی کئی گناہ بن کر شیطان کے اعمال کے مساوی ہو جاتا ہے۔ مثلاً مسجد میں اگر بیٹھنے سے فضول باتیں بنانی مقصود ہیں یا مسلمانوں کی ہتک آبروریزی اور ہنسی و مذاق اڑانے کی نیت ہو یا ان عورتوں اور بے ریش لڑکوں کا نظارہ مقصود ہو جو نماز کے لئے مسجد میں آتے ہیں یا تفاخر اور مناظرہ اور یا زبان درازی سے اپنے حریف کو ساکت کر کے حاضرین مسجد کے دلوں میں اپنی وقعت پیدا کرنی مقصود ہو یا اور کسی بُرے کام کی نیت ہو تو یہی ایک فعل کئی گناہوں کا مجموعہ ہو جائے گا۔

لہٰذا مناسب ہے کہ مباح کام کے اندر بھی اچھی نیت کر لینے سے غفلت نہ کی جائے۔ کیونکہ حدیث[۱] میں آیا ہے کہ قیامت کے دن بندہ سے اس کے ہر کام کی باز پُرس ہوگی، حتیٰ کہ آنکھ میں سرمہ لگانے اور کسی کپڑے کو چھونے اور انگلیوں سے مٹی کریدنے تک کا سوال ہوگا؟

اور مباح کام میں نیت کرنے کی یہ صورت ہے کہ مثلاً جمعہ کے دن اگر خوشبو لگائی تو یا تو یہ نیت ہوگی کہ اپنی ثروت تونگری ظاہر ہو، یا یہ مقصد ہوگا کہ خوشبو سے نفس کو لذت حاصل ہوگی، یا یہ ارادہ ہوگا کہ اس طرح بن سنور کر جاؤں گا تو عورتیں میری گرویدہ ہوں گی اور یہ سب نیتیں لغو و معصیت ہیں۔

اسی طرح ممکن ہے کہ یہ نیت ہو کہ جمعہ کے دن خوشبو لگانا سنت کا اتباع یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتداء ہے اور حق تعالیٰ کے گھر کی

---

[۱] حلیۃ الاولیاء از زبیدی ۱۲

تعظیم ہے اور جمعہ کے دن کا احترام ہے اور مسلمانوں کو بدبو کی ایذا سے بچانا اور بوئے خوش سے ان کو راحت پہنچانا اور غیبت کے دروازہ کا بند کرنا ہے کہ لوگ بدبو سونگھیں گے تو دوسروں سے غیبت کرتے پھریں گے کہ فلاں شخص کے کپڑوں سے بڑی بدبو آتی تھی۔

انہیں دونوں فریق کی جانب حدیث میں ارشاد ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس شخص نے اللہ کے واسطے خوشبو لگائی وہ قیامت کے دن ایسی حالت میں آئے گا کہ مشک سے زیادہ خوشبو اس سے مہکے گی اور جو اللہ کے سوا کسی دوسری غرض سے خوشبو لگائے گا وہ ایسی حالت پر اٹھے گا کہ مردار سے زیادہ بدبو پھوٹے گی۔

رکن دوم۔ اخلاص نیت۔

نیت کا رکن دوم اخلاص ہی حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "لوگوں کو اسی کا حکم ہوا ہے کہ اللہ کی عبادت کریں مخلص بنکر اور وہی لوگ نجات پانے والے ہیں جنھوں نے توبہ کی اور اپنی حالت سنواری اور اللہ کی رسی کو مضبوط تھاما، اور اپنے دین میں اللہ واسطے اخلاص کیا"

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "جس شخص نے چالیس دن اخلاص کے ساتھ کوئی نیک عمل کرلیا تو حق تعالیٰ اس کے قلب سے زبان پر حکمت کے چشمے بہادے گا"[1]

اخلاص کی ماہیت اخلاص کے معنی یہ ہیں کہ نیت صرف ایک ہی شئی ہو یعنی عمل کا محرک یا صرف ریا ہو اور

---

[1] ابوالولید الصفار مرسل ۱۲ [2] ابونعیم ضعیف ۱۲

یا محض رضائے حق ۔ ان دونوں پر اخلاص کے لغوی معنی صادق آتے ہیں کیونکہ خالص اسی شئے کو کہتے ہیں جس میں کسی دوسری جنس کی آمیزش نہ ہو۔

مگر اصطلاح شرع میں اخلاص کے یہ معنی ہیں کہ محض حق تعالیٰ کی ذات مقصود ہو۔ کیونکہ ماسوٰی کی جانب میلان اور قصد کرنے پر شرعاً اخلاص کا اطلاق نہیں ہوتا۔ جس طرح الحاد کے معنی مطلق میلان کے ہیں خواہ بھلائی کی جانب یا برائی کی طرف مگر شرعاً صرف باطل کی جانب مائل ہونے کا نام الحاد ہے، اسی طرح عبادت سے مقصود اگر محض عبادت ہے تب تو اخلاص کہلائے گا۔ اور اگر اس میں ریا اور دکھلاوے کی آمیزش ہو یا عبادت کے ضمن میں دنیا کے کسی فائدے کا بھی ارادہ شامل ہے تو اس کو اخلاص نہیں کہیں گے۔

مثلاً روزہ رکھنے سے مقصود یہ بھی ہو کہ روزہ رکھنا عبادت ہے اور یہ بھی مقصود ہو کہ کھانے پینے کا پرہیز کرنے سے بیماری کو بھی نفع ہوگا، پس ایک کام میں دو نیتیں شامل ہوئیں تو اس کو اخلاص نہ کہیں گے۔ یا مثلاً غلام کے آزاد کرنے سے یہ مقصود ہو کہ یہ عبادت ہے اور یہ بھی مقصود ہو کہ اسی طرح پر غلام کے کھانے کپڑے کے بوجھ سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ یا مثلاً حج سے یہ بھی مقصود ہو کہ وہ نیک کام اور عند اللہ محبوب ہے اور یہ بھی نیت ہو کہ حج کرنے سے سفر میں حرکت ہوگی اور حرکت سے مزاج صحت و اعتدال پر آجائے گا یا اہل و عیال کے بارے چند روز کے لئے خلاصی مل جائے گی، یا دشمنوں کی ایذاؤں سے نجات حاصل ہوگی، یا ایک جگہ رہتے رہتے دل اکتا گیا ہے پس سفر میں دل بھی بہل جائے گا، یا مثلاً وضو کیا مگر اس نیت سے کہ لطافت حاصل ہو اور بدن کا میل کچیل دور ہو جائے، یا مثلاً اعتکاف کیا تاکہ گھر کے کرایہ سے سبکدوشی ہو، یا کسی بیمار کی عیادت کی مگر اس نیت سے کہ تمہارے بیمار ہونے پر وہ تمہاری عیادت

کو آئے، یا مثلاً فقیر کو اس نیت سے کچھ دیا کہ وہ سر ہو رہا اور غل مچا رہا تھا پس اس کا شور رفع ہو جائے گا وغیر ذالک۔ یہ سب خیالات اخلاص کے منافی ہیں اور ان کا رفع ہونا دشوار ہے۔ اسی لئے بعض اہل بصیرت کا قول ہے کہ اگر ایک ساعت بھی اخلاص حاصل ہو جائے تو نجات مل جائے۔

حضرت سلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ "مبارک ہو اس کو جس کا ایک قدم بھی ایسا اٹھا جس سے مقصود خدا ہی کی ذات ہو"۔ حضرت معروف کرخیؒ اپنے نفس کو مارتے اور فرمایا کرتے تھے کہ اے نفس اخلاص پیدا کرتا کہ خلاصی حاصل ہو۔

مگر ہاں یہ ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ ان تینوں کی آمیزش کئی طرح پر ہوا کرتی ہے یعنی کبھی تو یہ نیتیں عبادت کی نیت پر غالب آجاتی ہیں اور کبھی مغلوب رہتی ہیں اور کبھی مساوی ہوتی ہیں۔ پس اگر مباح کاموں کے اندر رضائے حق تعالیٰ شانہٗ کا قصد کچھ بھی شامل ہو جائے گا تو اس کا بھی ضرور ثواب ملے گا۔ مگر عبادت کے اندر اخلاص کا حکم ہے، لہٰذا یہاں عبادت کی نیت کے ساتھ اگر دوسرے مقصود کی کچھ بھی آمیزش ہو گی تو اخلاص باطل ہو جائے گا۔ اور اگر وہ آمیزش غالب ہے اور قصدِ عبادت مغلوب ہے تو عبادت بالکل ہی باطل اور بیکار ہے۔

نیت کا تیسرا رکن صدق ہے

تیسرا رکن صدق ہے اور یہی اخلاص کا کمال ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ہمارے بندے وہ ہیں جو اپنے عہد میں سچے ثابت ہوئے"۔ اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "انسان سچ بولتا اور اسی کا جویا بنا رہتا ہے،

---

[1] بخاری و مسلم ۱۲

یہاں تک کہ اللہ کے یہاں صدیق لکھا جاتا ہے" حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صفت حق تعالیٰ نے صدیق فرمائی ہے۔ اور صدق کی فضیلت اسی سے ظاہر ہے کہ یہ صدیقین کا درجہ ہے۔

صدق کے چھ درجے ہیں اور جو شخص ان چھیوں میں کمال حاصل کرتا ہے وہ صدیق کے خطاب کا سزا وار ہوتا ہے۔ صدق کے درجے حسب ذیل ہیں:

صدق قولی اور اس کا کمال

پہلا درجہ قول صدق کا ہے کہ ہر حالت میں سچ بولے۔ اور اس کے کمال دو ہیں:

اوّل تعریض سے بھی پرہیز کرے۔ کیونکہ تعریض اگرچہ سچ ہی میں داخل ہے مگر پھر بھی سُننے والا اس سے خلاف واقع مضمون سمجھتا ہے، لہٰذا اس سے بھی احتراز کرے، کیونکہ جھوٹ بولنے کی حرمت کا سبب یہ ہے کہ اس کی وجہ سے قلب کی صورت میں کجی آجاتی ہے اور وہ حق کی تجلی کے قابل نہیں رہتا چنانچہ ایسے شخص کو خواب بھی سچا نظر نہیں آتا، اور تعریض کا اگرچہ یہ ثمرہ نہیں ہے تاہم اس کی صورت چونکہ جھوٹ کے مشابہ ہے اس لئے اندیشہ ضرور ہے پس صدیق کی شان کے مناسب یہی ہے کہ بلا ضرورتِ خاص دوسرے کو تعریض کے ذریعہ بھی واقعہ کے خلاف امر کا دھوکہ نہ دے۔

دوسرا کمال یہ ہے کہ ان اقوال میں بھی صدق کا لحاظ رکھے جو حق تعالیٰ کے سامنے عرض کرتا ہے مثلاً نماز میں زبان سے کہتا ہے کہ میں اپنے آپ کو اللہ کی طرف متوجہ کرتا ہوں، پس اگر اس کے دل میں بھی ماسوی اللہ کا خیال نہیں ہے تب تو وہ قول میں سچا ہے ورنہ جھوٹا۔ یا مثلاً کہتا ہے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہ "تیری عبادت کرتا ہوں اور تجھی سے مدد چاہتا ہوں" پس اگر دل کے اندر زر کی طلب اور مال کی محبت موجود ہے تو یہ بھی کذب ہے،

کیونکہ اظہار تو خدا کے معبود اور اپنے بندہ ہونے کا کر رہا ہے اور دل بندۂ زر اور بندہ دنیا بنا ہوا ہے۔

صدق نیت کا عزم دوسرا درجہ نیت میں سچا رہنے کا ہے یعنی ایسا اخلاص کہ جس میں عبادت اور فعل خیر کے قصد کے سوا کسی دوسرے قصد کی مطلق آمیزش نہ ہو۔

عزم کا صدق تیسرا درجہ عزم میں سچا بننے کا ہے۔ انسان اکثر عزم کرتا ہے کہ اگر مجھے مال ملا تو اتنی خیرات کروں گا، یا مثلاً خیال ہوتا ہے کہ حکومت ہاتھ آئے تو عدل کروں گا۔ بس اس کا نام عزم ہے۔ مگر لوگوں کے عزم میں پختگی ہوتی ہے اور کہیں تردد و تذبذب۔ اسی طرح صدیقین کے عزم بھی متفاوت ہوتے ہیں جن میں اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اگرچہ جان جاتی رہے مگر عزم میں ضعف یا تذبذب نہ آنے پائے، جیسے حضرت فاروق رضؓ فرماتے ہیں کہ "میری گردن اڑا دی جائے تو یہ مجھ کو اس سے زیادہ محبوب ہے کہ اس گروہ پر حاکم بنوں جس میں ابوبکر رضؓ موجود ہوں"۔ پس عزم کے قوی اور مضبوط ہونے ہی کا نام عزم کا سچا ہونا ہے۔

عزم کے پورا کرنے میں صدق چوتھا درجہ، عزم کے پورا کرنے میں سچائی کا ہے، کیونکہ اکثر انسان کا عزم تو پختہ ہوتا ہے مگر پورا کرتے وقت کاہل اور سست بن جاتا ہے۔ مثلاً مال ہاتھ آیا تو صدقہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی، اور حکومت ملی تو عدل و انصاف نہ ہو سکا، حالانکہ امتحان کا یہی وقت ہے۔ کیونکہ دل میں عزم کر لینا تو کچھ دشوار نہ تھا تکلیف اٹھانے کا موقع تو اس عزم کے پورا کرتے وقت ہی پیش آیا ہے۔ اور اسی لئے

لے ڈگمگانا ۱۲

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "بعض شخص ایسے بھی ہیں جو اللہ سے عہد کر چکے تھے کہ اگر ہم کو مال عطا ہوا تو ضرور خیرات کریں گے مگر جب اللہ پاک نے اپنے فضل سے ان کو مال مرحمت فرمایا تو بخل کرنے اور منہ پھیرنے لگے انجام یہ ہوا کہ اللہ نے ان کے قلوب میں نفاق پیدا کر دیا۔

صدقِ حالی

پانچواں درجہ یہ ہے کہ ظاہر و باطن یکساں ہو، یعنی ظاہر حالت بھی وہی ہو جو واقع میں باطن کی حالت ہو، مثلاً نرم چال چلے اور ظاہر یہ کرے کہ طبیعت میں وقار ہے مگر حقیقت میں قلب کے اندر وقار نہ ہو بلکہ محض لوگوں کے دکھانے کو ایسا کرے تو اس کا نام ریا ہے، اور اگر مخلوق کے دکھاوے کا بھی خیال نہ ہو بلکہ محض غفلت و بے توجہی ہو تو اس کا نام اگرچہ ریا تو نہیں ہے مگر صدق بھی نہیں ہے بلکہ حالت کا دروغ اور جھوٹ ہے۔ اس لئے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی ہے کہ "بار الہا میرا باطن میرے ظاہر سے بہتر بنادے اور ظاہری حالت کو صلاحیت عطا فرما"[1]

مقامات میں صدق

چھٹا درجہ دین کے مقامات اور مدارج میں سچائی کا ہے۔ یعنی خوف و رجا اور محبت و رضا اور توکل و زہد وغیرہ کا وہ انتہائی مرتبہ حاصل کرے جو اسم بامسمّٰی بنادے۔ کیونکہ ابتدائی درجہ میں ان صفات کا صرف نام ہی نام ہوا کرتا ہے البتہ انتہائی درجہ میں پہنچکر سچا خوف اور سچی محبت پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "مومن وہی ہیں جو اللہ و رسول پر ایمان لائے پھر نہ کچھ شبہ کیا اور نہ اللہ کے راستہ میں اپنے جان و مال سے دریغ کیا یہی لوگ سچے ہیں"

غرض صدق کے ان چھ درجوں میں کامل ہو جانے سے صدیق کا لقب عطا ہوتا ہے اور جس کو ان میں سے کوئی درجہ حاصل ہو اور کوئی حاصل نہیں تو اس کو اسی مقدار کے موافق صدق کا مرتبہ حاصل ہوگا اور چونکہ صدق ہی کا درجہ یہ بھی ہے کہ قلب، اللہ کو رزاق سمجھ کر اس پر بھروسہ رکھے اور توکل کرے۔ لہذا توکل کا بیان بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] ترمذی ۱۲

ساتویں اصل

توکّل کا بیان

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ" اللہ ہی پر مسلمانوں کو بھروسہ رکھنا چاہئے ، لوگو! اگر تم ایمان دار ہو تو خدا پر توکل کرو ، اللہ توکل کرنے والوں کو محبوب سمجھتا ہے اور جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے اللہ اس کی تمام ضرورتوں کو کافی ہے ۔ اللہ کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ تم کو رزق نہیں دے سکتے ، پس رزق اللہ ہی کے پاس سے طلب کرو "

اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ " اگر تم خدا پر پورا توکل کروگے تو حق تعالیٰ تم کو اس طرح رزق دے گا جس طرح پرند کو دیتا ہے یعنی بلا تعب و مشقت کہ صبح کو بھوکا اٹھتا ہے اور شام کو پیٹ بھرا واپس آتا ہے "[1]

یاد رکھو کہ جو شخص اللہ کا ہو رہتا ہے حق تعالیٰ اس کو ایسی طرح رزق پہنچاتا ہے کہ اس کا گمان بھی نہیں جاتا ۔

توکل کی ماہیت اور ارکان

توکل کے معنی اس حالت کے ہیں جو حق تعالیٰ کو یکتا فاعل مختار اور تمام صفاتِ کمالیہ میں مستقل ولاشریک سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے ، اور اس کے بعد یہ حالت ایسے کام کراتی ہے جن سے توکل و اعتماد ظاہر ہوا کرتا ہے ۔ لہذا توکل کے تین رکن ہوئے

---

[1] ترمذی ۔ حسن صحیح ۱۲ [2] بلا تکان اور دشواری ۱۲

اوّل معرفت ، دوّم حالت ، سوّم اعمال ۔

اب ہم تینوں کا جدا جدا ذکر کرتے ہیں ۔

رکن اول معرفت یعنی توحید

رکن اوّل معرفت ہے ، یعنی توحید حق جس کا اقرار کلمۂ توحید سے ہوتا ہے کہ سوائے خدا کے کوئی معبود نہیں ۔ وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ، اسی کا ملک ہے اور اسی کی حمد وثنا ، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ۔

اس میں اس مضمون کا اقرار ہے کہ حق تعالیٰ قدرت اور وجود اور حکمت میں وہ کمال رکھتا ہے جس کی وجہ سے حمد کا مستحق ہے ۔ پس جس نے صدق و اخلاص کے ساتھ اس کا اقرار کر لیا اس کے قلب میں اصل ایمان راسخ ہوگیا اور اب توکل کی حالت ضرور پیدا ہوگی بشرطیکہ صدق دل سے اقرار کیا ہو اور صدق دل کے یہ معنی ہیں کہ اس اقرار کے معنی قلب پر ایسے غالب آجائیں کہ دوسرے مضمون کی اس میں گنجائش نہ رہے ۔

توکل کا دوسرا رکن یعنی حال

دوسرا رکن حال توکل ہے ۔ اور اس کے یہ معنی ہیں کہ اپنے کام خدا کے حوالہ کردو اور قلب کو مطمئن رکھو کہ غیر اللہ کی طرف التفات بھی نہ کرو ، یعنی ایسے ہو جاؤ کہ جیسے کسی ہوشیار اور شفیق و غمخوار وکیل عدالت کو اپنے مقدمہ میں وکیل بنا کر مطمئن اور بے فکر ہو جایا کرتے ہو کہ پھر کسی دوسرے کی جانب تمہارا دل ڈانواڈول نہیں ہوتا ۔ کیونکہ سمجھتے ہو کہ تمہارا وکیل ہر طرح عقلمند اور تمہارا خیر خواہ ہے پس تمہارے حریف کو کبھی تم پر غلبہ نہ پانے دے گا اور مخالف سے اس کے سامنے بات ہی نہ کی جائے گی ۔

اسی طرح جب جانتے ہو کہ رزق اور موت وحیات اور مخلوق کے چھوٹے

بڑے سارے کام خدا ہی کے قبضہ میں ہیں، کوئی اس کا شریک نہیں ہے، نہ اس کی جُود و سخا اور حکمت و رحمت کی انتہا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ اپنے قلب کو مطمئن نہ بناؤ اور غیر سے نظر نہ اٹھاؤ۔

اللہ پر توکل و اعتماد نہ ہونے کے دو سبب!

پس اگر اتنا جان کر بھی توکل نہ ہو تو سمجھ لو کہ اس کا سبب دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہے۔ یعنی یا تو پورا یقین ہی حاصل نہیں ہے۔ اور نعوذ باللہ حق تعالیٰ کے رزاق و باقدرت سمیع و بصیر ہونے میں کچھ شک ہے۔ اور یا یقین تو ہے مگر قلب پر اس یقین کا اثر نہیں ہوا بلکہ ایسی حالت ہے جیسے موت کے تیقن کی ہوا کرتی ہے کہ باوجودیکہ اس کا یقین حاصل اور اس کا علم ہے کہ ضرور ایک دن ہمیں مرنا اور دنیا چھوڑنا ہے مگر پھر بھی ایسے نڈر ہیں کہ اس کا کچھ فکر نہیں کرتے۔ سبب اس کا صرف یہی ہے کہ قلب پر اس یقین کا پورا اثر نہیں ہے۔ یا دوسرا سبب یہ ہے کہ تمہارا قلب پیدائشی طور پر ضعیف و کمزور واقع ہوا ہے اور خلقۃً تم بزدل ہو کہ ضعفِ قلب کی وجہ سے تمہارا دل ایسے اوہام کا محکوم و مطیع ہو گیا ہے جو یقیناً باطل اور محض لاشے ہیں، جس طرح مُردے کے پاس اس کے بستر پر سونے سے اکثر ڈر معلوم ہوا کرتا ہے، حالانکہ معلوم ہے کہ یہ مُردہ ہے اور کچھ نہیں کر سکتا مگر پھر بھی اس کے پاس لیٹ کر نیند نہیں آتی اور ڈر معلوم ہوتا ہے کہ یہ واہیات توہمات کی تو اطاعت ہے جس نے ضعیف قلب کو یقین پر عمل نہ کرنے دیا۔ مثلاً بعض آدمیوں کو شہد کے کھانے سے نفرت ہونے لگتی ہے محض اس واہمہ سے کہ اس کا رنگ گوبر کے رنگ کے مشابہ متوہم ہوتا ہے حالانکہ اس کا یقین ہوتا ہے کہ شہد ہے گوبر نہیں ہے، اور محض رنگ کی مشابہت کوئی چیز نہیں ہو

مگر پھر بھی اس کو کھا نہیں سکتا ، اور یہ وہم ہی کا اثر ہے جس سے انسان کا بچنا دشوار ہے۔

اسی طرح ممکن ہے کہ توحید کا یقین کامل ہو اور نام کو بھی شبہ یا شک نہ ہو بایں ہمہ اسباب کے اختیار کرنے میں نفس مجبور ہو جائے اور اعتماد کامل جس کا نام توکّل ہے حاصل نہ ہو سکے۔

توکّل کا تیسرا رکن یعنی عمل

تیسرا رکن اعمال ہیں۔ جاہلوں کا خیال ہے کہ توکّل تو محنت مزدوری اور کسب کے چھوڑ دینے کا نام ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیکار بن کر بیٹھ جائے ، اگر بیمار ہو تو دوا علاج نہ کرے ، بے سوچے سمجھے اپنے آپ کو خطرات اور ہلاکت میں ڈال دیا کرے کہ کہیں آگ میں گھس جائے اور کہیں شیر کے منہ میں ہاتھ دیدے تب متوکل کہلائے۔ حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ کیونکہ ایسا کرنا شرعاً حرام ہے ، اور شریعت ہی توکّل کی خوبیاں بیان کر رہی ہے ، پھر بھلا جس بات کو شریعت خود حرام بتائے اسی کی رغبت اور حرص دلائے گی یہ کیونکر ہو سکتا ہے ؟

اصل بات یہ ہے کہ انسان کی سعی اور کوشش اکثر چار وجہ سے ہوا کرتی ہے، یعنی یا تو کسی ایسی نافع چیز کے حاصل کرنے میں سعی ہوتی ہے جو حاصل نہیں ہے، اور یا موجودہ نفع کی حفاظت میں سعی ہوتی ہے اور یا کسی آنے والے ضرر کے روکنے میں اور یا موجودہ نقصان کے دور کرنے میں۔

پہلی صورت جلب منفعت کہلاتی ہے اور اس کے تین سبب ہیں، کہ یا تو سبب اختیار کرنے پر نفع کا حصول یقینی ہو، یا اس کا غالب گمان ہو ——— اور یا محض موہوم ہو۔

متیقّن الحکم اسباب کو عطاءِ خداوندی سمجھنا اور دل سے اُن پر اعتماد نہ کرنا ضروری ہے

یقینی کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص بھوکا ہو اور کھانا بھی اس کے سامنے رکھا ہو مگر وہ ہاتھ نہ بڑھائے اور نوالہ بناکر منہ تک نہ لیجائے اور کہے کہ میں متوکل ہوں۔ یا مثلاً بیٹے کا طالب ہو مگر بیوی سے جماع نہ کرے۔ یا مثلاً غلّہ کا خواہاں ہو مگر بیج کھیت میں نہ ڈالے۔ سو ایسا خیال تو محض جہالت اور بوالہوسی ہے۔ کیونکہ ان اسباب پر مُسبَّب[1] کا تفرّع[2] یقینی ہے جن کو حق تعالیٰ نے قاعدہ کے طور پر تجویز فرمادیا ہے اور اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا۔ پس اسباب کا اختیار کرنا شرعاً ضروری ہے۔ البتہ ان اسباب میں توکل کرنے کی دو صورتیں ہیں:

اوّل اس کا خیال رکھے کہ طعام اور ہاتھ خدا کے دیئے ہوئے اور کھانے کی قدرت بھی اسی کی عطا کی ہوئی ہے۔ اسی طرح بیج اور کھیتی کرنے کی استعداد اسی نے عطا فرمائی ہے۔ اسی طرح بیوی اور نطفہ اور جماع کی طاقت سب اسی کی قدرت کا کرشمہ ہے۔

دوم یہ کہ ان اسباب پر بھی دل سے بھروسہ نہ ہو بلکہ دل سے خالق ہی پر بھروسہ رکھے۔ کیونکہ دل سے اسباب پر بھروسہ کرنا سراسر غلط ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ ابھی ہاتھ پر فالج کا اثر ہوجائے یا مثلاً کھانا زمین ہی پر گرجائے، یا بیج کو کیڑا لگ جائے یا اولہ گر پڑے یا گرمی کھا جائے تو مقصود کی صورت بھی نظر نہ آئے۔

الغرض ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھ کر سعی اور کوشش کرنے اور اسباب کے اختیار کرنے میں کچھ مضائقہ ہے اور نہ اسباب کا اختیار کرنا توکل کے خلاف ہے۔

---

[1] وہ شے جو سبب سے ہو ۱۲ یعنی نتیجہ ۱۲ نجیب [2] مرتب ۱۲

غالب الحکم اسباب کا اختیار کرنا بھی خلاف توکل نہیں

دوسری حالت مسبّب کے سبب پر مرتب ہونے کے متعلق غالب گمان کی تھی۔ مثلاً جنگل کا سفر کرتے وقت توشہ ساتھ رکھنا کہ اگر توشہ نہ لیا جاوے تو مرنا یقینی تو نہیں ہے، تاہم غالب گمان یہی ہے کہ زادِ راہ کے بغیر جنگل کا سفر سبب ہلاکت ہے تو ایسے سبب کا اختیار کرنا بھی خلاف توکل نہیں، بلکہ سلف کا طریقہ اور صلحاء کا معمول رہا ہے۔ البتہ اعتماد اللہ ہی کے فضل پر ہونا چاہئے کہ اگر زادِ راہ کو چوری اور ڈاکہ سے محفوظ اور گلنے سڑنے سے بچائے رکھے گا اور زندگی قائم رکھ کر اس کے کھانے کی قوت کو بحال رکھے گا تو یہ کھانا استعمال میں آوے گا اور سبب قوت و حیات بنے گا ورنہ کچھ بھی نہیں۔

موہوم نتیجہ والے اسباب کی ہوس طمع کہلاتی ہے

تیسری حالت موہوم[1] کی ہے۔ مثلاً زیادہ معاش کے حاصل کرنے میں حد سے زیادہ سعی اور دوڑ دھوپ کرنا کہ سعی زیادہ کریں گے تو مال زیادہ ملے گا، یہ حالت حرص اور طمع کہلاتی ہے، اور اس کی بدولت بسا اوقات مشتبہ مال حاصل کرنے کی نوبت آجاتی ہے۔ اور نیز یہ صورت توکل کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل توکل کے جو اوصاف بیان فرمائے ہیں ان میں یہ ذکر نہیں فرمایا کہ وہ شہروں میں نہیں رہتے یا کسب و حرفت نہیں کرتے، بلکہ یوں فرمایا ہے[2] کہ توکل والے وہ ہیں جو منتر جنتر نہیں

---

[1] یعنی مسبّب کے سبب پر مرتب ہونے کا یونہی وہم ہو۔ ۱۲

[2] بخاری و مسلم۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے داغ کرنا مسلم وغیرہ میں روایت ہے تو مطلب یہ ہے کہ جائز تو ہے مگر بہتر نہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواز بتانے کے لئے کیا تھا ۱۲

پڑھتے اور جانوروں کو داغ نہیں دیتے؛ اس سے معلوم ہوا کہ ایسے اسباب کا اختیار کرنا توکل کے خلاف ہے جن پر مسبّب کا مرتب ہونا محض موہوم جیسے منتر پڑھنے اور داغنے سے مرض کا جاتا رہنا موہوم بات ہے۔ اور جن اسباب سے مسبب کا حاصل ہونا موہوم نہ ہو بلکہ غالب یا یقینی ہو جیسے سفر میں توشہ رکھنا یا پیٹ بھرنے کے لئے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانا اور چبانا وغیرہ تو یہ توکل کے خلاف نہیں ہے۔

سال بھر سے زیادہ معاش کا انتظام اہل و عیال کا بھی خلاف توکل ہے

دوسری صورت یعنی آئندہ کے نفع کی سعی اور کوشش کرنا ہے کہ جس کو تدبیر کہتے ہیں۔ اور منجملہ اسباب و تدبیر کے اناج بھر لینا یا آئندہ کے لئے ذخیرہ جمع کر رکھنا بھی ہے۔ لیکن اگر متوکل کو مال عطا ہو اور وہ سال بھر یا زیادہ کے لئے ذخیرہ جمع کرلے تو توکل جاتا رہے گا اور اگر ایک دن کی خوراک رکھکر باقی سب بانٹ دے تو توکّل میں کامل سمجھا جائے گا، اور اگر چالیس دن کا انتظام کرلے تو اس میں اختلاف ہے۔ شیخ سہل تستری رح یوں ہی فرماتے رہیں کہ توکل کے خلاف ہے۔ اور بعض دیگر صُلحاء نے اس کو خلافِ توکّل نہیں سمجھا۔

البتہ اگر یہ شخص عیالدار ہو تو جن متعلقین کا نان و نفقہ اس کے ذمہ ضروری ہے ان کے لئے سال بھر کا ذخیرہ جمع کر دینا خلاف توکّل نہیں ہے۔ ایسا تو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کیا ہے[1] کہ ازواج مطہرات کو سال بھر کا نفقہ مرحمت فرمادیا ہے۔ ہاں اپنے نفس کے لئے ہمیشہ یہ حالت رکھی[2] کہ اگر صبح کو مل گیا تو شام کے لئے جمع کرکے نہ رکھا اور شام کو ملا تو صبح کے لئے کچھ نہ رکھا۔

---

[1] بخاری و مسلم ۱۲ [2] ترمذی ۱۲

اور سال بھر سے زیادہ کا انتظام کرنا تو بی بی بچوں کے لئے بھی توکل کے خلاف ہے۔ کیونکہ اوّل تو دوسرے وقت کا انتظام طولِ امل ہے کہ زندگی کا بھروسہ گھنٹہ بھر کا بھی نہیں ہے، پھر دوسری بھوک کے لئے جمع کرنا کیسا؟ اور یہی وجہ ہے کہ جتنا کسی کو اس طولِ امل سے بُعد ہوگا اسی قدر اس کا درجہ بڑھا ہوا ہوگا۔ مگر چونکہ حق تعالیٰ کی عادت جاریہ یوں قرار پائی ہے کہ ہر سال اپنی مخلوق کے لئے نیا رزق اور نیا دانہ مرحمت فرماتا ہے لہذا ایک عطا سے لیکر دوسری عطا کے وقت تک کیلئے ذخیرہ فراہم رکھنے کی بضرورت عیالداری گنجائش نکل آئی کہ ضعیف لوگوں کا ساتھ ہے کہیں پریشانی لاحق نہ ہو۔ باقی سال بھر سے زیادہ کیلئے جمع کرنا تو نہایت درجہ ضعیف ایمان کی علامت ہے۔ البتہ اثاث[1] البیت یعنی برتن آبخورہ لوٹا وغیرہ چونکہ ہر سال نیا نہیں ہوتا اور اس کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے لہذا اس کے سال بھر سے زیادہ کیلئے ذخیرہ جمع کر لینے میں کچھ حرج نہیں ہے۔ مگر کپڑے کا آئندہ سال کیلئے رکھ چھوڑنا بیشک توکل کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس کی ہر وقت ضرورت نہیں، چنانچہ ظاہر ہے کہ جاڑے کا کپڑا گرمی میں کام نہیں دیتا اور گرمی کا کپڑا جاڑے میں بیکار ہے۔ اور اسی بنا پر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک درویش کی بابت فرمایا[2] کہ قیامت کے دن ایسا اٹھے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا ہوگا لیکن اس کی عادت یہ تھی کہ جب جاڑا آتا تھا تو گرمی کے کپڑے آئندہ سال یعنی دوسری گرمی کیلئے رکھ چھوڑا کرتا تھا پس اگر یہ عادت نہ ہوتی تو اس کا چہرہ چمکتے ہوئے آفتاب کی طرح دمکتا۔

دفع مضرت کا حکم بھی جلب منفعت کی طرح تین قسم کا ہے

تیسری صورت یعنی موجودہ تکلیف یا آنے والے نقصان کے دفع

---

[1] گھر کا سامان ۱۲ [2] قوت القلوب بسند مجہول ۱۲

کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ مثلاً درندہ کو دیکھ کر بھاگ جانا۔ یا جھکی ہوئی دیوار کے پاس سے ہٹ جانا تاکہ گر نہ جائے۔ یا مرض کا علاج کرنا تاکہ جاتا رہے اور صحت حاصل ہو جائے، سو اس کے بھی مختلف مراتب ہیں جن کو مذکورہ بالا مضمون پر قیاس کر کے تم خود سمجھ سکتے ہو۔ کیونکہ اسباب پر مسبّب کا حصول یا یقینی ہوگا یا ظن غالب اور یا موہوم، اور ہر ایک کا مفصل حال تم کو معلوم ہو چکا ہے پس ہر صورت کا حکم اس سے معلوم کرلو

فصل

ضعیف القلب کو اتنی حرص نہ کرنی چاہیئے

جن لوگوں کی نظر وسیع اور قلب مضبوط و مستحکم ہو اور یقین بڑھا ہوا اور اذعان قوی ہو سو ان کو یہی زیبا ہے کہ اگلے دن کا بھی ذخیرہ جمع نہ کریں۔

البتہ ضعیف القلب کو زیبا نہیں کہ ان کی حرص کرے۔ بلکہ اگر ایسی حالت ہو کہ ذخیرہ فراہم نہ کرنے سے قلب کی پریشانی کا اندیشہ ہو تو ایسے شخص کے لئے اس توکل کو ترک کرنا اور ذخیرہ مہیا کرنا ضروری ہے تاکہ قلب کو فراغ و سکون حاصل ہو اور عبادت صحیح ہو سکے۔ کیونکہ طبیعت کے فکر و انتشار میں جس نقصان کا اندیشہ ہے اس کی اصلاح سب سے مقدم ہے۔

ہاں جن لوگوں کو قوت ایمان اور قلبی اطمینان حاصل ہو ان کو توزادراہ لئے بغیر سفر کرنا بھی جائز ہے، بشرطیکہ سات روز تک بھوک پر صبر اور گھاس پات پر قناعت کر سکیں، کیونکہ گھاس پات تو جنگل میں بھی ملنا غالب ہے، لیکن ضعیف الایمان شخص اگر ایسا کرے گا تو گنہگار ہوگا، کیونکہ وہ جس صورت کو اپنے خیال میں ہلاکت سمجھتا ہے اسی میں اپنے آپ کو ڈال رہا ہے اور جان بوجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا حرام ہے۔

اللہ سے خرق عادت کی طلب قوی الایمان کو بھی جائز نہیں

اسی طرح قوی الایمان شخص کو بھی پہاڑ کی کھوہ میں جا بیٹھنا کہ وہاں نہ گھاس پات

ہو نہ کسی بشر کا گذر ہو، جائز نہیں ہے۔ کیونکہ ایسی جگہ رزق پہنچانا اگرچہ قدرت خدا میں داخل ہے مگر عادت کے خلاف ہے۔ اور اسی لئے اگر کسی شخص کو ایسی جگہ رزق ملا ہے تو وہ اس کی کرامت کہلائی ہے۔ اور چونکہ بندہ کو زیبا نہیں ہے کہ آقا کو عادت کے خلاف کرنے پر مجبور کرے۔ لہذا یہ صورت قوی الایمان کیلئے بھی جائز نہیں ہے جنگل میں توشہ لئے بغیر سفر کرنا تو اس وجہ سے جائز تھا کہ خدا کی عادت یوں جاری ہے کہ جنگل گھاس سے خالی نہ ہو۔ اور نیز آدمیوں کا بھی وہاں اکثر گذر ہوتا رہتا ہے تو جب قوتِ ایمان حاصل ہے تو ایسی صورت میں ہلاکت غالب نہیں ہے، لہذا معصیت بھی نہیں ہے۔ مگر ویران اور سوکھے پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھنا تو عادت اللہ کے توڑنے کی خواہش کرنا ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر معاش کے جلی اور واضح اسباب کی طرف سے توجہ ہٹا کر جنگل کی گھاس پر قناعت کرے اور اللہ کے لطف و حکمت پہ بھروسہ رہے تو اَولیٰ و انسب ہے۔

ا؎ روشن ۱۲   ۲؎ بہتر ۱۲

آٹھویں اصل

محبّت کا بیان

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اللہ نیک بندوں سے محبت کرتا ہے اور نیک بندے اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔" اور جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "جب تک تمہارے نزدیک اللہ اور اس کا رسول ہر چیز سے زیادہ محبوب نہ ہوگا اس وقت تک تمہارا ایمان کامل نہ ہوگا۔" حضرت صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "جس شخص کو اللہ کی محبت کا مزا آجاتا ہے اس کو دنیا کی طلب بالکل نہیں رہتی اور وہ آدمیوں سے وحشت کھانے لگتا ہے۔"

اہل کلام و فلسفی چونکہ اللہ کی محبت کے معنی نہیں سمجھے اس لئے وہ اس کے منکر ہو کر یوں کہنے لگے کہ جس ذات کا کوئی مثل نہیں ہو اس کو ہماری طبیعت کے ساتھ مناسبت پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ ہماری عقل اس کا پورا ادراک کر سکتی ہے لہٰذا اس کے ساتھ محبت کے بجز اس کے کوئی معنی نہیں کہ اس کے احکام کی تعمیل اور ارشاد کی تعمیل کی جائے۔" یہ بیچارے چونکہ حقیقت سے جاہل ہیں اس لئے ان کا خیال ہے کہ محبت اپنے ہم جنس ہی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ اس کی فہم حقیقت الامر کو معلوم نہ کر سکی۔ ہم اس جگہ مختصر طور پر محبت کی حقیقت بیان کرتے ہیں تاکہ اصل بات معلوم ہو سکے۔

عشق و محبت کی حقیقت اور پہچان

جاننا چاہیئے کہ ہر لذیذ چیز انسان کو محبوب ہے۔ اور محبوب ہونے کے

۱؎ مضمون بخاری و مسلم ۱۲ ۲؎ واقعی بات ۱۲

یہ معنی ہیں کہ طبیعت اس کی طرف کھنچتی اور نفس اس کی جانب مائل ہوتا ہے، یہی میلان طبیعت بڑھ جاتا ہے تو عشق کہلانے لگتا ہے۔ اسی طرح کسی چیز کے ناپسند اور مبغوض ہونے کے یہ معنی ہیں کہ طبیعت اس سے نفرت کرتی ہے اور دل تکلیف پاتا ہے۔
پس جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب غور کرو کہ جتنی چیزیں تم اپنے حواس کے ذریعہ سے ادراک کرسکتے ہو یا تو وہ تمہاری طبیعت کے موافق ہوں گی اور یا مخالف ہوں گی اور یا ایسی ہوں گی کہ نہ موافق ہیں نہ مخالف۔ پس جو چیزیں طبیعت کے موافق ہیں وہ تو محبوب اور لذیذ ہیں اور جو طبیعت کے مخالف ہیں وہ مبغوض و ناگوار ہیں، اور جو چیزیں نہ طبیعت کے موافق ہیں نہ مخالف، ان میں نہ لذت آتی ہے نہ ان سے نفرت ہوتی ہے بلکہ مساویٰ[۱] حالت رہتی ہے۔

اور لذت ہمیشہ ادراک کے بعد حاصل ہوا کرتی ہے۔ مگر ادراک دو قسم کے ہیں، ایک ادراک ظاہری اور ایک ادراک باطنی۔ پس ظاہری ادراک تو حواسِ خمسہ[۲] کے ذریعہ سے ہوا کرتا ہے۔ مثلاً آنکھ کو کسی حسین اور خوبصورت کے دیکھنے لذت آتی ہے، اور کان کو موزوں اشعار اور خوش الحان کے گانے اور سریلی آواز کے سننے میں مزا آتا ہے، اور زبان و ناک میں چکھنے اور سونگھنے کا حس رکھا ہوا ہے مزیدار کھانوں اور خوشبودار پھولوں میں لذت حاصل ہوتی ہے اور تمام بدن کی قوتِ لامسہ[۳] کو نرم و ملائم اور نازک چیز کے چھونے میں مزا آتا ہے، اور یہی چیزیں نفس کو محبوب ہیں یعنی بالطبع نفس ان کی جانب مائل ہوتا ہے۔

اسی طرح انسان کو ایک چھٹا حاسہ[۴] اور بھی مرحمت ہوا ہے جو ادراک باطنی کہلاتا ہے اور اس کی جگہ قلب ہے۔ اس چھٹے حاسہ کو کبھی عقل کہدیتے ہیں کبھی نور

---

[۱] بغض کی ہوئی ۱۲ [۲] برابر ۱۲ [۳] پانچوں محسوس کرنے والی یعنی دیکھنے، سونگھنے، چھونے، سننے اور چکھنے کی قوتیں ۱۲ [۴] چھونے والی ۱۲ [۵] محسوس کرنے والی قوت ۱۲

اور کبھی چھٹا حاسہ۔ غرض نام جو کچھ بھی ہو مقصود یہ ہے کہ باطنی ادراک بھی حواسِ ظاہری کی طرح اپنے موافق اور مناسب چیز سے لذت حاصل کیا کرتا ہے۔ چنانچہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں میری محبوب بنائی گئی ہیں یعنی خوشبو اور عورتیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے[1]" اور ظاہر ہے کہ خوشبو سے قوّتِ شامّہ کو مزہ آتا ہے اور خوبصورت عورت سے قوّت باصرہ اور قوّتِ لامسہ کو لذت حاصل ہوتی ہے مگر نماز کی لذت حواس خمسہ ظاہری میں سے کسی کو بھی نہیں آتی، ہاں اس کی لذت اسی چھٹے حاسہ کو آتی ہے جو باطنی ہے اور جس کا مقام قلب ہے، اور یہی وجہ ہے کہ جس کا قلب بیکار ہے وہ نماز میں کبھی لذّت نہیں پا سکتا اس لذت کا ادراک سلیم القلب[2] شخص ہی کو ہو سکتا ہے اور انسان کی خصوصیت اسی چھٹے حاسہ کی وجہ سے ہے ورنہ حواسِ ظاہری میں تو تمام حیوان مشترک ہیں، چنانچہ جانوروں کو بھی اچھی صورت اور عمدہ آواز اور ذائقہ اور کھانے اور خوشبو سونگھنے اور نازک چیز کے چھونے کی رغبت ہوتی ہے۔

خوب سیرتی کا التذاذ باطنی حاسہ سے ہوتا ہے جس کا محل قلب ہے

البتہ انسان جس طرح ظاہری آنکھوں کی بصارت سے حسین عورتوں کی لذت حاصل کرتا ہے، بصیرت سے باطنی خوب سیرتیوں کا مزہ اٹھاتا ہے، بشرطیکہ قلب کی آنکھوں میں بینائی بھی ہو۔ مگر شاید تم باطنی خوب سیرتی اور اس کی لذّت کو نہ سمجھ سکو کہ کیا چیز ہے، لہٰذا میں تم سے کہتا ہوں کہ تم اپنے نفس کو ٹٹولو اور دیکھو کہ اس میں انبیاءؑ و اولیاءؒ اور صحابہؓ و

---

[1] نسائی، طبرانی۔ حسن ۱۲ [2] عیب سے سالم دل والے ۱۲

علماء کی محبت ہے یا نہیں ؟ نیز اگر بادشاہ منصف و بہادر اور سخی و عاقل اور اپنی رعیت پر مہربان ہو اور دوسرا ظالم و بزدل بخیل و ناسمجھ اور اپنی رعیت کے ساتھ سخت دل اور کڑوے مزاج کا ہو تو ان دونوں میں تمہارا قلب کچھ امتیاز اور فرق کرتا ہے یا نہیں ؟ اگر کرتا ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ ایک جانب تمہارا دل کھنچتا ہے اور دوسری طرف نہیں کھنچتا بلکہ نفرت کرتا ہے ؟ اگر غور کرو گے تو سمجھ لو گے کہ یہ وہی باطنی ادراک ہے جو خوب سیرتی میں لذت پا رہا ہے ۔ اسی طرح جس وقت مثلاً حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شجاعت و بہادری یا ظل اللہ حضرت فاروق اعظم رض کی سیاست و عملداری یا خلیفۃ الحق حضرت صدیق رض کی سچائی و جان نثاری کے قصے سنتے ہو تو ایک امنگ اور مسرت اور ان حضرات کی طرف ایک قسم کا ایسا میلان پیدا ہوتا ہے کہ اس کا انکار نہیں ہو سکتا ۔ اس سے زیادہ صاف بات سمجھو تو غور کرو کہ لوگوں کو اپنے مقتدائے مذہب اور صاحب شریعت امام کے ساتھ اتنا تعلق ہو جاتا ہے کہ جان اور مال کے خرچ کرنے میں ان کو مطلق دریغ نہیں ہوتا حالانکہ ان کی آنکھوں نے ان کی صورت بھی نہیں دیکھی اور اگر دیکھتے بھی تو شاید اتنی محبت نہ ہوتی ، کیونکہ آنکھ کی لذت دوسری قسم کی ہے اس لذت اور اس لذت میں بہت فرق ہے ، اور اگر محبت ہوتی بھی تب بھی یہ محبت جو ان صفاتِ حمیدہ کے ذریعہ سے ہوئی ہے محل گفتگو ہوتی کہ بتاؤ یہ لذت کس حاسہ سے ادراک کی گئی ؟ ظاہر ہے کہ یہ وہی چھٹا حاسہ ہے جس کی جگہ دل میں ہے ، کیونکہ دل ہی تو ہے جس نے ان پیشواؤں میں وہ باتیں پائیں جن سے دل کو لذت حاصل ہوئی ہے ۔

❊ ❊ ❊

محبّت کے اسباب صرف علم وقدرت اور تقدس میں ہیں

اب اگران اوصاف کو تلاش کروگے جن کی وجہ سے یہ محبت حاصل ہوتی ہو تو وہ تین وصف نکلیں گے۔ یعنی علم اور قدرت اور بے عیب ہونا۔ کیونکہ مقتدایانِ دین کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور فرشتوں اور آسمانی کتابوں کا علم حاصل ہے اور وہ اللہ کے پیغمبروں کی شریعت کے دقائق وحقائق سے واقف ہیں۔ دوئم انہوں نے خدا کی دی ہوئی قدرت سے کام لیا کہ اپنے نفس کو مغلوب بنایا نفسانی شہوتوں کو مٹایا اور حق کی سیدھی راہ پر قائم اور جمے رہے اور نیز طاقت کو کام میں لاکر خدا کی مخلوق پر قبضہ کیا، سیاست وملکی انتظام سے ہزار ہامیل کی آبادی کو زیر فرمان بنایا اور خدا کے برحق دین کی تلقین کرکے لوگوں کو سیدھا راستہ بتلایا اور نیز عیوب باطنی سے پاک صاف نظر آئے کہ جہالت سے، بخل سے، حسد وکینہ سے اور بغض وعداوت سے غرض تمام بدخلقیوں سے بے عیب اور تمام عمدہ عادتوں اور اخلاقِ حسنہ سے متصف پائے گئے۔ یہی تین اوصاف ہیں جن کی وجہ سے ان میں وہ حسن پیدا ہوا جس کو حیوانات نہیں سمجھ سکتے، یہ انسان ہی کی خصوصیت ہے کہ قلب کے چھٹے حاسہ سے اس باطنی حس کا ادراک کرتا اور اس میں لذت پاتا ہے۔

غرض تم کو جب ان اوصاف کی وجہ سے پیشوایانِ مذہب اماموں کے ساتھ محبت ہوگئی تو ظاہر ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ کمالات بدرجۂ اتم موجود ہیں لہذا آپ کی ذات کے ساتھ جو محبت ہوگی وہ دنیا بھر کے علماء وانبیاء سے بڑھی ہوئی ہوگی۔

اس کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رسول بنانے والی اور پیدا کرنے والی ذات پر نظر ڈالو جس نے تم پر اپنے احسان فرمائے کہ ہزارہا

انبیاء علیہم السلام تبلیغ کے لئے بھیجے اور پھر اپنا محبوب بھی تمہاری طرف مبعوث فرمایا۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے علم و قدرت اور تقدس کو حق تعالیٰ شانہٗ کے بے پایاں علم اور غیر محسود قدرت اور اوصاف کمالیہ سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہو سکتی، خدا ہی کی ذات ہے جس میں کوئی عیب نام کو بھی نہیں اور اس کے سوا کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو ہر قسم کے عیب اور نقص سے خالی ہو اگر کسی مخلوق میں کوئی عیب نظر نہ آوے تو عجز و احتیاج اور عبودیت و غلامی بھی تو بڑا نقص ہے اور ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں بھی موجود ہے، کیونکہ اس سے مخلوق کا کوئی فرد بھی مستثنیٰ نہیں ہے، اس لئے کہ سب جانتے ہیں کہ یہ حضرات تو کھانے پینے کے بھی محتاج تھے، نہ کسی کو رزق دے سکتے تھے نہ جلا سکتے تھے، نہ فاعل مختار[1] تھے اور نہ قادر۔ پھر قادر ذوالجلال کی قدرت اور انبیاء علیہم السلام کی قدرت میں کیا موازنہ ہو سکتا ہے؟ اسی طرح حق تعالیٰ کے علم ازلی پر نظر ڈالو تو ایک بحر ذخار[2] ہے کہ کہیں اس کا کنارہ ہی نہیں۔ کوئی ذرہ بھی اس کے علم کے احاطہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ آسمان و زمین عرش و کرسی لوح و قلم، شجر و حجر غرض جو شئے خیال و ذہن میں بھی نہیں آسکتی وہ اس علام الغیوب کے علم ازلی میں موجود ہے۔ غرض انبیاء علیہم السلام میں جو کچھ بھی صفات نظر آتی تھیں وہ در حقیقت پرتو اور ظل[3] ہیں صفات خداوندی کا۔ پھر جب دھوپ کی جانب باوجود اس کے عارضی اور ظل آفتاب ہونے کے تمہارا نفس میلان کرتا ہے تو اس کے مبدأ و مصدر[4] یعنی آفتاب کی جانب کیوں نہ مائل ہوگا؟ اور جب مستعار صفات کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اس قدر محبت ہے تو مبدأ صفات یعنی حق تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ محبت کیوں نہ ہوگی؟

---

[1] وہ کام کرنے والا جسے اس کا اختیار حاصل ہو ۱۲ [2] بہت بڑا دریا ۱۲ [3] سایہ ۱۲
[4] شروع کی جگہ اور صادر ہونے کی جگہ ۱۲

محبت کا ادنیٰ درجہ محسن کی محبت ہے

اس پر بھی اگر تمہاری باطنی بصیرت حق تعالیٰ کے جلال و کمال کا ادراک نہ کر سکے اور عشق نہ پیدا ہو تو کم سے کم اتنا تو ضرور کرو کہ اس کے احسانات و انعامات کو شمار کرو کہ وہ کس قدر ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ تم ان کو ہرگز شمار نہ کر سکو گے تو کیا اس سے بھی گئے گذرے ہوئے کہ اس کو اپنا محسن سمجھ کر محبوب سمجھو اور نفس کو اس کی جانب مائل و متوجہ کرو۔ دنیا کی جس چیز میں بھی تم کو لذت حاصل ہوتی ہے اس کو سوچو اور غور کرو کہ اس کا دینے والا اور باقی رکھنے والا کون ہے؟ ذرا سی توجہ سے معلوم ہو جائیگا کہ کوئی لذت اور کوئی حظ اور کوئی مزہ اور کوئی نعمت ایسی نہیں ہے جس کو حق تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا شخص دے یا دے سکے۔ پھر کیا اپنے محسن کے ساتھ تم کو محبت نہیں ہوا کرتی؟ اگر ہوتی ہے تو حق تعالیٰ کے ساتھ اصلی محبت کا ہونا ضروری اور مقدم ہے اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ اگر فرشتوں کی طرح تم کو حق تعالیٰ کے ذاتی جلال و جمال کی وجہ سے اس کی محبت نہ ہو تو عام مخلوق کی طرح اس کو اپنا محسن ہی سمجھ کر اس سے محبت کرو کہ اس حدیث کا منشا پورا ہو جائے جس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے[1] کہ "اللہ تعالیٰ سے محبت کرو بایں وجہ کہ وہ تم کو غذا دیتا ہے اور مجھ سے محبت کرو بایں وجہ کہ حق تعالیٰ مجھ سے محبت فرماتا ہے"۔ یہ محبت ضعیف اور کم درجہ کی ہے کیونکہ احسانات کے کم و بیش ہونے سے محبت بھی کم و بیش ہوتی رہے گی۔ سو اس قسم کی محبت کرنیوالا شخص اس غلام کی مثل ہے جو اپنے مطلب کی محبت رکھے اور بایں نیت خدمت کرے کہ مزدوری ملے گی اور اپنا پیٹ بھرے گا۔

اصل اور کامل محبت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ان صفاتِ محمودہ اور

---

[1] ترمذی و حاکم۔ صحیح ۱۲

جلال وجمال کی وجہ سے محبت ہو جن میں اس کی ذات لاشریک ہے اور کوئی اس کا ہم پلہ نہیں ۔ اسی لئے اللہ پاک نے حضرت داؤد علیہ السلام کی جانب وحی فرمائی کہ مجھے سب میں زیادہ پیارا وہ بندہ ہے جو میری عطا اور احسان کے بغیر محض حق ربوبیت[1] ادا کرنے کی غرض سے میری عبادت کرے ۔ اور زبور میں مسطور[2] ہے کہ اس سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے جنت کی طمع یا دوزخ کے خوف سے میری عبادت کی ۔ پس اگر میں دوزخ اور جنت کو نہ پیدا کرتا تو کیا عبادت کا مستحق نہ ہوتا ؟

ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا چند ایسے لوگوں پر گذر ہوا جو خلوت میں بیٹھے عبادت کر رہے تھے اور کہتے تھے کہ ہم جنت کی امید رکھتے ہیں اور دوزخ کا ڈر ۔ حضرت روح اللہ[3] نے فرمایا کہ تم کو مخلوق کی ہی طمع ہے اور مخلوق ہی کا خوف ہے ، وائے افسوس کہ خالق کے لئے کچھ بھی نہیں ۔ آگے جا کر چند دوسرے لوگوں پر گذر ہوا جو خلوت نشین تھے اور کہتے تھے کہ ہم تو محض خدا کی محبت اور اس کے جلال کی عظمت کی وجہ سے اس کی عبادت کر رہے ہیں ۔ آپ نے فرمایا کہ بیشک تم خدا کے ولی و مقرب ہو ، اور تمہارے ہی پاس بیٹھنے کا مجھ کو امر ہے ۔

فصل

محبت خدا کے آثار و علامات محبت الٰہی کی علامتیں بے شمار ہیں گو اس کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ۔ ہاں بعض علامتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے ۔

---

[1] رب اور پروردگار ہونا ۱۲ [2] لکھا ہوا ۱۲ [3] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے ۱۲

سومنجملہ اُن کے یہ ہے کہ انسان نفس کی خواہش پر اپنے محبوب یعنی حق تعالیٰ کے حکم کو ترجیح دیتا اور اس کی تعمیل کو سب کاموں پر مقدم سمجھتا ہے یعنی متقی و پرہیزگار رہتا اور حدود شرعیہ کا ہر وقت لحاظ رکھتا ہے۔

دوؔم اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا شائق ہوتا ہے اور موت سے گھبراتا نہیں اور اگر زندگی چاہتا بھی ہے تو محض اس لئے کہ معرفتِ حق جتنی بھی زیادہ حاصل ہو اتنی ہی بہتر ہے تاکہ محبوب کے وصال میں لذّت زیادہ حاصل ہو، کیونکہ معرفت مشاہدۂ جمال کا بیج ہے، پس جتنا بیج زیادہ پڑے گا اسی قدر پیداوار بھی زیادہ ہوگی۔ اسی طرح جس قدر معرفت کامل ہوگی اسی قدر مشاہدۂ جمالِ حق میں لذّت زیادہ حاصل ہوگی۔

سوؔم حکم الٰہی اور قضاء و قدر پر راضی رہتا ہے کہ گوارا اور ناگوار جو کچھ بھی پیش آتا ہے اُس پر زبان یا دل سے شکوہ نہیں کرتا۔

اب مناسب ہے کہ رضا بہ قضا کا بھی کچھ بیان کردیں تاکہ انسان کو دھوکہ نہ ہو، اور اس غرّہ میں کہ مجھ کو محبتِ خدا حاصل ہو گئی ہے، مغرور ہو کر نہ بیٹھ جائے۔ کیونکہ محبّت حق تعالیٰ کا حاصل ہونا کوئی آسان چیز نہیں ہے بلکہ نہایت دشوار ہے۔

نویں فصل

رضا بر قضا

حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی شان میں فرمایا ہے کہ "اللہ اُن سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں"[1]۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں[2] کہ "حق تعالیٰ جب کسی بندہ کو محبوب بناتا ہے تو اس کو کسی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے۔ پس اگر وہ صابر رہتا ہے تو اس کو منتخب کرتا ہے اور اگر اس کی قضا پر راضی ہوتا ہے تو اس کو برگزیدہ کر لیتا ہے"۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ سے پوچھا[3] کہ تم کون ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم مومنین مسلمین ہیں، آپ نے پوچھا کہ تمہارے ایمان کی علامت کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ مصیبت پر صبر کرتے ہیں اور راحت پر شکر کرتے ہیں اور قضا پر راضی رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا "بخدا تم سچے مومن ہو"۔

حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی[4] کہ اے داؤد! تم بھی ایک کام کا قصد و ارادہ کرتے ہو اور میں بھی ارادہ کرتا ہوں، مگر ہوتا وہی ہے جو میں ارادہ کرتا ہوں۔ پس اگر تم میرے ارادہ و مشیت پر راضی رہے اور مطیع و فرمانبردار رہے تب تو میں تمہارے چاہے کی تلافی بھی کروں گا اور تم سے

---

[1] یعنی اللہ تعالیٰ کے فیصلہ فرما دینے اور تقدیر میں لکھ دینے پر رضامند رہنا ۱۲

[2] الفردوسی، تعلیقا ۱۲ [3] حاکم، بیہقی ۱۲ [4] قصد ۱۲

خوش بھی رہوں گا، اور اگر میرے ارادہ پر راضی نہ ہوئے تو تم کو مشقت و تکلیف میں ڈالوں گا، اور انجام کار ہوگا ضرور وہی جو میں چاہوں گا۔ باقی مفت کی پریشانی تمہارے سر پڑے گی۔

فصل

ایک فرقہ رضا کا منکر ہے، اور اس کا خیال جس کو وہ دلیل سمجھے ہوئے ہے یہ ہے کہ جو چیز اپنی خواہش کے خلاف ہوگی اس پر خوش اور راضی ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں، البتہ ناگوار پر صبر ضرور ہو سکتا ہے۔ مگر یہ خیال ناسمجھی اور قصورِ فہم کی علامت ہے۔ یاد رکھو کہ جس طرح وہ لوگ محبت الٰہی کے سمجھنے سے قاصر رہے اسی طرح رضا بر قضا کی صورت کو نہیں سمجھ سکے۔

تکلیف پر رضا و خوشی ہونے کے عقلی وجوہات اور نظائر

سُنو! بلا و تکلیف پر راضی ہونا اور خواہشِ نفس و طبیعت کے خلاف پر خوش ہونا تین وجہ سے ممکن ہے:

اوّل:۔ دنیا کی مخلوق ہی میں دیکھ لو کہ فرطِ محبت اور جوشِ شوق میں انسان کو اکثر تکلیف اور درد محسوس نہیں ہوا کرتا، چنانچہ معشوق مارتا ہے مگر اس کی تکلیف نہیں ہوتی اور محبت کا درجہ تو بلند ہے انسان کی حالت غلبۂ شہوت اور غصہ کے جوش میں بھی ایسی ہو جاتی ہے کہ بدن پر زخم آجاتا ہے اور سر پھٹ جاتا ہے خون بہنے لگتا اور جسم لہولہان ہو جاتا ہے مگر اس وقت کچھ بھی تکلیف محسوس نہیں ہوتی، اسی طرح تم نے اپنی حالت پر کبھی نظر ڈالی ہوگی کہ جس وقت کسی مرغوب چیز کی ہوس اور شوق میں محو و مستغرق چلے جا رہے ہو اور

ل سمجھ کی کمی ۱۲

کانٹا چبھ جائے تو اس وقت اس کا مطلق درد یا کرب[1] محسوس نہیں ہوتا ہے، ہاں جب غصہ رفع یا شوق ختم ہو جاتا ہے، مثلاً مرغوب شئے مل جاتی یا اس کے حصول میں یاس و ناامیدی ہو جاتی ہے تو اس وقت چوٹ اور کانٹا چبھنے کی تکلیف محسوس ہونے لگتی ہے، پس جب ذرا سی محبت میں یہ حالت ہوتی ہے تو تکلیف محسوس نہیں ہونے پاتی تو زیادہ محبت میں تو کسی بڑی تکلیف کا بھی حس نہ ہوگا، اور جب یہ حالت دنیا میں موجود ہے کہ خون اور گوشت سے بنے ہوئے اس انسان کے عشق میں یہ حالت ہے جس کے پیٹ کے اندر منوں نجاست بھری ہوئی ہے اور صورت کی ناپائیدار معمولی خوبی نے اتنا اثر پیدا کر دیا ہے کہ آنکھوں کی بینائی بھی اس قدر غلطی کرنے لگی کہ ناگوار چیز گوارا بن گئی اور بدصورت شئے خوبصورت نظر آنے لگی اور عیوب محاسن بن کر خوبیاں دکھائی دینے لگے تو حضرت جلّ جلالہٗ کے جمالِ ازلی کا عاشق اگر ناگوار کو گوارا اور ناپسند کو پسند کرنے لگے تو کیا بعید ہے، حالانکہ قلب کی بصیرت تو آنکھوں کی بصارت سے ہر طرح مقدم اور اولیٰ ہے۔

رضا بر مصیبت واقع میں محبت الٰہی کا اثر ہے؛

اسی بنا پر حضرت جنید بغدادیؒ نے شیخ سری سقطیؒ سے دریافت فرمایا کہ کیا محب کو بھی بلا کی تکلیف ہوتی ہے؟ شیخ نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں، اگر ستر مرتبہ بھی تلوار سے مارا جائے تب بھی تکلیف نہ ہو۔

ایک عارف فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی محبت کے سبب مجھے اس کی پیدا کی ہوئی ہر چیز سے محبت ہے یہاں تک کہ اگر دوزخ کو وہ محبوب بنائے تو

---

[1] تکلیف ۱۲

میں دوزخ ہی میں جانا محبوب سمجھوں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی محبت کی وجہ سے آگ میں جلنے کی بھی تکلیف محسوس نہ ہوگی ۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ "میرے لئے کوئی خوشی باقی نہیں رہی ہاں اگر ہے تو بس حق تعالیٰ کی قضاوقدر پر راضی ہونا رہ گیا ہے جو مجھ کو ہر وقت حاصل ہے"

ایک صوفی کا حال لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اُن کا چھوٹا بچہ تین دن تک گم رہا، اُن سے کہا گیا کہ اگر آپ دعا مانگتے تو حق تعالیٰ بچہ کو لوٹا دیتا اور گمشدگی کی یہ کلفت نہ اٹھانی پڑتی ۔ انہوں نے جواب دیا کہ بچہ کے گم ہونے سے زیادہ تکلیف میرے لئے یہ تھی کہ میں حق تعالیٰ پر اس کے حکم میں اعتراض کرتا ۔

تکلیف کے انجام یعنی ثواب کی وقعت تکلیف کا احساس کم یا گم کردیا کرتی ہے

دوسری وجہ قضا پر راضی ہونے کی یہ ہے کہ تکلیف کی صورتوں میں تکلیف تو محسوس ہو مگر چونکہ عقل نے اس کے بہتر انجام یعنی ملنے والے اجر و ثواب پر مطلع کردیا ہے اس لئے طبیعت اس تکلیف کو بلا کلفت گوارا کرتی ہے ۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے طبیب کسی مریض کو پینے کے لئے تلخ دوا بتائے یا فصد کھلوانے کی ہدایت کرے تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ اس تلخ دوا کا پینا اور فصد کا کھلوانا تکلیف کی باتیں ہیں مگر چونکہ اس کے ساتھ ہی اس کے عمدہ نتیجہ یعنی صحت و تندرستی سے مریض کو آگاہی حاصل ہے لہٰذا وہ ان تکلیف دہ باتوں کے بتانے والے طبیب سے راضی اور خوش بلکہ اس کا احسان مند و ممنون رہتا ہے ۔ اسی طرح سوداگر اپنے سفر تجارت کی گوناگوں صعوبتوں اور مشقتوں پر راضی ہوتا ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ طبیعت ان تکالیف کو ناگوار سمجھتی ہے، مگر چونکہ عقل نے اس مشقت کا اچھا

نتیجہ و انجام سمجھا دیا ہے اس لئے وہ ناگواری رضا و رغبت سے بدل جاتی ہے۔

پس حبِ دنیا کے ناپائیدار فائدوں کی یہ حالت ہے کہ ان کی وجہ سے مشقت مشقت نہیں معلوم ہوتی تو بھلا اُخروی سعادت کے حاصل کرنے میں بَلا و تکلیف اور خلافِ طبع مصیبتوں پر راضی ہو جانے سے کیوں تعجب آتا ہے؟

ایک پارسا عورت کے ایک مرتبہ ٹھوکر لگی اور پاؤں کا ناخن کٹ کر گر پڑا، اس تکلیف سے بجائے ہائے واویلا مچانے کے یہ نیک بی بی مسرور[1] ہوئی اور ہنسی، لوگوں نے دریافت کیا کہ کیا تم کو تکلیف محسوس نہیں ہوئی؟ عورت نے جواب دیا کہ چوٹ لگنے پر جو اجر آخرت میں ملے گا اس کی حلاوت نے تکلیف کی تلخی کو چاٹ لیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص سچے دل سے اس کا یقین کئے ہوئے ہو کہ دنیا کی ہر تکلیف پر حق تعالیٰ کی طرف سے اجر رحمت ہوگا اور ہر مصیبت و صدمہ پر اس قدر ثواب عطا ہوگا جس کے مقابلہ میں اس عارضی تکلیف کی کچھ حقیقت نہیں ہے تو وہ تکلیفوں پر مسرور[1] اور شاداں ہوگا۔

قضا و قدر کی حکمتیں سوچنے سے تکلیف کا اثر نہیں ہوتا

تیسری وجہ قضاء پر راضی ہونے کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے معاملات میں عجیب عجیب رموز و اسرار مخفی ہیں اور ہر واقعہ عجیبہ و حادثہ جدیدہ میں ایک کیا بیسیوں لطائف مستور ہیں جن پر آگاہ ہونا صاحبانِ بصیرت ہی کا منصب ہے۔ پس ان مصلحتوں اور لطیفوں پر نظر کرنے سے تکلیف تکلیف نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس عالمِ فانی میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے

---

[1] دونوں کے معنی ہیں خوش خوش ۱۲

اور جس کو جاہل و احمق شخص تشویش و اضطراب سمجھے ہوئے ہو اور تعجب کرتا ہو اس کو صاحبانِ بصیرت سمجھ جاتے ہیں کہ یہ تعجب ایسا ہی ہے جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ رہ کر ان واقعات کا تعجب ہوا تھا جس کا مفصل قصہ سورۂ کہف میں مذکور ہے کہ دونوں ایک کشتی میں بیٹھے تو حضرت خضرؑ نے کشتی کا ایک تختہ پھاڑ دیا، موسیٰ تعجب کے ساتھ اعتراض کرنے لگے کہ یہ زیادتی کیوں کی؟ پھر آگے چلے تو حضرت خضر علیہ السلام نے ایک نابالغ لڑکے کو مار ڈالا۔ اس پر بھی موسیٰ علیہ السلام نے تعجب کے ساتھ اعتراض کیا کہ معصوم بچہ کا خون کرنا کب جائز ہے؟ پھر آگے چلے اور ایک بستی میں پہنچے کہ وہاں کے رہنے والوں نے ان کے کھانے تک کی خبر نہ لی، صبح ہونے پر دونوں اس قصبہ میں نکلے، ایک دیوار نظر پڑی جو جھکی کھڑی تھی، حضرت خضر علیہ السلام نے اس کو سیدھا کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام کو پھر تعجب ہوا کہ ایسی بے مروت قوم کے ساتھ جس نے مسافروں کے خورد و نوش کی بھی خبر نہ لی مفت احسان نہ کرنا چاہیے تھا۔ غرض جب تین مرتبہ اعتراض ہو چکا تب حسب قرارداد حضرت خضر علیہ السلام سے مفارقت ہو گئی۔

حضرت خضر علیہ السلام کے افعال میں بظاہر نقصان و تکلیف تھی مگر حقیقت میں مخلوق کی بہبودی کا سبب تھے

یہ ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا ان واقعات پر تعجب کرنا محض اس وجہ سے تھا کہ ان اسرار و رموز سے واقف نہ تھے جو ان واقعات میں مخفی تھے چنانچہ جب خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو ان سے مطلع کر دیا کہ کشتی غریب ملاحوں کی تھی اور بادشاہ وقت ظلماً صحیح و سالم کشتیوں کو ضبط کر رہا تھا لہذا میں نے اس کشتی کو عیب دار کر دیا تاکہ مسکینوں کی صورت معاش

ضبط نہ ہو جائے۔ اور وہ نابالغ بچہ جس کو میں نے قتل کیا فطرۃً بددین پیدا ہوا تھا اور غالب اندیشہ تھا کہ بالغ ہو کر اپنے مسلمان ماں باپ کو گمراہ کرے گا کہ وہ شفقت مادری و پدری کی وجہ سے اس کا خلاف نہ کر سکیں گے لہٰذا اس کا کام تمام کر دیا تاکہ اس کے بدلہ میں صابر ماں باپ کو دوسری اولاد ملے جو صالح و سعید ہو اور ذریعۂ آخرت بنے۔ اور دیوار دو یتیم بچوں کی تھی، جن کا نیک بخت باپ اس دیوار کے نیچے خزانہ دبا کر چھوڑ گیا اور اس کو خدا کے حوالہ کر مرا تھا، لہٰذا میں نے سیدھا کر دیا تاکہ بالغ ہو کر اپنا مال قبضہ میں لائیں اور دیوار گر جانے سے خزانہ ظاہر ہو کر حقداروں کے علاوہ دوسروں کے ہاتھ نہ لگنے پائے۔ پس اس وقت موسیٰ علیہ السلام کا تعجب رفع ہو گیا۔

ناگوار واقعات میں مصلحت خداوندی مضمر ہوتی ہے

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ وہ جنگل میں رہتے تھے اور انہوں نے ایک گدھا پال رکھا تھا جس پر اسباب لادتے تھے، اور ایک کتا رکھ چھوڑا تھا جو مکان کی حفاظت کیا کرتا تھا، اور ایک مرغ پال رکھا تھا جو اذان دے کر سب کو جگا دیا کرتا تھا۔ اللہ کی شان کہ ایک دن لومڑی آئی اور مرغ کو پکڑ کر لے گئی۔ ان کی بیوی رونے لگی کہ ہائے مرغ جاتا رہا۔ شیخ نے فرمایا کہ "روؤ مت اسی میں بہتری ہو گی۔" اس کے بعد بھیڑیا آیا اور گدھے کو مار گیا۔ اس وقت بیوی پھر رنجیدہ ہوئی تو شیخ نے کہا کہ "اسی میں خیریت تھی رونے کی کوئی بات نہیں۔" اس کے بعد دفعۃً کتا مر گیا اور بیوی پھر غمگین ہوئی تو اس وقت شیخ نے پھر یہی فرمایا کہ "غم نہ کرو اسی میں بھلائی تھی۔" بار بار یہ سن کر بیوی کو تعجب ہوا کہ صریح نقصان ہو رہا ہے اور خاوند بھلائی بھلائی پکار رہا ہے۔ غرض صبح ہوئی تو دفعۃً

غنیم کا ایک لشکر اس میدان میں لوٹنے کے لئے آپڑا اور جتنے بھی گھروں کا ان کو پتہ چلا سب کو لوٹ لیا اور بجز ان بزرگ اور ان کی بیوی کے سب ہی کو گرفتار اور باندی غلام بنا کر لے گئے اور مکان کا پتہ نشان دشمنوں کی فوج کو اسی سے چلا کہ کسی کے دروازہ کا کتا آہٹ پاکر بھونکنے لگا اور کسی کا گدھا رینک رہا تھا اور کسی کا مرغ اپنی بانگ بلند کر رہا تھا۔ اس وقت ان بزرگ نے اپنی بیوی سے کہا کہ دیکھا! اس بادیہ نشین قوم کی بربادی کا سبب یہی جانور بن گئے، پس خدا کا کتنا فضل تھا کہ ہمارے تینوں جانور پہلے ہی مر گئے اگر آج وہ زندہ ہوتے تو ہم بھی دوسروں کی طرح دشمن کے ہاتھوں میں گرفتار ہوتے۔

تکوینی اسرار و حکم پر مطلع ہونا مشکل ہے

ایک نبی کسی پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھے ہوئے عبادت کر رہے تھے اور پہاڑ کے قریب چشمہ تھا جس پر اکثر اوقات پیاسوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک سوار آیا اور اس نے نقدی کی ہمیانی تو کمر سے کھول کر زمین پر رکھ دی اور پانی پینے لگا، اس کے بعد وہاں سے چلا گیا اور تھیلی وہیں بھول گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور شخص آیا اور تھیلی کو وہاں پڑا دیکھ کر اس کو اٹھا لیا اور لیکر چل دیا۔ اس کے بعد ایک غریب مزدور سر پر لکڑیوں کا گٹھا لادے ہوئے آیا اور گٹھا زمین پر ڈال کر آرام لینے کے لئے چشمہ کے کنارے بیٹھ گیا۔ اتنے میں وہ سوار جس کی تھیلی رہ گئی تھی گھبرایا ہوا آیا اور تھیلی کو نہ پایا۔ ادھر اُدھر دیکھا، جب کوئی آدمی نظر نہ آیا تو اس بیچارے مزدور کے سر ہو گیا۔ ہر چند اس نے انکار کیا کہ میں نے تھیلی کو دیکھا بھی نہیں مگر سوار کو یقین نہ آیا، یہاں تک کہ اس نے تلوار میان سے نکالا اور غریب مزدور کی گردن اڑا دی، اس کے بعد پشت پھیری اور چلا گیا۔

یہ حال دیکھ کر پیغمبر نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا کہ بارالٰہا یہ واقعہ بھی کتنا عجیب ہے کہ تھیلی کسی نے لی اور مارا گیا کوئی۔ حکم ہوا کہ تم اپنا کام کرو تمہیں ہمارے ملکوتی اسرار میں دخل دینے کی حاجت نہیں۔ بات یہ ہے کہ اس مزدور نے اس سوار کے باپ کو مارا تھا لہٰذا آج اس کا قصاص لیا گیا کہ مقتول کے بیٹے نے اپنے باپ کے قاتل کو مار دیا، اور اس سوار کے باپ نے ایک مرتبہ اس شخص کے مال میں سے ایک ہزار دینار لے لئے تھے جو کہ تھیلی لے گیا ہے لہٰذا آج اس کی تلافی کی گئی کہ لینے والے شخص کی میراث میں سے ایک ہزار دینار کی تھیلی اس کو دلا دی گئی۔

غرض مطلب یہ ہے کہ جو شخص اسرار[1] تکوینیہ پر ایمان لائے ہوئے ہے وہ حق تعالیٰ کے احکامِ قضاء وقدر پر ہرگز تعجب نہ کرے گا بلکہ اپنے تعجب پر متعجب ہوگا کہ شاہنشاہی مصلحتوں کے راز نہ سمجھنے پر غلام کو تعجب کیوں ہوا؟

فصل

شاید تم یہ کہو کہ کافر اور عاصی جو کفر و معصیت کر رہے ہیں وہ بھی خدا ہی کے حکم و ارادہ سے کر رہے ہیں تو ان افعال پر راضی ہونے کے کیا معنی ہوں گے؟ جبکہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے، اور کافر و عاصی کو مبغوض سمجھنا بغض فی اللہ میں داخل ہے جو شرعاً محمود ہے۔ اس لئے ہم تم کو رضا بر قضا کا مطلب سمجھاتے ہیں تاکہ خلجان باقی نہ رہے۔

رضا بر قضا کا صحیح مطلب تاکہ کافر کے کفر پر رضا نہ ہو اور امر بالمعروف ترک نہ ہو

بات یہ ہے کہ امر بالمعروف فرض ہے اور اس کا چھوڑنا رضا بر قضا نہیں کہلایا جاسکتا کیونکہ رضا اور کراہت ایک دوسرے کی ضد ہیں، اور دو متضاد چیزیں ایک

---

[1] عالم وجود میں لانے کے راز ۱۲

جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ ظاہر ہے کہ جس کام کو تم ناگوارا ور برا سمجھو گے اس سے
نفرت ضرور کرو گے اور جس کو اچھا سمجھو گے ضرور اس سے خوش ہو گے اور
ناگواری و خوشی دونوں ایک کام پر ایک حیثیت سے ہر گز نہیں ہو سکتیں، البتہ
دو اعتبار سے ہو سکتی ہیں، مثلاً ایک شخص تمہارا دشمن ہو اور تمہارے دشمن کا بھی
دشمن ہو تو اس کو قتل کرنا اس اعتبار سے گوارا اور پسند ہو گا کہ وہ تمہارا دشمن ہے
مگر اس اعتبار سے ناگوار و ناپسند ہو گا کہ وہ تمہارے دشمن کا بھی دشمن ہے، کیونکہ
دشمن کے دشمن کی زندگی مطلوب ہوتی ہے تاکہ وہ اپنی دشمنی کی وجہ سے تمہارے
دشمن کو نقصان پہنچاتا رہے۔

اسی طرح کفر و معصیت میں بھی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ حق تعالیٰ
کے ارادہ اور مشیت سے ہے، کیونکہ خدا کے حکم کے بغیر ذرہ بھی نہیں ہل سکتا۔
پس اس اعتبار سے تو اس کو قضا اور تقدیر کہتے ہیں، اور اس حیثیت سے
اس پر ناگواری بھی نہ ہونی چاہیے بلکہ رضا ہونی چاہیے کہ حق تعالیٰ کا جو کام بھی
ہے وہ مصلحت سے ہے۔ البتہ اسی معصیت میں دوسری حیثیت یہ ہے کہ کفر و
معصیت کا فر اور عاصی شخص کا عمل اور کسب ہے اور حق تعالیٰ کے دشمن اور
نافرمان ہونے کی علامت ہے، پس اس اعتبار سے بیشک ناگواری و بغض
ہونا چاہیے۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے تم کو حکم دیا ہے کہ جس بندہ پر ہماری مخالفت
کی علامتیں دیکھا کرو اس سے بغض رکھا کرو۔ پس خدا کے حکم کی تعمیل کرنا اور
کافر سے بغض رکھنا بھی حق تعالیٰ کے حکم پر راضی ہونا ہوا۔

اس کی مثال ایسی سمجھو کہ مثلاً تمہارا پیارا معشوق تم سے کہے کہ میں
تمہارے عشق و محبت کا امتحان لوں گا اور اپنے غلام کو مجبور کر دوں گا کہ وہ مجھ کو
گالی دے اور پھر اس کو مار دوں گا کہ مجھ کو گالی کیوں دی تو جو شخص میرے اس غلام

سے بغض رکھے گا اس کو محب اور عاشق صادق سمجھوں گا اور جو اس سے محبت کرے گا میں اس کو اپنا دشمن سمجھوں گا۔ اب فرض کرو کہ ایسا ہی ہوا یعنی غلام نے تمہارے سامنے محبوب کو گالی دی اب تم ہی بتاؤ کہ اس غلام سے تم محبت رکھو گے یا بغض و عداوت، اور جس وقت اس کی زبان سے محبوب کو گالیاں دیتے ہوئے سنو گے تو راضی ہو گے یا ناراض؟ ظاہر بات ہے کہ گالیاں تو اس وجہ سے ناگوار ہی گذریں گی کہ ان سے تمہارے محبوب کی عزت کی ہتک ہوتی ہے، اور کسی شخص کا ایسا کرنا تمہارے معشوق کے دشمن ہونے کی علامت ہے، اور محبوب کا دشمن کہ جس پر دشمنی کی علامتیں بھی موجود ہوں بیشک بغض و عداوت ہی کے قابل ہے۔ مگر اس اعتبار سے کہ یہ تمہارے ہی محبوب کی تدبیر سابق کے موافق ظہور ہو رہا ہے، کیونکہ جو کچھ غلام سے صادر ہوا ہے وہ محبوب ہی کے ارادہ و قصد سے صادر ہوا ہے، کچھ بھی ناگواری نہ ہوگی۔ بلکہ محبوب کی قدرت کا یقین ہو گا کہ اس نے اپنے غلاموں سے جو کام بھی لینا چاہا وہ لے لیا حتیٰ کہ اپنی محسن ذات کے لئے اپنے ادنیٰ غلاموں کی زبان سے گالیاں نکلوانی چاہیں تو اس میں بھی کسی کو سرتابی اور حکم کی مخالفت و عصیان کی مجال نہ ہوئی۔

اسی طرح کافر کا کفر سمجھو کہ چونکہ حق تعالیٰ ہی کے ارادہ اور مشیت سے ہو رہا ہے لہذا اس اعتبار سے تو ناگوار گذرنے کا سبب ہو نہیں سکتا، مگر اس کے ساتھ ہی چونکہ خدا کی رضامندی اس پر نہیں ہے بلکہ کفر کرنا خدا کے دشمن اور مبغوض ہونے کی علامت ہے، لہذا اس اعتبار سے بندہ کا کفر کرنا ضرور ناگوار گذرے گا، اسی وجہ سے اس کو نصیحت بھی کی جاتی ہے، اور تبلیغ حق بھی کی جاتی ہے، کیونکہ اپنے حقیقی محبوب کا دشمن اپنا ہی دشمن معلوم ہوا کرتا ہے۔

رضا بر قضا یہ نہیں ہے کہ دعا مانگنا یا تدبیر اور سبب اختیار کرنا چھوڑ دیا جائے

اسی طرح رضا بر قضا کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ دعا کا مانگنا بھی چھوڑ دو اور تیر انداز نے جو تیر تمہاری طرف پھینکا ہے باوجودیکہ اس کو ڈھال پر روک سکتے ہو مگر پھر بھی اس کو نہ روکو اور اپنے بدن پر لگنے دو اور یوں سمجھو کہ قضا پر راضی رہنا چاہیئے۔ ایسا سمجھنا بھی جہالت اور خام خیالی ہے۔ کیونکہ دعا مانگنے اور شر سے حفاظت و تدبیر کرنے کا تو شرعاً حکم ہے اور محبوب کے حکم سے سرتابی نہیں ہو سکتی، لہذا یہاں رضا بر قضا کے معنی یہی ہیں کہ حق تعالیٰ نے کسی شئے کے حاصل ہونے کے لئے جو اسباب مقرر فرما دیئے ہیں ان کو اختیار کرو تاکہ محبوب تم کو اپنے انتظام کا پابند دیکھ کر تم سے راضی ہو۔ اور اگر اسباب کا اختیار کرنا چھوڑ دو گے تو محبوب کے مخالف اور رضائے محبوب کے دشمن کہلاؤ گے۔ مثلاً کوئی پیاسا آدمی پانی پائے مگر اس کی جانب ہاتھ نہ بڑھائے اور یوں گمان کرے کہ میں تو پیاس پر راضی ہوں کیونکہ پیاس حق تعالیٰ کے حکم اور قضا وقدر سے ہے اور قضا پر راضی رہنا چاہیئے، تو یہ شخص بے وقوف کہلائے گا، اور اس کو سمجھایا جائے گا کہ کیا تو حق تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے اسباب اور عادیات جاریہ میں رخنہ ڈالتا ہے؟ یا حدود شریعت سے باہر نکلنا چاہتا ہے؟ تو نے جو کچھ سمجھا ہے یہ تو رضا کے ہرگز معنی نہیں ہیں۔ رضا کے تو صرف یہ معنی ہیں کہ حق تعالیٰ پر ظاہر و باطن اور زبان یا دل دونوں میں سے کوئی بھی کسی حالت پر اعتراض نہ کرے، اور اس کے ساتھ ہی اس کے حکم کی تعمیل بھی ہو اور جو انتظام اس نے عالم کے لئے تجویز فرما دیا ہے اس سے بھی باہر نہ نکلے، بلکہ شرعی احکام کا پورا پابند ہو اور جس طرح حق تعالیٰ کی

مرضی ہے اس کے حاصل کرنے میں اپنی طرف سے کوئی ایجاد نہ کرے۔ مثلاً جب دعا کا حکم ہوا ہے تو ضروری ہے کہ اس کی تحصیل ہو تاکہ خشوع وخضوع اور قلب میں رقت کا اثر آئے اور وہ لیاقت و استعداد حاصل ہو جس کی وجہ سے قلب پر انوار و تجلیات کا ورود ہو سکے۔ اسی طرح اسباب کو بھی اختیار کیا جائے تاکہ مُسبّب حاصل ہو۔ البتہ اگر سبب کے بعد بھی مُسبّب حاصل نہ ہو تو نہ کوئی غلجان پیدا ہونا چاہیئے اور نہ رنجیدہ ہونا چاہیئے بلکہ راضی رہے اور یوں سمجھے کہ سبب تو فی الحقیقت مؤثر تھا نہیں، اور حق تعالیٰ کا ارادہ یوں تھا کہ یہ مُسبّب مجھ کو حاصل نہ ہو، پس قضا و قدر خداوندی پر مجھ کو راضی رہنا چاہیئے۔ لہٰذا اگر وہ شئے باوجود وسائل و اسباب اختیار کرنے کے بھی مجھے حاصل نہیں ہوئی تو یہ میرے حزن و غم یا شکوہ و شکایت کا باعث نہیں ہو سکتا۔

دسویں اصل

فکرِ موت کا بیان

یہ تو مقامات جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں سب ایک مرتبہ میں نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض تو مقصود بالذات[1] ہیں جیسے مقام رضا و محبت، اور بعض مقصود بالغیر[2] ہیں مثلاً توبہ و خوف اور صبر و زہد۔ کیونکہ مقصود درحقیقت قربِ خداوندی ہے اور یہ تمام مقامات راہِ قرب کے معین ہیں خود قرب نہیں ہیں، کیونکہ قرب تو معرفت اور محبت سے حاصل ہوتا ہے اور معرفت و محبت کبھی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ غیر اللہ کی محبت قطع نہ کردی جائے اور غیر اللہ کی محبت خوف و صبر اور زہد و توبہ ہی کے ذریعے سے قطع ہو سکتی ہے لہٰذا ان کی بھی ضرورت ہوئی۔

اور چونکہ منجملہ ان امور کے جن سے قرب حق میں اعانت حاصل ہوتی ہے موت کا یاد رکھنا بھی ہے لہٰذا اس کا تذکرہ کرنا بھی مناسب ہوا، کیونکہ موت کے ذکر سے دنیا کی محبت قلب سے جاتی رہتی ہے اور جب یہ علاقہ قطع ہوگا تو حق تعالیٰ کی محبت حاصل ہوگی۔

فکرِ موت اصلاحِ قلب کی اصل ہے حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ ضرور تم سے

---

[1] خود ہی مقصود ہیں کسی اور کی وجہ سے نہیں ۱۲ [2] خود نہیں کسی اور کی وجہ سے مقصود ہو گئی ہیں ۱۲

مل کر رہے گی "۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ " لذتوں کو توڑنے والی چیز یعنی موت کا کثرت سے ذکر کیا کرو "۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ " میں نے ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول للہ ! حشر کے دن شہداء کے ساتھ اور کوئی بھی اٹھے گا ؟" آپ نے فرمایا کہ " ہاں وہ شخص جو رات دن میں بیس مرتبہ موت کو یاد کر لیتا ہو "۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ " موت کے برابر کوئی واعظ نہیں ہے " یعنی نصیحت کرنے کو تو موت ہی کافی ہے، اور " اگر جانوروں کو موت کا اتنا علم ہو جتنا کہ بنی آدم کو ہے تو کوئی جانور فربہ کھانے کو نہ ملے "۔ " میں تم میں دو واعظ چھوڑے جاتا ہوں ایک واعظِ ساکت یعنی موت اور دوسرا واعظ ناطق یعنی قرآن مجید "۔

موت بڑی ہولناک چیز ہے اور موت کے بعد کے واقعات اس سے زیادہ خوفناک ہیں اور ان کا ذکر کرنا اور یاد رکھنا دنیا کو منغص بناتا اور اس دار ناپائدار کی محبت کو دل سے نکال لیتا ہے اور دنیا کی محبت ہی ہر گناہ کی جڑ بنیاد ہے، پس جب دنیا سے قلب کو نفرت ہو گئی تو سب کچھ مل گیا اور دنیا سے نفرت ہو گی جبکہ موت کا فکر اور خیال ہو گا کہ عنقریب ہم پر کیا آفت آنے والی ہے۔

فکر موت کا طریق اور تصور کی کیفیت

فکر کا طریقہ یہ ہے کہ کسی وقت خلوت میں بیٹھ کر سارے خیالا

---

۱ ترمذی وحاکم صحیح ۱۲ ۲ طبرانی، مگر روایت عمار کی صحیح ہے اور یہ عائشہ والی صحیح نہیں ۱۲ ۳ طبرانی ۱۲ ۴ بیہقی ۱۲ ۵ ملی نہیں ۱۲ ۶ خاموش ۱۲ ۷ گویا ۱۲ ۸ مکدر ۱۲

کو دل سے نکال دو اور قلب کو بالکل خالی کر کے توجہ اور عزم کے ساتھ موت کا دھیان کرو۔ اوّل اپنے ان دوستوں اور اعزّوا قارب کا تصور کرو جو دنیا سے گذر گئے اور یکے بعد دیگرے ایک ایک کا دھیان کرتے جاؤ کہ یہ صورتیں کہاں چلی گئیں؟ یہ کیسی کیسی امیدیں اپنے ساتھ لے گئے؟ حرص و امل نے ان میں اپنا کتنا زور دکھایا؟ جاہ و مال کی کیا کچھ تمنائیں اور آرزوئیں ان کے دلوں میں رہیں، مگر وہ آج سب خاک میں مل گئے اور منوں مٹی کے نیچے دبے پڑے ہیں کہ کوئی شخص ان کا نام بھی نہیں لیتا۔ اس کے بعد مرنے والوں کے بدن اور جسم کا دھیان کرو کہ کیسے حسین اور نازک بدن تھے مگر اب پارہ پارہ ہو گئے، گل گئے، پھٹ گئے اور کیڑے مکوڑوں کی غذا بن گئے۔ اس کے بعد ان کے اعضاء اور جوارح میں سے ایک ایک عضو کا دھیان کرو کہ وہ زبان کیا ہوئی جو کسی وقت چپ ہونا جانتی ہی نہیں تھی؟ وہ ہاتھ کہاں گئے جو حرکت کیا کرتے تھے؟ دیکھنے والی آنکھیں اور ان کے خوبصورت حلقے کس کیڑے کی خوراک بن گئے؟ غرض اس طرح پر دھیان کرو گے تو سعید بن جاؤ گے۔ کیونکہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں[لہ] کہ "سعید وہ ہے جو دوسروں سے نصیحت حاصل کرے۔"

طول امل سے بچو اور موت کو ہمیشہ پیش نظر رکھو

افسوس کہ ہم موت جیسی ہولناک چیز سے غافل ہیں۔ اس زمین پر کہ جس کو ہم پاؤں سے روندتے ہیں ہم سے پہلے سیکڑوں آئے اور چل دئیے مگر ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ یہیں رہیں گے۔ موت کا

لہ اس حدیث کو شاہ ولی اللہ نے اربعین میں لیا ہے ۱۲

خطرناک سفر درپیش ہے مگر ہمیں کچھ پرواہ نہیں ، اس قدر غفلت طول امل نے پیدا کر رکھی ہے ، اگر یہ جہالت رفع ہو تو موت کا دھیان آئے ۔ اسی لئے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو نصیحت فرمائی تھی کہ صبح ہو تو شام کا فکر نہ کرو اور شام ہو تو صبح کا خیال نہ لاؤ ، اور دنیا میں آئے ہو تو زندگی میں موت کا سامان اور تندرستی میں موت کا فکر کرو ۔ کیونکہ اے عبداللہ ! کیا خبر ہے کل کو تمہارا کیا نام ہوگا یعنی زندہ ہوگا یا مردہ؟ جس شے کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں اس کی فکر تو ہر وقت ہونی چاہئے ۔ پس اپنی امیدوں پر خاک ڈالو اور آرزوؤں کو بڑھنے نہ دو ۔ خدا جانے گھنٹہ بھر بعد کیا ہوتا ہے۔[1]

حضرت اسامہؓ نے سو دینار میں دو مہینہ کے وعدہ پر ایک کنیز خریدی ۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ " اسامہ کی حالت پر تعجب کرو کہ زندگی کا بھروسا ایک دن کا بھی نہیں اور دو مہینہ کے وعدہ پر کنیز خریدی ہے یہی طول امل ہے ، خدا کی قسم ہے کہ میں نوالہ منہ میں رکھتا ہوں اور یقین نہیں کرتا کہ حلق سے نیچے اترے گا ؟ ممکن ہے کہ نوالہ کے کھاتے ہی اچھو پڑ جائے ، پھندا لگ جائے اور دم نکل جائے ۔ لوگو ! اگر تمہیں عقل ہو تو اپنے آپ کو مردوں میں شمار کرو ۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے کہ جو کچھ وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور آنے والا ہے اور جو آنے والا ہے وہ بہت قریب ہے ، اگر تم کو جنت میں داخل ہونے کی خواہش ہو تو دنیا کی لاطائل امیدوں کو کم کرو اور موت کو ہر وقت پیش نظر رکھو اور اللہ سے شرماؤ جیسا کہ شرمانے کا حق ہے انشاء اللہ تعالیٰ جنت میں داخل ہو جاؤ گے "۔[2]

---

[1] ترمذی ۱۲ [2] ابن ابی الدنیا ۱۲

خاتمہ

جو کچھ اب تک ہم نے بیان کیا ہے اس میں ہم تم کو بیدار اور متنبہ کر چکے اور اللہ کی جانب چلنے کا شوق دلا چکے۔ پس اگر اب بھی کان نہ لگاؤ گے، یا ایسا سنو گے جیسا کہ قصے کہانیاں سُنا کرتے ہو تو اپنا ہی کچھ کھوؤ گے کسی کا کیا نقصان کرو گے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اس سے زیادہ ظالم کون جس کو پروردگار کی آیتوں سے نصیحت کی گئی اور اس نے مُنہ پھیر لیا اور بھول گیا کہ فردائے قیامت کے لئے کیا بھیجا"؟ اور اگر توجہ کے ساتھ سنو گے اور دل سے کان لگاؤ گے تو بیشک نفع پاؤ گے، اور جو چیزیں صراطِ مستقیم سے روکے ہوئے ہیں ان کو چھوڑ دو گے۔

اصلاحِ قلب سے روکنے والی بڑی چیز حبِّ دنیا ہی ہے

یاد رکھو کہ سلوک سے روکنے والی بڑی چیز صرف دنیا کی محبت ہے۔ اسی نے خدا کی طرف سے غفلت پیدا کر رکھی ہے اور کبھی قیامت اور محشر کو یاد نہیں آنے دیتی۔ لہٰذا اگر روزانہ صبح کی نماز کے بعد جو کہ صفائیِ ذہن اور معدہ کے خالی ہونے کا وقت ہے چند منٹ تنہا بیٹھ کر اپنی حالت پر غور کیا کرو، اور ابتداء و انتہا و مبدأ[1] و معاد کو سوچا کرو اور نفس سے حساب لیا کرو تو بہت نفع ہو اور اس کی صورت یہ ہے کہ نفس کو خطاب کر کے کہا کرو

---

[1] ابتداء و انتہاء ۱۲

محاسبۂ نفس اور مراقبہ کی کیفیت

اے نفس! میں مسافر تاجر ہوں، ابدی سعادت اور اللہ جل جلالہ کا قرب میرا منافعہ ہے اور دائمی بدبختی اور حق تعالیٰ سے حجاب میرا خسارہ ہے، اور میری عمر میرا راس المال[1] ہے کہ ہر سانس ایک بیش قیمت جواہر اور گویا بھرپور خزانہ ہے جس سے ابدی سعادت حاصل ہو سکتی ہے، اور جب عمر پوری ہو گئی تو تجارت ختم ہو جائے گی اور مایوس ہونا پڑے گا۔ آج کا دن میری تجارت کا ہے اور حق تعالیٰ نے مجھے فرصت دی ہے کہ اگر چاہوں تو تجارت میں نفع اٹھاؤں اگر حق تعالیٰ مجھے دنیا سے اٹھا لیتا تو میں خواہش کرتا کہ کاش دنیا میں لوٹا دیا جاؤں اور ایک دن مجھے نصیب ہو جائے کہ کوئی نیک عمل کر لوں۔

اے نفس! وہ دن آج کا ہے جو تجھ کو خدا کی طرف سے مہلت کا عطا ہوا ہے۔ اب تو اپنا وعدہ پورا کر اور دیکھ کہ کیا کر رہا ہے؟ اگر اس مہلت کو تو نے غنیمت سمجھا اور آج کا کام کل پر نہ رکھا تو آج کی تجارت کا منافعہ تجھ کو مل گیا، اور حسرت نہ ہوئی اور اگر تو کل بھی زندہ ہے تو پھر یہی خیال کر۔

غرض جب تک زندہ ہے اس وقت تک ہر دن کو نیا سمجھ اور خدا کے عفو سے دھوکا مت کھا کیونکہ یہ تیرا گمان ہی گمان ہے، ممکن ہے کہ غلط نکلے۔ حق تعالیٰ کی معافی کچھ ضروری یا تیرا قرض نہیں ہے جس کا مطالبہ اور ایفاء وادا لازمی ہو۔ اور اگر معافی ہوئی تب بھی نیکوکار بندوں کے ثواب سے تو محروم ہی رہے گا اور مرے پیچھے اگر حسرت کرے گا تو اس سے کیا نفع ہوگا؟ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ ع گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔

ایک ایک سانس غنیمت اور بے بہا موتی ہے۔

---

[1] پونجی جس سے تجارت شروع کی ۱۲

اگر اس کے بعد نفس پوچھے کہ اچھا بتاؤ کیا عمل کروں اور کیونکر وقت کی قدر کروں ؟ تو اس کو جواب دے کہ جو چیز موت کی وجہ سے جُدا ہو جانے والی ہے اس کو چھوڑ دے اور جو شئے پائدار ہے اور کسی وقت بھی تیرا ساتھ نہ چھوڑیگی اس پر قبضہ کر یعنی اللہ جل جلالہٗ کی معرفت حاصل کر اور خدا کی یاد سے مانوس ہو۔

پھر اگر نفس کہے کہ بھلا دنیا کس طرح چھوٹ سکتی ہے ؟ اس کے علاقے تو قلب میں مضبوط و مستحکم ہو گئے اور ان کا ٹوٹنا دشوار ہے ۔ تو اُس کو جواب دے کہ قلب ہی کے اندر سے دنیا کے علاقے کاٹ دے اور تلاش کر کہ دنیا کا کونسا علاقہ مستحکم ہے ، پس اسی کی اوّل جڑ کاٹ ۔ یعنی اگر مال کی محبت زیادہ ہے تو اس کو نکال ، اور اگر جاہ کی طلب قوی ہے تو اس کو چھوڑ ۔

دسیوں مہلک امراض کی تشریح اور علاج بیان ہو چکا ہے ان کو دیکھ اور خدا کے فضل و کرم پر بھروسہ رکھکر مستعد ہو جا ، کمر باندھ ، آمادہ ہو اور جس چیز کی نفس کو خواہش ہو اس کے خلاف کر پھر دیکھ کہ خلاصی ملتی ہے یا نہیں ؟ !

اے نفس ! تو بیمار ہے ، اور عمر تیرے پرہیز کا زمانہ ہے ، اور روحانی حاذق طبیب یعنی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) جن کی راستی و سچائی سے تو بھی آگاہ ہے یوں فرمایا ہے کہ ذائقہ اور لذتیں تجھ کو مضر ہیں اور کڑوی دوائیں تیرے لئے نافع اور مفید ہیں ۔ کیا تجھ سے سفر کی مصیبتیں اس امید پر برداشت نہیں ہوسکتیں کہ منزل پر پہنچکر آرام نصیب ہوگا ، پس اگر راستہ کی تکلیف سے اکتاتا ہے تو یاد رکھ کہ قافلہ نکل جائے گا اور تو جنگل میں پڑا رہے گا کہ یا تو کوئی درندہ تجھ کو پھاڑ کھائے گا اور یا یوں ہی بھٹکتا ہوا ہلاک ہو جائے گا ۔

اے نفس ! بتا تو سہی کہ تجھے دنیا میں کس چیز کی رغبت ہے ؟ پس اگر تو مال چاہتا ہے تو مان لے کہ اچھا وہ مل بھی گیا اور تو بڑا مالدار اور متموّل سیٹھ

بن بھی گیا مگر پھر کیا ؟ اگر تو نظر اٹھا کر دیکھے گا تو بہتیرے یہودی اور عیسائی
ایسے ملیں گے جن کے پاس تجھ سے زیادہ مال موجود ہوگا۔ اور تو عزت اور جاہ
کا طلبگار ہے تو اچھا فرض کرلے کہ یہ طلب اپنے ٹھکانے لگی اور تجھے عزت و جاہ
حاصل بھی ہوئی مگر اس کا انجام اور حاصل کیا ہے ؟ اگر آنکھیں کھول کر دیکھے گا
تو سیکڑوں احمق و جاہل کافر اور اللہ کے نافرمان اور ذلیل اور کمینے بندوں کو
ایسے حال میں دیکھے گا کہ ان کی عزت دنیا میں تجھ سے بھی زیادہ ہو رہی ہے ان
بہتیرے لوگ ایسے منصب حکومت اور مسند جلال وسطوت پر بیٹھے نظر آئیں
گے جو تجھ کو بھی قید کرکے جیل خانے پہنچا سکتے ہیں۔ پس اے نفس اگر تو ان
آفتوں اور مصیبتوں سے نہیں گھبراتا جو عزت و جاہ کے حاصل کرنے میں اٹھانی
پڑتی ہیں اور ان بلاؤں سے بھی نہیں ڈرتا جو عزت حاصل ہوئے پیچھے سر پر پڑا
کرتی ہیں، تو ان ذلیل اور کمینے شریکوں ہی کا خیال کر کہ کیسے کمتر لوگوں کا ساجھی
ہونا چاہتا ہے ؟ کیا ایسی بے وقعت اور حقیر چیز بھی حاصل کرنے کے قابل
ہے جس کو ہر خسیس سے خسیس اور رذیل سے رذیل شخص بھی حاصل کرسکتا بلکہ حاصل
کئے ہوئے ہے اور اتنی مقدار حاصل کئے ہوئے ہے کہ اگر تو پچاس برس بھی کوشش
کرے گا تو تجھ کو نصیب نہ ہوگا۔ اور اے نفس ! اگر تو دنیا سے اعراض
کرکے آخرت کی جانب متوجہ ہوگا تو یاد رکھ کہ یگانۂ روزگار اور یکتائے زمانہ
بن جائے گا۔ تیرا ثانی ہفت اقلیم بھی نہ مل سکے گا۔ پس اے نفس ! اب تو ہی
بتا کہ کیا چیز حاصل کرنے کے قابل ہے ؟ اے نفس ! خوب یاد رکھ کہ تجھ سے
زیادہ تیرا خیرخواہ کوئی نہیں ہے، تو کسی کے کہنے اور سننے پر نہ جا بلکہ دنیا اور
دین دونوں کے انجام اور نتیجہ میں غور کرکے جواب دے کہ تیری رغبت کس چیز میں ہے ؟

ملہ دبدبہ ۱۲

اپنے نفس سے مباحثہ کرنا اہل باطل فرقوں سے مناظرہ کرنے سے بدرجہا زیادہ ضروری ہے

اسی طرح اگر تم اپنے نفس سے مناظرہ اور مباحثہ کرتے رہو گے تو ایک دن یہ نفس تمہارا مطیع بن جائیگا اور تم کو راہِ مستقیم پر لے چلے گا۔ پس اگر تم عقلمند ہو تو سمجھ لو کہ یہ نفس کے ساتھ مباحثہ کرنا بدعتیوں اور معتزلہ بلکہ دنیا بھر کے تمام مذاہب باطلہ کے ساتھ مناظرہ کرنے کی بہ نسبت زیادہ ضروری اور مہتم بالشان ہے۔ کیونکہ دوسروں کی غلطیاں اور خطائیں تمہیں کچھ بھی نقصان پہنچانے والی نہیں ہیں اور اپنی خطا و غلطی کا ضرر اپنے ہی اوپر وبال ہے کہ اس کا بھگتان تم ہی کو بھگتنا ہے۔ پس پہلو میں بیٹھے ہوئے عدو اور خون کے پیاسے دشمن کو سب سے پہلے قتل کرنا چاہئے اور جب اس سے نجات مل کر اطمینان حاصل ہو جائے تب دوسروں کی خبر لینی مناسب ہے۔ تعجب ہے کہ اس دشمن کی جانب بھی توجہ نہیں ہوتی بلکہ یہ جو کچھ بھی مانگتا ہے وہی اس کو دیا جاتا ہے اور جو بھی یہ حکم دیتا ہے فوراً اس کی تعمیل کی جاتی ہے۔ اس کی درخواستوں کے منظور اور خواہشوں کے پورا کرنے میں غور و فکر کے گھوڑے دوڑائے جاتے ہیں اور حیلوں اور تدبیروں سے کام لیا جاتا ہے۔

بھلا سوچو تو سہی، اگر کوئی شخص اپنے دامن کے نیچے ایک زہریلا کالا سانپ چھپائے بیٹھا ہو جو پھنکارے مار رہا ہو اور اس کے ڈسنے اور ہلاک کرنے کی ٹوہ میں لگا ہوا ہو، مگر یہ شخص اس کی تو پرواہ نہ کرے اور دوسرے شخص کے منہ سے مکھیاں اڑانے اور پنکھا جھلنے میں مشغول رہے تو اس سے زیادہ احمق اور بے وقوف کون ہو سکتا ہے؟

یہی تمہارا حال ہے دوسروں کے ساتھ مباحثہ کرنے اور غیروں کو سیدھے راستہ پر لانے کی فکر میں سرگرم ہو مگر اپنے نفس امارہ کے ساتھ مناظرہ کرنے اور

اس تباہ کرنے والے شریر دشمن دین و ایمان کو زیر کرنے کی جانب مطلق توجہ نہیں کرتے۔

نفس کی خاصیت کتے کی سی ہے کہ مار کھائے بغیر سیدھا نہیں ہوتا

خوب سمجھ لو کہ جب تک نفس کے ساتھ ایک عرصہ دراز تک اس طرح مباحثہ نہ رکھو گے اس وقت تک یہ کبھی سیدھا نہ ہوگا اور جب تک یہ سیدھا نہ ہوگا اس وقت تک نہ تم سے اللہ کی یاد ہو سکے گی اور نہ مناجات میں لذت آئے گی، نہ سلوک کی طرف توجہ ہوگی اور نہ صراط مستقیم پر چلنے کی فکر ہوگی۔ لہذا اس مناظرہ کو اپنے اوپر واجب و فرض سمجھو اور اکثر اوقات نفس کے ساتھ یہ مباحثہ شروع کر دیا کرو اور جب نفس تمہاری مخالفت کرے تو اس کو ڈانٹو جھڑکو اور ایسی سزا دو جو کارگر اور باثر ہو، کیونکہ نفس کی خاصیت کتے کی سی ہے کہ جب تک مار نہ کھائے گا اس وقت ادب نہ پائے گا

پھر اگر تم کو نفس کے ساتھ مناظرہ کرنے اور محاسبہ لینے یا نفس کو ڈانٹنے اور سزا دینے کا طریقہ معلوم کرنے کی خواہش ہو تو "احیاء العلوم" کی کتاب المحاسبة والمراقبة دیکھو کہ اس مختصر کتاب میں ان ابواب کو بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

اب دعا کرو کہ حق تعالیٰ شانہ اپنے محبوب سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے مجھے اور تمہیں اپنی بے شمار عطاؤں سے ڈھانپ لے اور کرم و فضل فرمائے جن باتوں کا اس نے ہم کو علم عطا فرمایا ہے اس پر عمل کی توفیق بخشے اور جو کچھ ہم نے پڑھا یا سنا ہے اس کو حال بنا دے کہ اس کی کیفیت ہم اپنے نفس پر گذرتی ہوئی دیکھ لیں۔

آمین یارب العلمین

تمت